E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز	MEMBER APNS CPNE

فون نمبرز:
021-35893121
021-35893122

خط و کتابت کا پتا: C II-88 فرسٹ فلور خیابانِ جامی کمرشل
ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ☼ جلد: 32 - شمارہ: 05 ☼ مئی: 2015ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

فون:34930470 - 021-34939823 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

زرسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 720 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر / قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

ہم کون لوگ ہیں؟

روز لاشوں کے تحفے ملتے ہیں۔ رو دھو کر اپنے پیاروں کو منوں مٹی کے نیچے دفن کر کے ہم پھر نئے سانحے کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ ہم کون لوگ ہیں؟ مارے جانے والے کو یہ پتا ہی نہیں کہ وہ کیوں مارا گیا، مارنے والا یہ سمجھتا ہے کہ وہ رب کائنات سے بڑا ہو گیا ہے، تب ہی اس کے پیدا کیے گئے انسانوں کو موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں جا رہی ہے اور ہم جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے ہیں، بلکہ حقیقتاً پیچھے کی جانب گامزن ہیں۔ جس کو جب جہاں موقع ملتا ہے، ہاتھ دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ فیس بک پر لائک بھیجنا ہم اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں مگر راہ میں پڑا پتھر اٹھانے سے گریزاں ہیں۔ ہر شخص دوسرے شخص کی جانب انگلی اٹھاتا ہے مگر اپنی تصیح کرنے کا خیال کسی کو بھی نہیں آتا۔ آخر ہم کون لوگ ہیں؟ ہم کیوں اتنے بے حس ہو گئے ہیں۔ کیا ہمارے آباؤ اجداد بھی ایسے ہی تھے؟ کیا ہماری تربیت میں کمی رہ گئی؟ یا ہم وہ بدنصیب لوگ ہیں جو عقل کے اندھے مانے جاتے ہیں؟ سوچیے گا ضرور اور سوچ کر جواب دیجیے گا۔ مجھے انتظار رہے گا۔

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو!

آباد رہو! خوش حال رہو اپنی مٹی سے جڑے رہو! جڑے رہنے سے یاد آیا، ہم تو اس روئے زمین پر ''گریویٹی'' کے باعث ہی تو جڑے ہوئے ہیں نا۔ کیوں بھول جاتے ہیں ہم کہ خدا کی قدرت نے ہمیں باندھ کر رکھا ہوا ہے۔ اس زمین پر گریٹی کی زنجیر ہے، اس سے آگے چلیں تو قوم مذہب کی زنجیر قدموں میں لپٹی پڑی ہے، اس سے آگے بڑھیں تو گھر گرہستی کی بیڑیاں ہمارے پیروں میں لپٹی ہیں۔ ساتھیو! خدا کی ذوالجلالیت کے بارے میں سوچیں تو یقین مانیں ہم سب کچھ بھول جائیں گے۔ اس گریویٹی کی کرنوں کی اسیری کھول کر اگر جو ہم نے باہر نکلنے کی سعی کی تو ہم جستجو کی منازل تو طے کریں گے لیکن پھر سے اشرف المخلوقات کے عہدے پر پہنچنا شاید ممکن نہ ہو پائے...... کیوں کہ کائنات ایک بے کراں کالا سمندر ہے۔ اس زمین پر پڑاؤ ہمارا۔ ہم تو اب بھی اس روئے زمین پر اجنبی ہیں۔ انرجی کا ایک قطرہ کب تک بقا پا سکتا ہے۔ نور کی بوند لے کر ہمیں وسط کائنات تک جانا ہے۔ سلامت رہیے تا قیامت رہیے۔ یہ تو ہوگئیں آپ سے باتیں، اب چلتے ہیں احوال میں موجود آپ کے محبت ناموں کی جانب۔

✉ لہڑی بلوچستان سے یہ پہلا تبصرہ ہے ہمارے پیارے احوالی دوست عمر گولہ کا لکھتے ہیں۔ پیارے کاشی چوہان صاحب السلام وعلیکم کے عرض ہے خط کے ذریعے ملاقات تو ہوتی ہی رہتی ہے لیکن ہم جب اپنے خدا کے دیے ہوئے خوبصورت ہاتھوں اور دل کی گہرائیوں سے سچی کہانیاں پڑھتے ہیں

تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھائی کاشی صاحب فروری کے پرچے میں میرا خط شائع ہوا تھا لیکن آپ کے جواب کے حوالے سے لکھا تھا کہ محمد عمر آپ کی غزل بچی کہانیاں کی زینت بنی گئی لیکن مارچ کے ڈائجسٹ میں میری غزل شائع نہیں ہوئی دل میں ارمان پھر ہوا سوچا کہ شاید میری کوئی غلطی ہے۔ بھائی جان ناراض مت ہونا میں معذرت کے ساتھ کہتا ہوں آپ سے۔ ابھی میں خط میں دوسری دعا بھیج رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ایک کہانی اور تصویر بھی بھیج رہا ہوں۔ یہ کہانی اور دعا ضرور شائع کیجیے گا میں ہے آپ خوشی دیں گے کیوں کہ میں سمجھتا ہوں جلد آپ اسے جلد شائع کریں گے۔ میں آپ کو آپ کی ساری ٹیم کو سارے لکھاریوں کو دعائیں دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کامیابی عطا کرے۔ بعد میں مجھے لکھنے کی ہمت دے۔

☆عزیزم عمر گولہ! آپ کی پانچویں بار ہمیں تصویر موصول ہوئی ہے خوش ہو جاؤ آپ کی دعا رنگ لائی ہے اور آپ کی تصویر احوال کا حصہ ہے۔

✉ یہ تبصرہ ہے اسلام آباد سے عظمیٰ شکور صاحبہ کا، لکھتی ہیں۔ ایڈیٹر صاحب آداب۔ جناب اداس کر دیا سب کو، سو تھینکس واپس آنے کے لیے۔ ہاں لگتا ہے بہار آئی ہے پھولوں کی خوشبو بتاتی ہے کہ آپ احوال میں رونق بکھیر رہے ہو۔ منزہ سہام صاحبہ سب سے بڑا دہشت گرد شیطان ہے جو انسان میں گھس کر دوسرے انسان کو قتل کر رہا ہے۔ سرورق پر دوپٹہ اوڑھے مشرقیت سے بھرپور دوشیزہ دکھی۔ چہرے پر بلا کی معصومیت لیے آنکھوں میں حیرت کے سمندر لیے جیسے کہہ رہی ہوں۔ ''کاشی چوہان'' آ گئے آپ واپس۔ یہ کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں۔ مطلب آپ جس کہانی کو بھی شروع کر دیں اپنی طرف توجہ مبذول کرتی تھی۔ واہ کیا بات ہے اس رسالے کی۔ ''سب کچھ مایا'' حمیرا خان کی لکھی کہانی اُف رلا ہی ڈالا انسان اس قدر لالچی ہے حد تھی یہ بھی کہ بچوں کو ہی مار دیا۔ پردیس مت جیو، شاہد رفیق سہو صاحب۔ مطلب گیا، کیا آپ نے اس بے چارے کو حادثے میں مروا دیا۔ افسوس ہوا جذبات کی احساسات کی کوئی قدر ہی نہیں۔ بس پیسا اہم ہو گیا۔ اسماء اعوان صاحبہ کمال کر دیا آپ نے 'میری دلہن تم ہو' لکھ کر۔ واقعی میں کیا زبردست تحریر تھی اور یہ بھی ہے کہ میں خود مزاروں سے جذباتی لگاؤ رکھتی ہوں اس لیے میں بہت زیادہ متاثر ہوئی اور سچ ہے جذبے جب سچے ہوں تو منزل مل ہی جایا کرتی ہے۔ تھینکس اسماء اعوان اس زبردست تحریر کے لیے۔ ہائیڈ پارک یہ بھی ایک اچھا سلسلہ ہے ارے واہ کمال ہے بھئی ہائیڈ پارک میں مجھے بھی شامل کریں ڈی خان صاحب، جیسے ہی میری تحریریں ملیں فوراً سے پہلے لگا میں ہائیڈ پارک میں۔ بس میں آئی کے آئی۔ تیر نیم کش میں کیا ہوا سب ہی اداس لگے اور ہاں پچھلے ماہ میں جو رسالے میں نہیں تھی تو آ گئی نا میں، نہ ہوں اداس آپ کے لیے۔ ایک شعر اچھا لگا۔ طیبہ عبید کا لکھا ہوا قابل دید، ہائیڈ پارک میں اچھا لکھا سہیل رضا خواجہ اچھا تو اب میں جاؤں۔ کافی ہے نا تبصرہ تو اور کیا ناشتا نہیں کیا میں نے اب تک دس بج گئے ہیں صبح کے۔ جی یہ بچی کہانیاں ایسے ہی دل میں سمایا ہے کہ کچھ ہوش نہیں گرد و پیش کا۔ او کے ٹاٹا بائے بائے، میرے سب ساتھیوں کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔ کاشی چوہان صاحب آپ بہت مسکرا رہے ہیں۔ آپ کے لیے بھی بے انتہا دعائیں، کب مئی آئے اور کب ملاقات ہو پائے۔ پسینے میں بھیگا بھیگا رسالہ ملے گا مئی میں او کے جی۔

☆عظمیٰ جی! تبصرہ خوب کیا مگر...... ہم پر یہ التفات کیوں؟ سچ مچ بڑی رائٹر ہیں آپ۔ خدا

کرے زور قلم اور زیادہ۔

دنیا احوال میں یہ آمد ہے ہمارے دوست لکھاری اور شاعر عادل حسین کی کراچی سے۔ عرض کرتے ہیں اپریل کا سچی کہانیاں اس بار بہت لیٹ ملا؟ لیکن روایتی آب تاب کے ساتھ! ٹائیٹل بہت خوبصورت۔ بڑا دہشت گرد کون حقیقت کی تصویر تھی۔ بے شک دہشت گردی کا کسی مذہب، کسی ملک سے کوئی تعلق نہیں۔ احوال میں شامل ہو کر ہمیشہ ہی مزا آتا ہے۔ ہر خط میں محبت جھلکتی ہے۔ منشی محمد عزیز مئے صاحب شکریہ۔ دعاؤں میں بھی یاد رکھیے گا۔ احمد سجاد بابر صاحب کا تفصیلی مضمون مزا دے گیا۔ زبردست! قیامت سے پہلے قیامت پڑھ کر دل بہت دکھی ہو گیا۔ اللہ پاکستان کے ہر شخص کی حفاظت فرمائے۔ کون مانے گا میری کو ماننا پڑے گا۔ لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ دنیا اک بگلا بھگت بھی اقراء سیف کی ایک دردناک حقیقت تھی۔ فرض نبھاتا ہوں، نکمے کی ہانڈی، کل کس نے دیکھا، زندگی صحرا نشیں ہو جیسے عبدالغفار عابد صاحب کی اچھی کاوش۔ آج کل تو یہ مسئلہ بہت عام ہے آخری پیراگراف پر لڑکیوں کو غور کرنا چاہیے۔ پردیس مت جیو زر کی ہوس میں مبتلا لوگوں کے لیے عبرت! نائس شاہد رفیق صاحب! میں بانجھ ہوں حمیرا راحت صاحبہ کی زبردست تحریر۔ حقیقت کی عکاس ویری نائس حمیرا صاحبہ۔ بہت دیر کر دی بابر نایاب کی وہی دولت کی ہوس کے شکار لڑکے کی داستان اچھی کوشش۔ میری دلہن تم ہو اسماء اعوان جی کی اچھی تحریر جس میں محبت کی سچائی بھی تھی۔ اور بزرگان دین کا عشق اور مرتبت کا اظہار بھی۔ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ منظر کشی بھی دلچسپ تھی۔ ڈھونڈوں کہاں امان محمد علی روشن صاحب کی خوبصورت تحریر۔ اچھی لگی سب کچھ مایا بھی حمیرا خان کی اچھی تحریر جس میں سپنس کا عنصر بھی نمایاں تھا۔ کہانی کو بھی خوبصورت بنایا گیا پڑھ کر افسوس اس بات پر ہوا کہ انسان ہوس زر میں اتنا گر سکتا ہے۔ اگھور انفس مورا، نسیم سکینہ صدف جی کی عبرت آمیز تحریر۔ اللہ ہم سب کو نفس پر قابو رکھنے کی توفیق دے۔ جاوید راہی صاحب ہمیشہ کی طرح زبردست کہانی لائے تھے۔ پلیٹ فارم پر ممتاز احمد صاحب بھی زبردست کہانی لائے۔ ایسی محبتیں نایاب نہیں تو سیماب ضرور ہو گئی ہیں۔ پیر جی! اقبال بانو صاحبہ کی زبردست تحریر۔ لوٹنے والے کس کس انداز سے لوٹ لیتے ہیں۔ اور لٹنے والے کو خبر تک نہیں ہوتی۔ عہد وفا نبھایا پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ مرزا شوکت علی جیسے لوگوں کی آج ہمیں بہت ضرورت ہے۔ کرچیاں میں صائمہ نفیس جی نے خوبصورت پیغام دیا۔ ہم شکل بھی خوبصورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ زہر عشق بھی رگوں میں اترنا شروع ہو گیا ہے۔ ویلڈن کاشی بھائی۔ بالآخر ناگن کا اختتام ہوا۔ مسئلہ یہ ہے کہ ذریعے سینکڑوں لوگ فیض پا رہے ہیں۔ اس نیک کام پر ڈھیروں دعائیں۔ ہائیڈ پارک بھی خوبصورت تھا۔ اور تیر نیم کش بھی مگر شاعری کا سلسلہ کیا ہوا؟! غور کیجیے بھائی! ٹائیٹل کی حسینہ بھی بہت خوبصورت تھی اب تک میرے ہاتھوں میں دم توڑ چکی ہے! فولڈنگ کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا؟! آخر میں کامیاب پرچے پر دعائیں اور مبارکباد کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معافی۔ تمام لکھنے والے ساتھیو اور پڑھنے والے دوستوں کو سلام۔ بشرط زندگی پھر ملاقات ہو گی۔ اجازت۔ اللہ حافظ۔

☆ اچھے عادل! تبصرہ زبردست رہا۔ یہ تبصرہ سنگل کیوں آ رہا ہے اب تک۔ ہماری بھابی کا تبصرہ کہاں ہے؟؟

✉ مور شاہد حسین قمر شہداد کوٹ سے عرض گزار رہیں۔ بے مثال ٹائیٹل سے آگے بڑھے۔ (مرحوم) سہام مرزا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ فہرست میں پہنچے سب سے پہلے خود کو

تلاش کیا اور ریت کا محل بن گئے۔ یہ شمارہ میں نے دل کی آنکھ سے پڑھا مگر منفرد سلسلہ کچھ اپنی باتیں اور بزم سخن آباد کی شدت سے کمی محسوس ہوئی۔ آنٹی منزہ سہام مبارک ہو بہار کی آمد اپنوں کی محفل میں قدم رکھا۔ گلے شکوے ہوتے رہتے ہیں۔ اُف! اتنا بڑا ہنگامہ ہم جب لکھیں جب آپ نہیں ہوں گے۔'' خدا کی پناہ، عمران کنول خان سے ملاقات اچھی رہی۔ منشی محمد عزیز، ممتاز احمد، ایم اشفاق بٹ بھرپور تبصرے کہ ساتھ سیدہ دعا شاہ، محمد ندیم عباس بھلی کری آیا۔ (خوش آمدید) اُم جلال بخاری ہم سب نے سن لیا کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ مجید احمد بھیا الحمدللہ بس ہم ٹھیک ہیں آپ سنائیں۔ ضرغام بھیا آئندہ مختصر حاضری نہیں چلے گی۔ ثریا رانی سدرہ انور آپ نے تو بھلا ہی دیا۔ سدا خوش و سلامت رہو۔ گلاب جیسے گلاب سعید کی آمد بھلی لگی۔ جمال زیدی ویلکم بیک۔ نفیسہ فضل آنٹی رب سائیں آپ کو صبر دے آمین۔ مسز نوید ہاشمی آپ نے دسمبر کے پورے شمارے پر تبصرہ کیا مگر میری کہانی مانو یا نہ مانو کو نظر انداز کر دیا کیوں آخر کیوں۔ ارے یہ کیا محفل میں شاہد فراز، امجد علی بھیا، غلام رسول گل، ادی تحسین جونیجو، ادی زرینہ جونیجو دکھائی نہیں دیں۔ ارے بابا لوٹ آؤ میری آواز سن رہے ہوں نا۔ نیرَ شفقت کی یہ دولت لے لے، شفق شیکی میٹھے پرندے، اچھی تحریر پڑھنے کو دیں۔ مسز نوید ہاشمی میں تیرا سایہ ہوں، مبارک علی شمسی چلہ ٹوٹ گیا، اسرار میں ڈوبی تحریر لائے۔ سدرہ انور علی جینے نہیں دوں گی اسرار میں لپٹی انتقامی تحریر تھی۔ ایم اے راحت ہم شکل نارمل طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے صدف آصف ''جمنا داسی'' صفدر علی حیدری میری ''وہ کہانی'' اچھی تھی۔ حنا بشری پازیب جھولا اور وہ، سکندر حبیب گنگا کی سمادھی بے حد پسند آئی۔ محمود شام کا سفرنامہ ''برطانیہ میں خزاں'' پڑھ کر معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ کاشی چوہان ''زہر عشق'' پہلا ناول لکھنے پر بہت بہت مبارک باد، اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ محمد سلیم اختر ''وہ سنہرے سانپ''، شعبان کھوسہ وفا شرط ہے نصرت سرفراز ''موت کا پروانہ'' اسرار بھری بے مثال ناگ تحریریں تھیں۔ جاوید راہی موکل پیر خانے کا، ہمیشہ جرم کی انوکھی تحریر پڑھنے کو دیتے ہیں۔ ممتاز احمد خونی پلیٹ فارم لائے پسند آئی۔ نیو سلسلہ ہائیڈ پارک اور تیرنیم کش سے خوشگوار تبدیلی لائے ہیں۔ اسماء اعوان ''سبایا کا تحفہ'' خاص اسرار میں ڈوبی تحریر تھی۔ کاشی بھیا یہ تھا ہمارا احوال جو کافی طویل ہو گیا بقول آپ کے، مور کے پر جتنے زیادہ ہوں...... اگر اب کانٹ چھانٹ کی تو معصوم پرندہ اور ظالم شکاری والی بات ہوگی۔

☆ پیارے مور! مور کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ پر زیادہ ہوں تو وہ خود بخود جھڑنے لگتے ہیں۔ ظالم شکاری مظلوم پرندہ...... اب ہمیں کچھ نہ کہنا۔

✉ کوئٹہ سے ظفر اللہ رند کی احوال میں آمد ہے لکھتے ہیں خوش آمدید کاشی بھائی واپسی پر...... آپ گئے ہی کب تھے جو واپس آ گئے مگر خوش آمدید لازم ہے۔ میں کچھ مہینوں سے غیر حاضر تھا معذرت خواہ ہوں اس دوران تمام دوست یاد تھے۔ اور جن جن دوستوں نے یاد کیا ان کا شکر گزار ہوں۔ اب آتے ہیں رسالے کی جانب جام شیرین، پین ٹین، لپ اسٹک کلین بیک پارلر کے بعد اداریہ موسم بہار کی آمد کی۔ منزہ آنٹی مبارک باد دے رہی تھیں یہ کیا کاشی بھائی آپ کی باتیں نہیں تھیں کیوں بھائی آپ کی باتیں صرف باتیں نہیں تھے آپ کی باتیں تو موتی تھے جو ہر وقت بکھرے نظر آتے مگر نجانے کیوں اب نظر نہیں آئے۔ احوال میں سب سے پہلے کنول عمران خان نے استقبال کیا۔ آپ نے سچ کہا کہ غزالہ کرن کے خط نے کافی نہیں۔ کچھ زیادہ ہی گرمی دکھائی ہے، سو غزالہ جی پلیز!

احوال میں تو ہم سب ایک دوسرے سے محبت وخلوص بانٹتے رہیں۔ ہم جیسے نئے لکھاری سچی کہانیاں سے سیکھتے ہیں۔ یہیں سے ہمیں الفاظ موتی بن کے ملتے ہیں یہیں، سے ہمیں ادب کا درس ملتا ہے۔ پلیز حوصلہ افزائی کریں میں شکر گزار ہوں آپ کا اور اپنے پروردگار کا۔ اس نے ہماری ٹوٹی پھوٹی دعائیں قبول کیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے جس کا انتظار تھا اس کو پڑھ ڈالا جی ہاں کاشی بھائی آپ نے انتظار کے بعد زہر عشق ہمارے حوالے کر دیا۔ پڑھ کر مزہ آیا اس کے بعد ناگن پڑھ لیا اچھا چل رہا ہے اللہ کرے اب دلاور ہی شگنتلا کی کہانی ختم کرے (دلاور نے کہانی اور شگنتلا دونوں کو ختم کر دیا۔ اب خوش ہونا!!) ہائے برطانیہ میں خزاں محمود شام کی بیچ میں ہمیں بھی اپنے ساتھ اس سفرنامے کے ساتھ لے کر گھمار ہے ہیں۔ ہائیڈ پارک کا اضافہ اچھا لگا اور سوری خط کافی لمبا ہو گیا ہے کاشی بھائی بیچ میں آپ جتنی مرضی قینچی چلائیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔

جو ہرگز ...... ہرگز ...... ہرگز نہ چھوڑی جائے
ایسی عادت بن گئے ہو تم سچی کہانیاں ......؟

☆ اچھے بھائی ظفر! سلامت رہو اب غیر حاضری بالکل نہیں چلے گی۔ انشاء اللہ تمہاری شاعری بھی جلد شائع ہوگی۔

✉ سیالکوٹ سے یہ آمد ہے لیلیٰ مروہ اقبال کی لکھتی ہیں آداب! ایڈیٹر بھیا امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں ''سچی کہانیاں'' کی کافی عرصے سے قاری اور مداح ہوں۔ بہت زبردست پرچہ ہے۔ تمام سلسلے اور کہانیاں لاجواب ہیں۔ فروری اور مارچ کا سرورق بہت دلکش لگا۔ مارچ کے شمارے میں میٹھے پرندے، چلہ ٹوٹ گیا، جمنا داسی، موت کا پروانہ، بہت پسند آئیں۔ نئے سلسلے ''ہائیڈ پارک'' اور ''''تیر نیم کش'' بہت اچھے لگے۔ میں اپنی کاوش سچی کہانیاں کے لیے بھیج رہی ہوں۔ میری کاوش کے بارے میں ضرور بتایئے گا آپ کو کیسی لگی۔ اب اجازت دیں۔

☆ اچھی لیلیٰ! تبصرہ بھیجنے کا شکریہ مگر یہ بتاؤ اتنی غیر حاضریاں کیوں۔ کہانی ابھی نہیں پڑھی جلد ہی ان ہی صفحات پر بتا دیا جائے گا۔

✉ منعم اصغر ڈیرہ غازی خان سے احوال کا حصہ بن رہے ہیں لکھتے ہیں۔ اپریل کا سچی کہانیاں تو اس بار بہت لیٹ ملا کیوں کہ ایک تاریخ کو ملنے والا رسالہ □9 کو ملا، ایک وقت تھا میں یہ رسالہ نہیں پڑھتا تھا مگر یہ وقت پر دستیاب ہوتا تھا۔ خیر وہ تو اب بھی ہوتا ہے اس بار ہی لیٹ ملا ہے، (شکر ہے آپ کو یاد آ گیا!) چلو کوئی بات نہیں۔ اس بار ٹائیٹل بھی بہت پیارا تھا۔ سب سے پہلے منزہ آپی کی کمی محسوس ہوئی۔ پھر احوال میں آئے تمام خطوط ہمیشہ کی طرح بہت ہی اچھے تھے۔ فیصل ندیم بھٹی، تحسین جونیجو، بتول خان، عبدالغفار عابد، شازیہ، شعبان کھوسہ، صفدر عباس، سدرہ انور علی، مسز نوید ہاشمی، منشی محمد عزیز مئے، حسنین کاظمی، ارم ناز، ارم خان اور ایم یعقوب کے خطوط بت پسند آئے۔ ارم آپی خوش رہیے، ہم بھی آپ کے شہر کے ہیں۔ ہر ماہ کیوں نہیں آتیں؟ یعقوب بھائی بہت خوشی ہوئی کہ آپ بھی ہمارے شہر سے ہیں اور ہمیں یاد رکھا۔ بہت شکریہ فرح انیس آپی شکریہ کی بات نہیں ڈیئر، بہترین کہانی خود ہی قاری کے دل میں اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ پھر آپ کی محبت کا بھی شکریہ ارے میرا خط بھی شامل ہے ۔ شکریہ کاشی بھائی آپ کا جواب پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ کہانیوں میں کون مانے گا میری، فرض نبھاتا ہوں، ٹکے کی ہانڈی، کل کس نے دیکھا، میری دلہن تم ہو، کرچیاں، پیر جی، ملے کیوں جب...... کوئی

پراسرار کہانی نمبر 2

Email : pearlpublications@hotmail.com

پراسرار نمبر 1 کی پذیرائی کے بعد پراسرار نمبر 2

ایک ایسا شاہکار شمارہ جس میں دل دہلا دینے والی وہ سچ بیانیاں شامل ہیں جو آپ کو چونکنے پر مجبور کر دیں گی۔

آپ کے اُن پسندیدہ رائٹرز کے قلم سے، جو آپ کی نبض شناس ہیں۔

جن کی کہانیوں کا آپ کو انتظار رہتا ہے۔

جنوں، بھوتوں اور ارواحِ خبیثہ کی ایسی کہانیاں جو واقعی آپ کو خوف میں مبتلا کر دیں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے......

ایسی ناقابلِ یقین، دہشت انگیز اور خوفناک کہانیاں شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرا لیں۔

سچی کہانیاں کا ماہِ اگست کا شمارہ، پراسرار نمبر 2 ہوگا۔

نوٹ: پراسرار نمبر 2 کے لیے کہانیاں بھیجنے کی آخری تاریخ 5 جون ہے۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرما لیں۔

ملال نہیں، ڈھونڈوں کہاں امان اور ناگن کا اختتام بہت اچھا لگا۔ سب تحریریں بے مثال تھیں باقی ابھی پڑھی نہیں، زہر عشق لاجواب ہے۔ کاشی بھائی نے ایسا پرچ مسالہ لگا کر پیش کیا ہے کہ ایک ہی بار میں چاٹ لیا بہت مزہ آیا۔ بھیا! کیا ہر خط میں کوپن ہر بار لکھنا لازمی ہے؟؟ تبصرہ لیٹ کر رہا ہوں امید ہے جگہ مل جائے گی۔

☆ اچھے منعم! سلامت رہو! تبصرہ خوب رہا۔ ہاں منعم! ہر بار کوپن بھیجو گے نا تو پتا چلا گا نا تم ہم سے کتنی محبت ہے اور کتنے پرچے ہمارے گھر لاتے ہو! امید ہے اگلے ماہ تمہارے کوپن ہمارے سوال کا جواب ضرور ہوں گے۔

✉ چشتیاں سے ہمارے لکھاری اور شاعر دوست علی حسنین تابش شامل احوال ہیں۔ عرض کرتے ہیں سچی کہانیاں کا پراسرار نمبر بے حد خوبصورت انداز سے تیار کیا گیا تھا۔ مجھے بہت پسند آیا، کاشی بھائی جان! کیا بات ہے آپ کی۔ آپ تو گریٹ ہو۔ 'زہر عشق' بہت خوبصورت لکھا۔ پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ بھائی جان لیٹر لکھنے میں بہت لیٹ ہوگیا پلیز شائع ضرور کرنا۔ سلیم اختر صاحب کی اسٹوری 'وہ سنہرے سانپ' بے حد خوبصورت تھی۔ سدرہ انور علی، نصرت سرفراز، اور جاوید راہی صاحب کیا خوب لکھتے ہیں۔ آپ کی اسٹوریز بھی خوبصورت تھیں بہت پسند آئیں۔ بھائی کاشی یہ کیا بات ہوئی۔ آپ نے اس بار 'کچھ اپنی باتیں' کالم کو ختم کر دیا؟ اس کی بہت کمی محسوس ہوئی۔ 'تیر نیم کش' بھی بہت اچھا سلسلہ ہے مجھے پسند آیا۔ باقی پرچہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ میرے والد صاحب کو پچھلے چند ماہ سے فالج کا اٹیک ہوا ہے۔ لیکن اب اللہ کے کرم سے بہتر ہیں۔ پلیز آپ سب بھی دعا کریں۔ اب تک کے لیے اتنا ہی، زندگی رہی تو پھر شامل محفل ہوں گے۔

☆ پیارے حسنین! ابو کے لیے تو ہم نے بھی بہت دعائیں کی ہیں۔ تم اپنا خیال رکھو۔ ہم تمہاری محبت کے مقروض ہیں۔

✉ صائمہ بشیر نیو سول لائن سرگودھا سے اپنی محبت لے کے شامل احوال ہیں لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے اپنا تعارف کرواتی ہوں۔ میرا نام صائمہ بشیر ہے۔ میرے شوہر اسسٹنٹ کمشنر ہیں۔ اور سرگودھا میں ہماری رہائش ہے۔ ایک عرصے سے کتب و رسائل جن میں سچی کہانیاں شامل ہے میرے زیر مطالعہ ہیں۔ ادب سے گہرا تعلق ہے بلکہ میں یوں کہوں گی ادب مجھے ورثے میں ملا ہے۔ میرے والد محترم جناب بدرالدین بدر ایک بلند پایہ اور مایہ ناز شاعر تھے۔ ان کی شاعری کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ سچی کہانیاں کا مطالعہ ابھی باقاعدگی سے ہر ماہ کرتی ہوں۔ مارچ کا شمارہ پراسرار نمبر بہت ہی زبردست اہمیت کا حامل تھا۔ بہت اچھا لگا احوال بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ بہن بھائیوں اور اپنے چھوٹے بچوں کے خطوط جن میں ایک دوسرے کے لیے بے پناہ عزت و احترام، پیار و خلوص ہوتا ہے۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ سچی کہانیوں کے اعلیٰ معیار اور احوال میں پیار اور خلوص سے بھرپور ماحول دیکھ کر میرا بھی خط لکھنے کو دل چاہا۔ یہ میری زندگی کا کسی بھی رسالے میں پہلا خط ہے۔ سچی کہانیاں کا اداریہ اور چھوٹے بھائی کاشی چوہان کی کچھ اپنی باتیں دل کو موہ لیتی ہیں مگر مارچ کے شمارے میں کچھ اپنی باتیں نہ پا کر ایک بہت بڑی کمی محسوس ہوئی، سب بچوں اور بہن بھائیوں کے خطوط اور تمام رائیٹرز کی کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہیں، چھوٹی سی سویٹ اور کیوٹ بہن سدرہ انور علی اور مسز نوید ہاشمی اور عظمیٰ شکور کے خطوط تو بہت ہی لاجواب ہوتے ہیں۔ پراسرار نمبر میں شائع

تحریروں میں پختگی لاؤ۔

✉ امجد علی چیچہ وطنی آباد سے بڑے دنوں بعد احوال میں حاضری دے رہے ہیں۔ کاشی بھائی آپ کے بے حد شکریہ۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ شکریہ کیسا؟ یہ تو میرے بھائی آپ نے ماہ نومبر میں میری نظم ''انتظار'' لگائی تھی۔ میں آپ کی محبت تو نہیں بھول سکتا نا؟ مجھے سچی کہانیاں میں لکھنے کے لیے ہمیشہ مور شاہد حسین نے آمادہ کیا ان کی خوشیوں اور کامیابیوں کے لیے تہہ دل سے دعا گو ہوں۔ ماہ اپریل 2014 سے ماہ اکتوبر 2014 تک ہر ماہ سچی کہانیاں پابندی سے خط لکھا کرتے تھے۔ مور شاہد حسین، غلام رسول، ظفر علی، غلام حسین اور ہم میں مقابلہ ہوتا تھا کہ کس کا خط پہلے پہنچے گا۔ مگر پتا نہیں کیا ہوا۔ آج کل کہاں غائب ہیں؟ پلیز دوستو احوال میں واپس آ جاؤ۔ ہم آپ کی محبت کے مقروض ہیں۔ سچی کہانیاں کا پُر اسرار نمبر دیکھ کر دل سرشار ہوا۔ خوفناک کہانیاں مجھے بے حد اچھی لگتی ہیں۔ بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ لہٰذا تمام کہانیاں خوف میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ کاشی بھائی ایک تازہ نظم بھیج رہا ہوں۔ حوصلہ افزائی کی امید کے ساتھ، اس کے ساتھ ہی محبت نامہ بند کر رہا ہوں۔

☆ پیارے امجد علی! مور تو ہمارا بہت تابعدار بچہ ہے۔ تم سب بھی اب ایک دوسرے کو آوازیں نہ دو، واپس لاؤ۔ اب ہم نے یہ تمہاری ڈیوٹی لگا دی ہے، اگلے ماہ ہمیں سب ساتھی احوال میں چاہییں۔

✉ سرگودھا سے یہ پہلی پہلی آمد ہے ثمینہ فرح صاحبہ کی لکھتی ہیں۔ کاشی بھیا سچی کہانیاں کی بہت پرانی قاری ہوں مگر اب پہلی مرتبہ احوال میں لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں اس کی تین وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ دوسرے رسالوں سے سچی کہانیاں کا معیار بہت اچھا ہے۔ دوسرا احوال کا سلسلہ مجھے پسند ہے۔ سب بہنوں اور بھائیوں کے رنگا رنگ خطوط، جن میں ایک دوسرے کے لیے بہت ساری اپنائیت نظر آتی ہے۔ تو آج کے دور میں دوسروں کو عزت دینا اور بے لوث پیار دینا بہت بڑی بات ہے اور تیسرا کہ سچی کہانیاں کی یہ پالیسی کہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور ان کو رائیٹر بنانا تو ان کے وجوہات کے پیش نظر میں نے بھی قلم اٹھایا ہے اور لکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ گو میری گھریلو لائف بہت مصروف ہے۔ میرے خاوند ڈاکٹر ہیں۔ بچے اسکول، کالجز اور یونیورسٹی جاتے ہیں گھر میں مہمان داری بہت ہے تو اگر آپ نے حوصلہ افزائی کی۔ احوال میں ویلکم کیا گیا تو پھر ہر ماہ خط کے ساتھ ایک کہانی بھی ارسال کروں گی۔ پُراسرار نمبر بہت ہی دلکش اور زبردست تھا۔ اکیلے بیٹھ کر کہانیاں پڑھنے سے ڈر لگ رہا تھا تو بچوں کی موجودگی میں پڑھ رہی ہوں۔ زہر عشق کی پہلی قسط سے پڑھنا شروع کیا ہے۔ ناول کی شروعات تو بڑے زبردست انداز میں ہوئی ہے، جو کہانیاں پڑھی ہیں ان میں بھیا ممتاز احمد کی خونی پلیٹ فارم، مسز نوید ہاشمی کی میں تیرا سایہ ہوں، حنا بشریٰ کی پازیب، جھولا اور وہ، بھائی مبارک علی شمسی کی چلہ ٹوٹ گیا، بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ بیٹی سدرہ انور علی نے جینے نہیں دوں گی، کے عنوان سے اچھی کہانی لکھی۔ سدرہ بیٹی! مجھے آپ کی ایک بات بہت اچھی لگتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ کا تبصرہ بہت جامع ہوتا ہے اور دوسرا آپ باقاعدگی سے بلاناغہ ہر ماہ احوال میں اپنے خط سے احوال کی رونق بڑھاتی ہو۔ مجھے مستقبل کی آپ منجھی ہوئی رائیٹر نظر آ رہی ہو۔ کاشی بھیا پلیز یہ کوپن والا سلسلہ ختم کریں، پلیز! ہائیڈ پارک کا جو نیا سلسلہ شروع کیا ہے، وہ پسند آیا ہے۔ کاشی بھیا آپ کی کچھ اپنی باتیں

خواتین کی محبوب قلم کار

کئی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ یافتہ 'رفعت سراج'

رفعت سراج، جن کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

رفعت سراج، وہ قلم کار، جن کو قلم کی حرمت کا پاس، زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔

رفعت سراج، وہ قلم کار جنہیں اپنی تحریر سے دھڑکنیں بے ترتیب کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔

گلابی کاغذ اور زرد پھول کے بعد......

دامِ دل

نئے شاہکار ناول کے ساتھ، آپ کے روبرو

ماہنامہ "دوشیزہ" ڈائجسٹ میں ملاحظہ کیجیے۔

مارچ کے شمارے میں کیوں نہیں ہیں؟ ابھی مکمل شمارہ نہیں پڑھ سکی۔ جن بہن بھائیوں کی کہانیوں پر اظہار خیال نہیں کر سکی ان سے معذرت چاہتی ہوں کیوں کہ کہانی پر تبصرہ اس وقت ہی اچھا لگتا ہے جب مکمل کہانی پڑھی ہو۔Next Month احوال میں کہانی کے ساتھ حاضر ہوں گی۔ اب اجازت چاہوں گی۔

☆ عزیز ثمینہ جی! خوش آمدید۔ لیجیے ہم نے وعدہ پورا کیا۔ اب دوسرا وعدہ آپ پورا کریں، ہم انتظار کر رہے ہیں۔

✉ سدرہ انور علی جھنگ سے احوال کا حصہ بن رہی ہیں لکھتی ہیں عزیز از جان کاشی چوہان، مائی سویٹ سسٹرز، مائی ڈیئر برادر اینڈ آل اسٹاف السلام وعلیکم! اسی امید اور یقین کے ساتھ محفل میں آئی ہوں کہ تمام پڑھنے والے صحت وایمان کی بہتر اور مستحکم حالت میں ہوں گے۔ اپریل کا پرچہ تھکا دینے والے انتظار کے بعد ملا۔ منزہ آنٹی کا اداریہ، بڑا دہشت گرد کون؟ ہم میں سے شاید ہی کسی کے پاس اس کا جواب ہو۔ احوال میں سب نے شاندار لکھا۔ ارم ناز، احسان سحر، سلمان آزاد، یاسر علی، حسین کاظمی، محمد یعقوب کو احوال میں ویلکم۔ مجید احمد سلام ویر! کیسے ہو؟ شاید شکر کم ہوگئی ہو مگر میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا، سلام ملکہ احوال تحسین جونیجو میں ایک دم سے ٹھیک ٹھاک، فٹ فاٹ ٹپ ٹاپ، فائن شائن اور کیسی ہو اور زرینہ آپی ٹھیک ہیں، بہت خوشی ہوئی انہیں سلام کہنا۔ تحسین ڈیئر تمہارا خط بہت خوبصورت لگا بالکل تمہاری طرح۔ فیصل ندیم وعلیکم السلام ویر! نیکسٹ ایئر تک انتظار کر لو زندگی رہی تو پھر وہی سیلہ آئے گا۔ عبدالغفار عابد بھیا! میرا یہ اصول ہے محبت سے محبت کرتی ہوں نفرت سے نفرت کرتی ہوں۔ دوریاں دور کرتی ہوں، فریق سے رفیق بنتی ہوں، شریک سے عزیز ہوتی ہوں۔ مگر اس کو لوگ چاپلوسی کا نام دے دیتے ہیں۔ چاپلوسی تو اس کے ساتھ کرتے ہیں جس کے ساتھ کوئی مطلب ہوتا ہے۔ یہاں پر تو لوگ خون جلانے والی تنقید کرتے ہیں اب آپ ہی بتائیے کیا کروں؟؟ ہم فنا ہو گئے وہ بدلے پھر بھی نہیں۔ ہماری چاہت سے بھی سچی تھی نفرت اس کی۔ صفدر عباس بھیا کھاؤ پیو ضرور مگر خیال سے! یہاں اپنے حریف بھی بہت ہیں۔ شکر کر وہ ایک ہی بار آئے ورنہ اب تک فنا ہو چکے ہوتے۔ کنول عمران خان، عظمیٰ شکور، شائستہ جمال، مسز نوید ہاشمی، فریدہ فری یوسف زئی، مور شاہد بھیا، عبدالعزیز انکل کو سلام۔ کاشی بھیا کیا یہ اپنی فریدہ یوسف زئی اور فریدہ جاوید ایک ہی شخصیت ہیں۔ (جی ہاں، یہ ایک ہی شخصیت ہیں) نمایاں شخصیات میں احمد سجاد بابر کی نیلسن منڈیلا کی لازوال داستان پڑھنے کو ملی، قیامت سے پہلے قیامت، رضوانہ پرنس نے ایک قیامت خیز واقعہ سانحہ پشاور APS کی لرزہ خیز یاد دلا کر پھر رُلا ڈالا۔ اقراء سیف کی دنیا اک بگلا بھگت، مجید احمد جائی کی فرض نبھاتا ہوں، ہم مس ایمن کی کون مانے گا میری، محمد یعقوب کی ٹکے کی ہانڈی، معاویہ عنبر وٹو کی کل کس نے دیکھا، عجب ملن ہمارا ہوا فیصل ندیم بھٹی کی، زندگی صحرا نشیں ہو جیسے عبدالغفار عابد کی، پردیس مت جیو بہت اچھی اور لاجواب تحریریں لگیں۔ میں بانجھ ہوں حمیرا راحت کی درس دیتی تحریر ہے۔ بابر نایاب بہت دیر کر دی بہت نایاب اور سبق آموز تحریر لے کر آئے۔ اسماء اعوان کی میری دلہن تم ہو بہت لاجواب تحری ہے۔ روشن علی کی ڈھونڈو کہاں ارمان، حمیرا خان کی سب کچھ مایا، نسیم صدف کی اگھور انفس مورا، ممتاز احمد کی ملے کیوں جب بچھڑنا تھا۔ بہت شاندار کہانیاں تھیں۔ جاوید راہی کار جہاں دراز ہے میں کوئی ملال نہیں سبق سکھاتی ہوئی اچھی کہانی تھی۔ مرد کہانی میں اپنی نوعیت کی 3 تحریر پسند

افسانہ نمبر

زندگی کی مصروفیات سے وقت نکال کر کچھ لمحے

صرف ''اپنے لیے''

اُن لمحات میں،

صرف آپ ہوں اور دوشیزہ

اور ماہِ مئی کا دوشیزہ تو بہت خاص ہے۔ کیونکہ اس میں آپ کے پسندیدہ مصنفین کے درجن بھر افسانے جو شامل ہیں۔ دردانہ نوشین خان، نگہت اعظمیٰ، کاشی چوہان، سلمٰی غزل، نسیم سحر، احمد سجاد بابر، تحسین عابدی، عابدہ سبین، راحت وفا راجپوت، الماس روحی، عصمت پروین عظیمی، حنا اصغر، فوزیہ احسان رانا، اُمِ مریم کی یادگار تحریروں سے سجا افسانہ نمبر،

ایک ایسا شمارہ جو یقیناً یادگار ہوگا

مقبول ترین لکھاری رفعت سراج کے شاہکار ناول 'دامِ دل' کی تہلکہ خیز نئی قسط۔ بینا عالیہ کا ناول 'تیرے عشق نچایا' نئے موڑ پر۔

اس کے علاوہ شوبز کی مقبول شخصیات کے ساتھ 'دس سے سوال'، منی اسکرین اور وہ تمام مستقل سلسلے جن کا آپ ہر ماہ بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔

دوشیزہ کا ماہِ مئی کا شمارہ افسانہ نمبر ہوگا، ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

مئی 2015ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/ کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: ---

مکمل پتا: ---

مئی 2015ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/ بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: --- تعداد صفحات: ---

نام: ---

مکمل پتا: ---

فون/سیل نمبر: ---

مئی 2015ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/ کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: --- مصنف: ---

دوم، عنوان: --- مصنف: ---

سوم، عنوان: --- مصنف: ---

نام: --- شہر: ---

آئیں۔ ناگن، جہاں جان لیوا انجام پر رخصتی ہوئی وہیں زہر عشق کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ دوسری قسط بھی کمال کی ہے۔ ہائیڈ پارک میں سب ہی کے انتخاب پڑھے اچھے لگے۔ تیر نیم کش میں سب کے اشعار پسند آئے۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ پھر ملاقات ہوگی اسی پلیٹ فارم پر، تب تک کے لیے بائے بائے اینڈ اللہ نگہبان۔

☆ پیاری گڑیا تم تو بڑے کمال کی باتیں کرتی ہو۔ تبصرہ اچھا لگا۔ خوش رہو۔

✉ لیہ سے آمد ہے محمد یوسف لغاری کی لکھتے ہیں۔ کاشی بھائی بیا تنگ دہل کچھ کہہ رہے تھے مگر بھائی ہم بھی بیا تنگ دل کہہ رہے ہیں کہ ہم اس وقت لکھیں گے جب ''تسی'' ہوں گے۔ کیوں کے اپ کے ادوار میں میرے خط کی اتنی کانٹ چھانٹ نہیں ہوئی۔ جتنی گزشتہ ادوار میں ہوئی ہے مگر ہم اس بات پر رو پڑیں تو ہمارے آنسو آپ کے ادارے تک پہنچ جائیں گے۔ اور اس پر ایک عدد سچی کہانی وجود میں آجائے گی مگر ہم نے صبر کرتے ہوئے اس کو ادارے کی بہتری جانا۔ رسالے میں اتنی اچھی اور مناسب تبدیلیاں واہ کیا بات ہے! سب سے پہلے ''زہر عشق'' میں جا پہنچے وہاں عشق کا زہر اس قدر زہریلا تھا۔ اُف یہ منظر کشی تھی اور کیا لفظوں پر عبور تھا، اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ پہلی سانپ کہانی جس میں سلیم صاحب نے حشرات الارض سے محبت کی تلقین کی۔ کمانڈو بھائی شعبان کھوسہ کی کہانی نے دل کو چھو لیا کیا واقعی وفا ہی سب کچھ ہوتی ہے لیکن آخر میں شعبان کھوسہ نے جو سوال پوچھا ہے اس کا جواب دینے پر کوئی انعام بھی ہے یا نہیں، رسالے میں مجھے سب سے زیادہ اچھا سلسلہ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش لگا۔ کیوں کہ یہ مجھ جیسے قارئین کے لیے ایک اچھا سلسلہ ہے، جو کہانی لکھنا نہیں جانتے تو اقتباس وغیرہ ارسال کر سکتے ہیں۔ کاشی بھائی ساتھ ایک تحریر ارسال خدمت ہے اگر ممکن ہو تو اس بارے میں کچھ بتلا دیں ادارے کی ترقی کے لیے دعا گو!

☆ پیارے یوسف سلامت رہو! تمہارا صبر شدید اختتام کو پہنچا اور اس ماہ اپنی 3G کو انجوائے کرو۔

✉ پتوکی سے یہ آمد ہے ہمارے نئے قاری ساتھی محمد ندیم عباس میواتی کی، لکھتے ہیں محترم کاشی چوہان ہماری طرف سے الفت بھرا سلام...... براہ کرم قبول فرمائیں۔ محترم ہم میوار اجپوت ہیں اسی نسبت سے میواتی لکھتے ہیں آپ نے ہمیں ہواتی بنا دیا منزہ سہام جی نے بہت خوبصورت انداز میں موسم بہار سے آگاہ کیا۔ سو تھینکس...... ہم یعنی محمد ندیم عباس میواتی آپ اپنے شہر سے متعارف کرواتے ہیں۔ ہمارا شہر پتوکی کی نرسری اور پھولوں بالخصوص گلاب کی بدولت پاکستان میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ تقریباً پورا پاکستان پھول اور پودوں کے لیے ہمارے شہر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ویسے تو ہمارے ہاں ہر وقت ہی بہار کا موسم ہوتا ہے لیکن موسم بہار میں تو ہمارا شہر جنت کا ٹکڑا لگتا ہے۔ آج ہم موسم بہار کی خوشی میں نمایاں لکھاریوں کے لیے گلاب کے گلدستے لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے محترم کاشی چوہان زہر عشق کہانی بہت پسند آئی اور ہمارا خط شائع کر کے حوصلہ افزائی کی۔ اس پر گلاب کے پھولوں کا گلدستہ قبول فرمائیں۔ خوفناک سائے۔ سدرہ انور علی کی اسٹوری پڑھ کر لگتا ہے آپ نیو لکھاری ہیں۔ اسٹوری اچھی تھی۔ چلہ ٹوٹ گیا، موت کا پروانہ، گنگا کی سمادھی، حنا بشریٰ، نصرت سرفراز، مسز نوید ہاشمی، کمال لکھتے ہیں آپ سب۔ سایا کا تحفہ پر اسماء اعوان کو بھی گلدستہ۔ باقی اسٹوریاں پڑھی نہیں۔ انکل حسن نظامی جی کیسے مزاج شریف ہیں۔ ہماری طرف سے

تمام قارئین کو بہت بہت موسم بہار کی مبارک اور سلام ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش وخرم رکھے۔ آمین۔

☆ پیارے ندیم تمہارا تبصرہ اچھا لگا مگر ہم تک آتے آتے اسے زمانے لگ گئے۔ مگر اب بھی گلابوں کی مہک باقی ہے۔

✉ یہ احوال میں آمد ہے ہم سب سے پسندیدہ لکھاری جاوید راہی کی اوکاڑہ سے۔ لکھتے ہیں۔ کچھ قدرے یا کچھ زیادہ حساس لمحوں کا جلترنگ روح کے ادھ کھلے دریچے پر اپنے دُکھ بھرے گیت بکھیرتا ہوا اپنے پیچھے کئی سوالیہ جملے چھوڑتا گزر گیا۔ جیسا کہ ماہ اپریل 2015ء کے سچی کہانیاں کا اداریہ۔ اپنے قلم کی برداشت کو سمیٹے محترمہ منزہ سہام صاحبہ نے جو سوال اُٹھایا ہے ان کے لیے کوئی نیا پن نہیں۔ جب جب ملک عزیز کے کسی بھی بسنے والے کو کوئی کرب ناک نشتر چبھتا ہے، ان کی روح کو بھی زخمی کر جاتا ہے۔ مجھے مرحوم ومغفور محترم سہام مرزا صاحب کے ساتھ گزرا تھوڑا سا وقت یاد آ گیا ہے۔ اُس وقت موبائل نہیں تھے ایک دوسرے کے ذریعہ پیغام رسانی ہو جایا کرتی تھی۔ کتابت کا دور تھا۔ ماہنامہ افسانہ کراچی کے کاتب محسن بھائی اُن کے ہمراہ آتے دکھائی دیے۔ کچھ دیر کے میک سلیک ہوئی، باتوں باتوں میں پتا چلا کہ سہام مرزا صاحب محسن بھائی کی والدہ کو اپنا خون عطیہ کرنے جا رہے تھے۔ جو کینسر کی مریضہ تھیں۔ محترمہ ایسے باپ کی بیٹی ہیں جو انسانیت کی قدروں کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اپریل 2015ء کا اداریہ 'بڑا دہشت گرد کون؟' ملک کے ہر بڑے چھوٹے صاحب اقتدار سے براہ راست ایک سوال ایک لمحہ فکریہ کا سا جواب۔ یہ کون لوگ ہیں؟ جو چاروں جانب آگ اور خون کے کاروبار کو فروغ دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ اب آتا ہوں اپریل 2015ء کے شمارے کی طرف! از ہر عشق کاشی چوہان کی لمبی غیر حاضری کا دل میں اُتر جانے والا تحفہ خاص ہے۔ ان کی بہت سی تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ بہت کوشش ہوتی ہے کہ کسی بھی موڑ پر میں اسے قابو کر پاؤں مگر یہ صاحب صاف نکل جاتے ہیں۔ اللہ تبارک تعالیٰ ان کی عقل وخرد میں اضافہ فرمائیں۔ اپنے مرشد جناب ایم اے راحت کی ''ہم شکل'' میرے سمیت ایسے نوآموز رائٹرز حضرات کے لیے اسکول آف تھاٹ کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کی صحت اور لمبی عمر کے لیے ہمیشہ دعا گو رہتا ہوں۔ سچی کہانیاں مبارکباد کا ایوارڈ روز اول سے وصول کرتا آ رہا ہے اور میری دُعا ہے کہ یہ روایت محترمہ منزہ سہام صاحبہ، سہام مرزا صاحب کے بعد بدستور جاری رکھیں گی، ان شاء اللہ۔ اپنی مصروفیات کے باوجود جتنی بھی کہانیاں پڑھ سکا ہوں ان میں دنیا اِک بگلا بھگت اقراء سیف صاحبہ کی بہترین کاوش ہے۔ پیر جی، اگھور انفس، خوب ہیں۔ ''برطانیہ میں خزاں'' بابائے صحافت جناب محمود شام کی آبلہ پائی کے لیے دُعا کرتا ہوں کہ آپ اسی طرح بغیر ویزا، بغیر پارسپورٹ، بغیر دیگر اخراجات کے قارئین سچی کہانیاں کو یونہی لطف اندوز کرتے رہیں۔ اس کے ساتھ ہی ادارہ سچی کہانیاں کے لیے دن رات ترقی کی دُعا ہے۔

اور ہاں میرے ایوارڈ کا کیا بنا؟ کاشی بھائی۔

☆ عزیز من! انشاء اللہ اسی سال دوشیزہ ایوارڈ کی تقریب میں آپ کا ایوارڈ بھی آپ کو عطا کر دیا جائے گا۔ آپ کا خط صحرا میں ساون جیسا لگا۔ خدا کرے آپ جیسی مایہ ناز ہستیاں ہمارا مان رہیں۔

✉ دیپال پور سے یہ آمد ہے ہمارے نئے احوالی یاسر وکی کی، لکھتے ہیں میں آپ کی اس محفل میں دوسری بار قدم رکھ رہا ہوں۔ مجھے اپریل کا شمارہ ملا پڑھ کر یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میرا لیٹر بھی لگا

ہوا ہے۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی میں اور سچی کہانیاں بہر حال۔ سر جی آپ کی مہربانی ہو گی آپ نے حوصلہ افزائی کی میں یہ ڈائجسٹ بڑے دل سے پڑھتا ہوں اور لکھنے کا تو شوق بچپن سے ہی تھا اور میں اب نہم کلاس کے ایگزامز سے فارغ ہوا ہوں۔ ابھی تک اسٹڈی کر رہا ہوں لیکن یہ رسالہ میرے سب ٹیچر میل اینڈ فی میل پڑھتے ہیں اور کاشی سر اگر آپ نے حوصلہ افزائی کی تو میں ہر ماہ لکھوں گا اور ہاں مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں اپنی سٹی سے کا واحد رائیٹر ہوں اور کوئی بھی نہیں۔ پتا نہیں کیوں ہمارے سٹی کے لوگ ان چیزوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ بس پڑھ لیتے ہیں اور لکھنے کی ہمت نہیں کرتے۔ دیپال پور اور اڈہ صالحوال والو! اٹھاؤ قلم اور لکھو، کاشی صاحب آپ کو مایوس نہیں ہونے دیں گے مجھے ان پر بھروسہ ہے اور وہ دن دور نہیں جس دن صالحوال اور دیپالپور کے لوگوں کا سچی کہانیاں میں نام ہوگا۔ سر میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔

☆ یاسر ہمیں بھی انتظار رہے گا کہ کب دیپال پور والے ہماری محبت کا جواب دیں گے اور کب تک صالحوال اور دیپال پوری ہماری محبت سے بچ پائیں گے۔

✉ احوال میں یہ مختصر حاضری ہے فیصل آباد مدینہ ٹاؤن سے میاں طارق محمود صاحب کی، لکھتے ہیں۔ بھائی جان پھولوں کی طرح مسکراتے رہیں سچی کہانیاں ماہنامہ جو کہ پاکستان اور ساری دنیا میں پڑھا جاتا ہے۔ آپ کی خدمت میں لکھے ہوئے اشعار غزل اپنی نظم سچی کہانیاں میں بھیج رہا ہوں۔ شفقت فرمائیں۔ مئی 2015ء یا بعد کے شمارے میں شائع فرمادیں۔ مشکور ہوں گا۔ میری دعا ہے آپ اور آپ کا سارا اسٹاف خوش وخرم رہے اور سچی کہانیاں اسی طرح ترقی کرتا رہے۔

☆ اچھے بھیا! آپ کی ڈاک بہت تاخیر سے موصول ہوئی انشاء اللہ جلد آپ کی ارسال کردہ تحریروں پر نظر ثانی کریں گے۔

✉ یہ آمد ہے ہمارے بہت عزیز ساتھی۔ فیصل ندیم بھٹی کی چک شمالی 58 سرگودھا سے، لکھتے ہیں۔ ماہ اپریل کا شمارہ انتظار کرتے کرتے آخر کار مل ہی گیا۔ سرورق پر دوشیزہ جھمکوں کے ساتھ معصوم چہرہ لیے استقبال کرتی محسوس ہوئی۔ سب سے پہلے منزہ سہام مرزا صاحبہ کا اداریہ 'بڑا دہشت گرد کون' پڑھا جو واقعی ہمیں سوچنے پر مجبور کر گیا۔ کاشی بھائی اس بار پھر آپ کی کچھ اپنی باتیں شامل نہیں تھیں۔ PLZ لکھیں جب احوال کے صفحے پر پہنچے تو کاشی بھیا احسان کیا ہے آپ نے حقیقت سے آشنا کیا ہے۔ سب سے پہلے احوال میں نئے آنے والے احوالیوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ جن میں نوشین آراء کراچی سے، سلیمان سٹی کشمیر سے، بتول خان نیازی لاہور کو سلام پیش کرتا ہوں پری زاد، حسنین کاظمی، ایم یعقوب، آپ کی احوال میں شرکت سچی کہانیاں سے محبت ثبوت ہے شازیہ گل اللہ آپ کو امتحانات میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین۔ اسامہ ندیم مسلسل احوال سے غائب ہیں شاید امتحانات میں مصروف ہیں۔ منشی محمد عزیز مے' نگہت غفار، مور شاہد بھیا، رانا شاہد بورے والا کو سلام۔ سدرہ انور علی صاحبہ ہم پچھلے ماہ غیر حاضری کے بعد احوال میں آگئے۔ آپ نے بندہ ناچیز کو یاد کیا بہت شکریہ۔ ممتاز احمد صاحب آپ بھی احوال سے غائب ہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف احمد سجاد بابر نے نیلسن منڈیلا کے بارے میں بہت زبردست ان کی زندگی کی روداد لکھی۔ رضوانہ پرنس کی ''قیامت سے پہلے قیامت، اقراء سیف کی دنیا اک بگلا بھگت زبردست کہانی رہی، عنبر معاویہ دو پل کس نے دیکھا۔ میری اپنی کہانی عجب ملن یہ ہمارا ہوا تو قارئین ہی بتا سکتے ہیں۔ عبدالغفار عابد کی

زندگی صحرانشیں ہو جیسے یہ کہانی، برداشت کرنے کی صلاحیت کو اجاگر کرتی ہے۔ شاہد رفیق سہو کبیر والا۔ حمیرا راحت کی میں بانجھ ہوں' زبردست کہانی ہے۔ بہت دیر کر دی ٹھیک تھی۔ اسماء اعوان کی میری دلہن تم ہو بہترین تھی۔ ایم اے راحت کا ہم شکل دلچسپی کے مراحل میں ہے۔ محمد علی روشن ڈھونڈوں کہاں امان' حمیرا خان کی سب کچھ مایا ہے اور نسیم سکینہ صدف کی انگور انفس مورا زبردست رہیں محمود شام کا سفرنامہ برطانیہ میں خزاں کا تیسرا حصے میں بہترین منظرکشی شامل رہی۔ کاشی چوہان کی زہر عشق میں محبت کا انداز' ہے تو ناقابل یقین لیکن پڑھتے ہوئے منظرکشی کا الگ ہی رنگ تھا۔ جاوید زاہی کی کوئی ملال نہیں' جاوید صاحب آپ کی کہانی پڑھ کر تو ہم بھی ہوشیار ہو گئے ہیں (اچھا ہوا بتا دیا' کہیں آپ بھی۔۔۔) ممتاز احمد کی ملے کیوں جب بچھڑنا تھا محبت کی لازوال کہانی ہے۔ پہلی مرد کہانی پیر جی اقبال بانو نے مکروہ دھندا کرنے والے چہرے کو بے نقاب کیا ہے۔ ڈاکٹر محمود الرحمٰن عہد وفا نبھاتا ہے' اور صائمہ نفیس کی کرچیاں زبردست ہیں' اعجاز احمد نواب کی ناگن کی آخری قسط سنسنی خیز مراحل سے گزرتی ہوئی آخر اختتام پذیر ہوئی۔ مسئلہ یہ ہے بابا جی کہ فیض سے ہزاروں لوگ فیض حاصل کر رہے ہیں۔ بابا جی کو اللہ صحت و تندرستی عطا فرمائے آمین۔ ہائیڈ پارک میں بہت نصیحت آمیز مواد تھا۔ تیر نیم کش بھی اچھے اشعار سے مزین تھا۔ ان ہی الفاظ کے ساتھ اجازت۔

☆ بہت پیارے فیصل! تمہارے تبصرے نے دل خوش کر دیا۔ سلامت رہو۔ اگلے ماہ احوال تمہارا منتظر رہے گا

✉ لڈن دہاڑی سے ہمارے پیارے منشی صاحب...... ارے بھئی منشی محمد عزیز مئے احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ گذشتہ ماہ جلدی رسالہ مارکیٹ میں لانے کا شاید ریکارڈ تھا اور اس بار لیٹ لانے کا؟ اتنی دیر! خیریت تو تھی جناب؟ لاہور، کراچی، چکوال، چیچہ وطنی، سرگودھا، کہاں کہاں نہیں

ناقابل اشاعت تحریریں

انوکھا چراغ	شاہد رفیق سہو
ناجائز	منعم اصغر
ہری آنکھیں	منعم اصغر
ٹک ٹک ٹک	مجید احمد جائی
نقلی جن اصلی پیر	مہر پرویز احمد دولو
وہ رات	فائزہ آفتاب
خوابوں کی تعبیر	محمد ندیم عباس میواتی
خونی دنیا	ملک این اے کاوش اعوان
ندامت	صبا اکرم
رنگ ہائے زیست	سحرش فاطمہ
میں کیسا لگ رہا ہوں	احسان سحر
تفتیش	عارف رمضان جتوئی
گناہوں کی سچی توبہ	محمد ارسلان بنگش
خاموشیاں	کشاف اقبال
اللہ اکبر	ڈاکٹر میاں احسان باری
رائیگاں ہے زندگی	ساحل ابڑو
منزل پہ آ کے لٹے کارواں	شازیہ جاوید شازی
قبر کھل گئی	ڈاکٹر غضنفر عباس اسدی
خوف	مور شاہد حسین
بدنصیب شخص	بشیر احمد بھٹی
خطا کی تھی	احمد فراز احمد
تیسرا کنارہ	فریدہ شاہ

فون کیا، سب ہی دوستوں کا جواب نفی میں ہوتا تھا، خیر جناب بڑی منتوں اور منتوں کے بعد آٹھ تاریخ کو سچی کہانیاں ملا اور پھر وہ دو دن میری بڑی مصروفیات کے تھے۔ باجی منزہ سہام کا اداریہ بڑا دہشت گرد کون، یہ سوال ابھی تک جواب طلب ہے اور شاید اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ احوال کی ابتداء ایم ارشد وفا کے والد صاحب کے لیے دعائے مغفرت۔ جی آیاں نوں۔ سید شاہ عالم زمرد بہت افسوس ہوا۔ آپ کے اس نقصان کا پڑھ کر۔ فیصل ندیم بھٹی! خط کی پسندیدگی کا شکریہ۔ دیکھ لیں دوسرے ساتھی تو جھنگ سے ہوکر بھی واپس آ گئے ہیں اور میں اس بار بھی رہ گیا۔ تحسین جونیجو اتنا عرصہ کہاں غائب تھے آپ جناب؟ بتول خان نیازی ویلکم، چشم بددور، پری زاد جہاں! شازیہ گل! دیکھیں اگر ہم ایک دوسرے کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے تو پھر میرے خیال میں یہ محفل احوال تو فضول ہے۔ شعبان کھوسہ آپ کا جذبہ قابل تعریف ہے۔ حنا بشریٰ! واقعی دریا کو کوزے میں بند کر دیا آپ نے۔ ملک صفدر عباس اعوان! لگتا ہے کھانے پینے سے بلکہ صرف کھانے کھانے سے آپ کو خاصی رغبت ہے۔ سدرہ انور علی! جی وہ تو طنز تھا۔ (اور یہ بھی جھوٹ ہے۔ سمجھے ناں) مسز نوید ہاشمی! بہت شکریہ اچھی بہنا! خوش رہیں کاشی بھائی! آپ نے جس ایوارڈ کا اعلان کیا تھا وہ مجھے تو ابھی تک نہیں ملا؟ (اس پرچے کے ساتھ مل جائے گا) سب ہی نیو کمرز کو ویلکم، جی آیاں نوں۔ نمایاں شخصیات، سچے واقعات کے تحت احمد سجاد بابر اس مرتبہ نیلسن منڈیلا کے ساتھ حاضر تھے زبردست۔ قیامت سے پہلے قیامت، جس نے پھر ایک بار آنکھوں میں آنسو بھر دیے۔ کون مانے گا میری، ام ص ایمن۔ دنیا اک بگلا بھگت، فرض نبھاتا ہوں مجید احمد جائی اچھی تحریریں تھیں۔ کل کس نے دیکھا، عنبر معاویہ وٹو کی یہ تحریر ایک حساس لڑکی کی داستان تھی۔ عجب ملن یہ ہمارا ہوا، فیصل ندیم بھٹی کی تحریر انجام خوشگوار تھا، بہت اچھا لگا۔ زندگی صحرا نشیں ہو جیسے میں عبدالغفار عابد صاحب، شادی شدہ لڑکیوں کو سبق دیتے ہوئے نظر آئے۔ عورتوں کے لیے خصوصاً سبق آموز تحریر ہے۔ او یار ممتاز احمد! یہ کیا کر دیا' ملے کیوں جب بچھڑنا تھا' پڑھ کر یوں لگا گویا میرا ماضی سامنے آ گیا۔ سچ میں یہ تحریر مجھے تو بہت اداس کر گئی۔ پیر جی کے عنوان سے اقبال بانو اسی پیر جی داستان لائی تھیں، جن کا ذکر اپریل کے احوال میں، میں نے کیا ہے، چلیے اس قتل ہونے والے پیر کی حقیقت تو نکلی جو کہ انتہائی گندی اور مکروہ ہے، استغفار۔ ہائیڈ پارک تو میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ اب اجازت کہ بہت دیر ہو گئی ہے۔ بس یہ شعر سُن لیں

☆ پیارے منشی جی! ہم شعر قطعی نہیں سنیں گے بلکہ سب آپ کا شعر تیر نیم کش میں پڑھ لیں گے۔ شاندار تبصرے کے لیے ہم شکریہ بھی نہیں کہیں گے آپ کے لیے محنت کی، آپ کا فرض بنتا ہے کہ ہمیں سراہیں یا تنقید کریں۔ ہماری بھتیجیوں کو بہت پیار دیجیے گا۔

⊠ مسز نوید ہاشمی! نارتھ ناظم آباد کراچی سے شامل احوال ہیں کچھ اس طرح عرض کر رہی ہیں۔ دیر کرتے نہیں ہم ہو جاتی ہے ایک تو اپریل کا گرم مہینہ، گرم گرم غصہ، کہ سچی کہانیاں کو ہم سے جدا کرنا...... یہ ظلم ہے۔ ہم اس بات پر غصہ ہیں ناراض ہیں کہ ہمیں سچی کہانیاں سے جدا نہ کیا جائے۔ یہ ظلم کرنا چھوڑ دو یہ بچے کی فریاد ہے (یاد رہے اب ہم بچے نہیں رہے نہ ٹین ایجر بڑھاپے کی جانب قدم بڑھا دیا ہے اور بوڑھا بھی ایک بچہ ہوتا ہے) ہائے اپنے آپ کو بوڑھا کہنا کیسا لگ رہا ہے۔ نہیں نہیں ابھی میں بوڑھی نہیں ہوئی ابھی تو میرا بیٹا برہان ہاشمی 17 سال کا ہے ابھی پڑھ رہا

ہے، پھر بزنس، پھر شادی، اور پھر بچے ... پھر بچوں کی شادی، ہوں گی تب بوڑھی ہوں گی نا، ابھی
دلی دور ہے۔ کاشی چوہان کا زہر عشق پڑھا اس کی شکل میں بلا اہم لے اپنے بلے کو گھورنا شروع کر
دیا کہیں کاشی چوہان کے ناول ... نقل کر کہیں آ گیا ہو ... لے اپنی ڈائجسٹ اپنے بلے سے چھپا
کر رکھی ہے۔ زہر عشق کی شروعات بہت خوبصورت ... اس کہانی کو پڑھ لو۔ تالوت کی یاد تازہ کر دی
طالوت۔ ان کا چاند کے قیدی ... آرام ... پری کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ ناگن
اعجاز احمد نواب کی بہت شاندار شاہکار ناول تھی مجھے بے حد پسند آئی آپ کو اتنا اچھا ناول پیش
کرنے پر مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ مارچ میں دولت لے کے لیے شفقت کی، میٹھے پرندے، امر
پریم اور صدف آصف کی ہمنوا اچھی تحریریں تھیں صفدر علی حیدری نے بھی خوبصورت کہانی
پیش کی پازیب جھولا اور وہ میں منا بشریٰ، سکندر ... کی گرگا کی سادھی پسند آئی۔ محمد سلیم اختر وہ
سنہرے سانپ تینوں ہی ... کی تیز ناگ ... بے مثال تھیں جاوید راہی کی کہانی بھی اچھی
تھی۔ ممتاز احمد، اسماء اعوان کی خونی پارٹ فارم سہارا کا تحفہ بھی پسند آئی۔ اپریل میں منزہ سہام دہشت
گرد بہت خوبصورتی سے تشریح پیش کی مگر کاشی بھائی آپ کا اپنی باتیں کہاں غائب ہو گیا۔ اس کی کمی
ڈائجسٹ میں شدت سے محسوس ہوئی۔ ویسے ہی اتنا شاندار ڈائجسٹ پیش کرنے پر آپ کو مبارکباد
پیش کرتی ہوں۔ اس ڈائجسٹ میں آپ کی محنت اور لگن نظر آتی ہے۔ اپنے بھائی اور آپ کا بہت
دماغ کھا لیا اب آتی ہوں اپنے احوالی دوستوں کی جانب۔ میں شکر گزار ہوں اپنے دوستوں کی
آپ سب کے لیے محبت کے پھول چن چن کر ہم نے اپنے پاس محفوظ کر لیے ہیں۔ میں تیرا سایا ہوں
کہانی پسند کرنے پر آپ سب دوستوں کا شکر ادا کرنا چاہتی ہوں ہمارے کچھ پرانے ساتھی احوال
سے غائب ہیں اک میں، ایک میرے بھائی مور شاہد حسین، گڈی آپا، کاشف عبید، اسامہ ندیم عادل
میرے بھائی شادی کے بعد کیا اپنے احوال کو بھول گئے خیر ہماری دعا آپ کے ساتھ ہے سنبل تم
کہاں ہو؟ عبدالعزیز جی آنے غزل رائٹر بہت خوبصورت پیش کی ارے ارے یہ کون آ رہا ہے
کاشی کی قینچی چلی آ رہی ہے۔ بھاگوں کاٹ پیٹ سے بہتر ہے اجازت۔

☆ اچھی آپا! آپ کا تبصرہ ہمارا مان ہے۔ سلامت رہیے۔ آپ کو اس ماہ انتظار کی کوفت اٹھانا
پڑی۔ اس کے لیے معذرت، اس ماہ ہم نے یہ ازالہ کر دیا۔

✉ ایم یعقوب ڈیرہ غازی خان سے احوال میں رقم طراز ہیں۔ اپریل کا شمارہ بہت بھاگ دوڑ
کے بعد موصول ہوا۔ کاشی بھائی سب سے پہلے تو میری کہانی لگنے کی ہانڈی شائع کرنے پر شکریہ
قبول کریں۔ کہانی دوستوں کو کیسی لگی اس کے لیے مجھے مئی کے شمارے کا بے چینی سے انتظار ہے۔
اب کچھ بات ہو جائے اپریل کے شمارے کی ٹائٹل حسب روایت زبردست رہا۔ جگن کاظم آنکھوں
کے رستے دل میں اتر گئی۔ منزہ سہام جی کا اداریہ بڑا دہشت گرد کون اپنے اندر بہت سارے سوالات
لیے ہوئے تھا۔ کاشی بھائی آپ کی کچھ اپنی باتیں اس بار بھی نہیں تھیں۔ آخر کیوں؟ پلیز اپنی
مصروفیات میں سے وقت نکال کر اپنی باتیں ضرور لکھیں احوال میں آپ کا ہم سے مخاطب ہونے کا
انداز بہت مختلف اور دل موہ لینے والا ہے۔ احوال میں فیصل ندیم بھٹی، سلیمان سلیم، تحسین جونیجو، ارم
خان (ڈی جی خان)، پری زاد، شازیہ گل، عبدالغفار عابد، شعبان کھوسہ، حنا بشریٰ، سدرہ انور علی، مسز
نوید ہاشمی، صفدر عباس اعوان، منشی عزیز مے، کنول عمران خان، جگنو مٹیلو، یاسر وکی، مقصود احمد بلوچ،

عصمت آپا' مجید جانی' فرح انیس' منعم اصغر' حسنین کاظمی' نگہت آنٹی' ارم ناز (کراچی) اور احسان سحر کی آمد نے چار چاند لگا دیے۔ احمد سجاد بابر نے نیلسن منڈیلا کی کہانی کو کمال تحریر کر کے یادگار بنا دیا۔ سچ بیانیوں میں رضوانہ پرنس کی قیامت سے پہلے قیامت نے APS کے معصوموں کی شہادتوں کی یاد دلا کر پھر سے 16 دسمبر کی یادیں تازہ کر دیں۔ ہم مبشر سبحان' عبید ساجد' معاذ عرفان' میاں احمد اور کاشان ظہیر جیسے شیروں کو دیکھ کر بجا طور پر اپنی قوم کے جوانوں پر فخر کر سکتے ہیں۔ م۔ص ایمن کی کون مانے گا میری' اقراء سیف کی دنیا اک بگلا بھگت' مجید جانی کی فرض نبھاتا ہوں' عنبر معاویہ کی کل کس نے دیکھا' فیصل ندیم بھٹی کی عجب ملن یہ ہمارا ہوا' غفار عابد کی زندگی صحرا نشیں ہو جیسے' شاہد رفیق کی پردیس مت جیو' بہت زبردست سچ بیانیاں تھیں لیکن حمیرا راحت کی میں بانجھ ہوں اور اسماء اعوان کی میری دلہن تم ہو نے بازی اپنے ہاتھ رکھی۔ زبردست سچ بیانیاں دل کو چھو گئیں۔ ناگن ختم کر کے آپ نے ہم پر احسان کیا۔ ہم شکل اور زہر عشق میں اس وقت کانٹے کا مقابلہ چل رہا ہے۔ ایم اے راحت اور کاشی بھائی اپنے پڑھنے والوں کو اس وقت یادگار ناولز سے محظوظ کر رہے ہیں۔ اب کو باقی بچی کہانیاں انتظار رہنے لگا ہے۔ خدا کرے زور قلم اور زیادہ ہو۔ شعلہ ساماں تحریروں میں محمد علی روشن کی ڈھونڈوں کہاں امان' حمیرا خان کی سب کچھ مایا' اور نسیم سکینہ صدف کی انگھورا نفس مور ایڑھ کر مزہ آ گیا۔ محمود شام صاحب کا برطانیہ میں خزاں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ ہم بھی شام صاحب کے ساتھ ہیں برطانیہ کے مزے اڑا رہے ہیں۔ جاوید راہی کی جرم کہانی کوئی ملال نہیں اپنے اندر ایک پورا سبق رکھتی ہے۔ اس بار کمال کو ممتاز احمد نے کیا اور پلیٹ فارم سلسلے کی کہانی ملے کیوں جب بچھڑنا تھا جیسی لازوال تحریر پڑھنے کو دی۔ تین مرد تین کہانیاں میں آخر لیجنڈ رائٹر اقبال بانو کی پیر جی نمبر ون تھی۔ ڈاکٹر محمود الرحمن اور صائمہ نفیس کی کہانیاں بھی ٹھیک ہی تھیں۔ مگر ان میں پیر جی جیسی بات نہیں تھی۔ باقی نئے سلسلے ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش دلچسپ ہیں۔ اور سچی کہانیاں کا لازوال سلسلہ مسئلہ یہ ہے ہمارے لیے زاد راہ ہے۔ کاشی بھائی میں اپنا بھرپور تبصرہ روانہ کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ اسے قینچی سے دور رکھیں گے۔ سلامت رہیے۔

☆ بہت اچھے یعقوب! لو تمہارے تبصرے کو قینچی سے دور کر دیا۔ جس طرح تبصرہ تم نے زبردست کیا ہے امید ہے کہانی پر بھی اسی طرح محنت کر کے ہمارے لال چین کی انک کو ضائع ہونے سے بچانے کی بھرپور کوشش کرو گے۔

✉ عبدالغفار عابد چیچہ وطنی سے احوال میں شریک ہو رہے ہیں۔ لکھتے ہیں کاشی بھائی اس بار تبصرہ لکھنے میں بہت تاخیر ہو گئی۔ امید ہے میری تاخیر کو میری محبت یقیناً حاضری لگوانے کا سبب بنے گی۔ اس ماہ پرچہ بہت لیٹ ملا۔ اور میں خود پڑھتے پڑھتے لیٹ ہو گیا۔ اداریہ باجی منزہ کا کمال تھا۔ کاشی بھائی آپ نے اپنے خلاف لکھنے والوں کو معاف کر کے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا۔ بڑے لوگ، بڑے ظرف سے اپنا بڑا پن ثابت کرتے ہیں۔ احوال میں اپنے سارے پیارے ساتھی موجود تھے۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ کچھ ساتھی ہمارے مسلسل پکارنے کے باوجود بھی احوال سے دور کیوں ہیں۔ چلیے جی! وہ جہاں رہیں خوش رہیں۔ نیلسن منڈیلا ایک عالمگیر شخصیت تھے۔ احمد سجاد بابر نے ان پر لکھ کر گویا اپنے قلم کا حق ادا کر دیا ہے۔ واہ واہ کیا عمدہ تحریر لکھی۔ رضوانہ پرنس صاحبہ آپ نے پہلی چشم کشا سچ بیانی قلم کر کے قیامت ڈھا دی۔ APS میں ہونے والا حادثہ

وہ بلیک ڈے ہے۔ جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ کون مانے گا میری زبردست تحریر تھی۔ اقراء سیف نے بھی اس ظالم دنیا پر دنیا اک بگلا بھگت لکھ کر قلم کا حق ادا کیا۔ مجید احمد جائی، ایم یعقوب، معاویہ عنبر وٹو، فیصل ندیم بھٹی، شاہد رفیق سہو، بابر نایاب، حمیرا راحت اور اسماء اعوان نے ایک سے بڑھ کر ایک سچ بیانی تحریر کی۔ ایم اے راحت کی ہم شکل ساتویں قسط نے بھی زبردست رہی۔ محمد علی روشن نے ایک ایسی تحریر پیش کی جس نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ حمیرا خان اور نسیم سکینہ صدف نے بھی خوب شعلہ سامانی پیش کی۔ محمود شام صاحب پاکستان کی نامور شخصیت ہیں۔ آپ کے فن کو پاکستان اور پاکستان سے باہر بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ سچی کہانیاں میں آپ کا سفر نامہ اپنی مثال آپ ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم بھی برطانیہ کی سیر میں آپ کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ہر اس جگہ موجود ہیں جہاں جہاں آپ ہمیں لیے چلے جا رہے ہیں۔ اب کچھ بات ہو جائے زہر عشق کی۔ کاشی بھائی اتنا زبردست ناول ہے جس کی دوسری قسط نے اس کی کامیابی پر مہر لگا دی ہے۔ خدا آپ کو صحت وتندرستی دے اور نظر بد سے بچائے۔ جاوید راہی اس بار بھی جرم کا ایک نیا رنگ سامنے لائے جاوید راہی کی کوئی ملال نہیں زبردست ثابت ہوئی۔ ممتاز احمد نے اس بار کمال کر دیا۔ ملے کیوں جب بچھڑنا تھا۔ بہت زبردست تحریر ثابت ہوئی۔ تین مرد تین کہانیاں سچی کہانیاں کی جان ہے۔ اس بار پہلی مرد کہانی 'پیر جی' جسے اقبال بانو نے تحریر کیا۔ بے مثال تھی۔ گجرات کے انمول رتن کی کہانی محمود الرحمن نے بہت عمدگی سے بیان کی۔ صائمہ نفیس نے بھی کرچیاں خوب سمیٹیں۔ ناگن کا انجام زبردست رہا۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش بھی بہت خوب رہے۔ مسئلہ یہ ہے عوام کی فلاح کا باعث ہے۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔

☆ پیارے عبدالغفار عابد! بھئی تم نے اس بار اتنا خوبصورت تبصرہ کر کے ہمارا دل جیت لیا ہے۔ سلامت رہو۔

✉ کراچی سے یہ آمد ہے شاہانہ احمد خان کی۔ لکھتی ہیں۔ کاشی بھائی سچی کہانیاں میرا فیورٹ ڈائجسٹ ہے۔ سچی کہانیاں کی محبت اپنے والد سے مجھ میں منتقل ہوئی۔ میرے والد صاحب سچی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتے تھے۔ آج وہ اس دنیا میں نہیں لیکن ان کے سنبھالے ہوئے سچی کہانیاں ان کی یاد دلاتے ہیں۔ اور مجھے اکساتے ہیں کہ میں بھی ان کے بعد، ان کی محبت کو دوام بخشوں۔ اس سے پہلے ایک کہانی لکھ کر سچی کہانیاں کا بیسٹ رائٹر کا سرٹیفکیٹ حاصل کر چکی ہوں۔ اس بار اور پہلی بار خط لکھنے پر مجبور کرنے والی تحریر کاشی چوہان کا ناول زہر عشق ٹھہرا۔ کاشی صاحب! میں اکثر سوچتی ہوں، آپ کی شاگردی اختیار کر لی جائے۔ آپ ہر بار چونکنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ سچی کہانیاں کا رنگ روپ آپ کے آنے کے بعد ایک دم بدل گیا۔ پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک جب تک پڑھ نہ لیا جائے مزہ نہیں آتا۔ آپ کی کچھ اپنی باتیں ہوں۔ یا احوال میں قارئین سے مخاطب ہونے کا انداز۔ آپ کی کہانی ہو یا ناول۔ آپ ہر بار کمال کرتے ہیں۔ خوش رہیے۔ اور اسی طرح ہمیں چونکاتے رہیں۔

☆ اچھی شاہانہ! جو لوگ خود اچھے ہوتے ہیں انہیں سب اچھے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ کی تحریر اس قابل تھی کہ اسے بہترین قرار دیا جاتا۔ آپ کی محبت کا شکریہ۔ لیکن اگلے ماہ آپ کو سچی کہانیاں پر تبصرہ کرنا ہوگا۔ اور نئی تحریر ہمیں کب موصول ہو رہی ہے۔

✉ کراچی سے یہ آمد ہے اسامہ ندیم کی۔ لکھتے ہیں اپریل کا شمارہ بہترین ٹائٹل کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔ اس شمارے میں موجود کس کس کہانی کی تعریف کروں۔ ہر کہانی اپنی جگہ اپنی مثال آپ ہے۔ کہانیوں پر تبصرہ سے پہلے کاشی بھائی آپ کے ناول زہر عشق کے شروع ہونے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ زبردست ناول ہے۔ مجھے تو اب خاص طور پر سچی کہانیاں کا انتظار رہتا ہے۔

کب نیا پرچہ آئے اور کب زہر عشق کی نئی قسط پڑھی جائے۔ اس ماہ نیلسن منڈیلا کی زندگی پر جو کہانی شائع کی گئی۔ وہ واقعی بہت پسند آئی۔ سچ بیانیوں میں APS کے واقعے پر موجود کہانی قیامت سے پہلے قیامت نے اداس کردیا۔ جب کہ اس ماہ اسماء اعوان کی میری دلہن تم ہو سب سے شاندار سچ بیانی ثابت ہوئی۔ حمیرا راحت کی میں بانجھ ہوں بھی زبردست تھی۔ دنیا اک بگلا بھگت، پردیس مت جیو، ٹکے کی ہانڈی، کل کس نے دیکھا، زندگی صحرا نشین ہو جیسے، عجب ملن یہ ہمارا ہوا، فرض نبھاتا ہوں، اپنے منفرد ناموں کے ساتھ ساتھ منفرد ہی ثابت ہوئیں۔ ایم اے راحت صاحب کا ہم شکل بہت زبردست جا رہا ہے۔ محمود شام صاحب کا سفر نامہ اچھا ہے۔ اس کے علاوہ اس شمارے کی خاص کہانیاں اقبال بانو کی پیرجی، محمد علی روشن کی ڈھونڈوں کہاں امان، جاوید راہی کی کوئی ملال نہیں اور ممتاز احمد کی ملے کیوں جب بچھڑنا تھا ثابت ہوئیں۔ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں۔ انشاء اللہ اگر زندگی نے وفا کی تو اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔

☆ پیارے اسامہ! سب سے پہلے تو یہ بتاؤ اتنے ماہ کہاں غائب تھے۔ تبصرہ ہمیشہ کی طرح مختصر اور جامع ہے۔ ہمیں تو تمہاری تحریر کا انتظار ہے۔

✉ مناہل زہرہ کراچی سے احوال میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہی ہیں۔ لکھتی ہیں سب سے پہلے سچی کہانیاں کے تمام قارئین اور اسٹاف کو سلام۔ سچی کہانیاں میں نے پچھلے ماہ پہلی مرتبہ پڑھا ہے اور پڑھنے کے بعد مجھے اس ڈائجسٹ سے محبت ہوگئی ہے۔ منزہ سہام باجی نے اداریہ میں جو حقیقت بیان کی ہے اسے پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ اس کے بعد قارئین کے احوال کا سلسلہ بھی مجھے بہت پسند آیا کہ لوگ کتنی محبت کرتے ہیں سچی کہانیاں سے۔ میں نے تمام کہانیاں پڑھی ہیں۔ سب کہانیاں بہت ہی بہترین تھیں۔ رضوانہ پرنس کی قیامت سے پہلے قیامت پڑھنے کے بعد پھر سے وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آگئے جنہیں میں نے اس روز ٹی وی کی اسکرین پر دیکھا تھا۔ اور آج اس ڈائجسٹ میں پڑھ کر پھر سے آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ ایم اے راحت انکل کا سلسلہ ہم شکل آج میں نے پہلی مرتبہ پڑھا بہت دلچسپ لگا۔ کاشی بھائی! آپ کی زہر عشق ناول کی دوسری قسط پڑھی بہت زبردست تھی۔ انشاء اللہ میں اگلے ماہ سے مستقل رسالہ پڑھا کروں گی۔ کہانیوں میں کون مانے گا میری، دنیا اک بگلا بھگت، ٹکے کی ہانڈی، کل کس نے دیکھا اور ملے کیوں جب بچھڑنا تھا یہ تمام تحریریں بہت پسند آئیں۔ جاوید راہی انکل کی جرم کہانی بہت زبردست تھی۔ ویلڈن جاوید انکل۔ سلسلہ وار ناول میں ناگن کی آخری قسط بہت پسند آئی کہ دلاور کیسے شگفتا کی کہانی کو ختم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مسئلہ یہ ہے کا سلسلہ بھی بہت پسند آیا۔ کافی لوگ اس سے شفا پاتے اور دعائیں دیتے ہیں۔ خوش رہیے باباجی۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش کا سلسلہ بھی بہت اچھا ہے۔ کاشی بھائی! میں بھی اپنی ایک غزل ارسال کر رہی ہوں۔ پلیز حوصلہ افزائی کیجیے گا۔ پہلی بار لکھ رہی ہوں۔ انشاء اللہ اب سے ہر ماہ میں آپ کو خط اور ایک غزل بھیجا کروں گی۔ حوصلہ افزائی کیجیے گا۔

☆ پیاری مناہل! یہ احوال، اس کے احوالی اور ہمارا سچی کہانیاں سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ آج سے تم بھی ہماری سچی کہانیاں فیملی کا حصہ بن گئی ہو۔ غزل جلد شائع ہو جائے گی۔

✉ احوال یہ آمد ہے ہمارے بہت پیارے ساتھی احسن عمرانی کی ٹھٹھہ سندھ سے، لکھتے ہیں۔ کاشی بھائی سب سے پہلے تو میری کہانی کی اشاعت پر بہت بہت شکریہ۔ میں انتہائی معذرت خواہوں۔ جو وقت آپ کو شکریہ کا خط نہ لکھ سکا۔ بھائی میری ریڈی میڈ گارمنٹس کی دکان ہے۔ میری ڈیوٹی صبح 8 بجے سے شروع ہوتی ہے جو رات گئے تک جاری رہتی ہے۔ کاشی بھائی آپ تو جانتے ہیں کہ ہیں نا بہت بندہ مزدور کے اوقات...... بس بھیا آپ ہمارے حق میں دعا کریں کہ ہمارے دن بھی سکھ اور سکون کے آئیں۔ اور سچی کہانیاں ہر ماہ پڑھ کر آپ سے اور دیگر قاری اور لکھاری ساتھیوں سے ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔ پرچہ شاندار جا رہا ہے۔ ایم اے راحت صاحب کا ناول ہم شکل بہت زبردست ہے۔ کاشی بھائی آپ کا زہر عشق بھی ٹاپ پر جا رہا ہے۔ ناگن کا اختتام بہت پسند آیا۔ باقی تمام کہانیاں بھی بہت اچھی لگیں۔ اگلے ماہ انشاء اللہ آپ کو تفصیلی تبصرہ بھیجوں گا۔ اس خط کے ساتھ ایک کہانی بھی ارسال کر رہا ہوں امید ہے آپ کی توقعات پر پورا اترے گی۔

☆ پیارے احسن! اتنی مصروفیات کے باوجود ہم تمہاری سچی کہانیاں سے محبت کی قدر کرتے ہیں۔ یاد رکھو کامیابی ہمیشہ انہی لوگوں کے قدم چومتی ہے۔ جو زندگی کو جہد مسلسل کے طور پر گزارتے ہیں۔ کہانی کے بارے میں رائے انہی صفحات پر دے دی جائے گی۔

✉ احوال میں یہ آمد ہے ہماری ہر دلعزیز لکھاری، قاری، اور شاعرہ رضوانہ کوثر صاحبہ! لکھتی ہیں! پیارے کاشی سلامت رہو۔ اپریل کا شمارہ جس وقت پوسٹ مین کے ذریعے مجھ تک پہنچا۔ تو خوشی دو چند ہو گئی۔ جب لفافے سے سچی کہانیاں برآمد ہوا تو ایسا لگا جیسے ہر طرف بہار نے اپنے رنگ بکھیر دیے ہوں اور سرسوں کی زردی اپنے جوبن پر ہو۔ گیندے کے پھول اپنے اندر عجب حسن رکھتے ہیں۔ اور اس زرد رنگ میں ایک اسرار پنہاں ہے۔ منزہ کا اداریہ بڑا دہشت گرد کون، سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ احوال میں احوالی

اپنے اپنے رنگ میں رنگے ایک الگ دنیا بسائے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی دل میں خیال آتا ہے کہ یہ پڑھنے اور لکھنے والوں کی دنیا کتنی معصوم ہوتی ہے۔ ہمارے جذبے احساسات کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ ہم کاغذ کے ان صفحات پر جیتے اور مرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ ایسا پیار، ایسی محبت جوریا کاری اور کسی بھی ہوس سے پاک ہوتی ہے۔ ارے یہ میں بات کو کہاں سے کہاں لے گئی۔ احمد سجاد بابر کی نیلسن بتی کمال ثابت ہوئی۔ رضوانہ پرنس نے قیامت سے پہلے قیامت میں قیامت ڈھادی۔ اقراء سیف، حمیرا راحت، اسماء اعوان، عبدالغفار عابد، معاویہ عنبر ونو اور مجید احمد جائی کی سچ بیانیاں ناقابل فراموش ٹھہریں۔ شعلہ ساماں تحریروں میں محمد علی روشن کی تحریر نمبرون رہی۔ محمود شام کا سفر نامہ برطانیہ میں خزاں تحریر کی پختگی میں چھپا حسن عیاں کرتا ہے۔ تین مرد تین کہانیاں کا سلسلہ زبردست ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کہانی پاکستان کی نمبرون رائٹر اقبال بانو کے قلم کا شاہکار ہے۔ اس لیے پیرجی کی تعریف میں میرے پاس الفاظ نہیں۔ اقبال بانو خدا آپ کو سلامت رکھے۔ اور آپ ہمیں اسی طرح اپنی تحریروں سے سرفراز کرتی رہیں۔ مسئلہ یہ ہے ایک ایسا سلسلہ ہے جس کے ذریعے لاکھوں لوگوں کا گھر بیٹھے بھلا ہو رہا ہے۔ اچھا کاشی بیٹا! اپنا بہت خیال رکھنا۔ منزہ اور رضوانہ کو ہمارا اسلام کہنا۔ اور ادارے میں سب کو میری طرف سے دعائیں۔

☆ عزیز از جان رضوانہ آپی! محفل اختتام کو تھی کہ آپ کا تبصرہ موصول ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے بہار آگئی۔ اپنی طبیعت کا بہت خیال رکھیے گا۔ آپ کا تبصرہ ہمارے لیے سوغات سے کم نہیں۔

انتظار اور ہجر
وصال کے رتھ پہ سوار......
کل شب چاند گلی پہ......
خوب یکطرفہ تماشا کیے
چاندنی جھانکتے
سب نے پہنے تھے آئینے
اور سب چل رہے تھے
ہوا کے ٹھڈوں سے اوندھے منہ لڑھکتے
لیکن!
کسی کو بھی اس کھیل میں
سحر کی آرزو ہی نہ تھی۔
ساتھیو!

اپنی تازہ نظم تو ہم نے آپ کے روبرو پیش کردی۔ ہمیں سحر کی بھی آرزو ہے اور ہم چاند کے تمنائی بھی ہیں۔ آپ سے وقت رخصت بس یہ کہنا ہے کسی کی بات سن کر درگزر کر دینا بہت بڑا جہاد ہے۔ کیا آپ مجاہد بننا نہیں چاہتے۔ مجھے امید ہے میری اس چھوٹی سی بات کا ساری عمر خیال رکھیں گے۔ اجازت دیجیے۔

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

نمایاں شخصیات، سچے واقعات

مونیکا لیونسکی... شاطر یا معصوم

احمد سجاد بابر

عالمی شہرت یافتہ، اُس فتنہ پرور کی زندگی کا فسانہ، جس نے امریکی صدر کلنٹن کو دن میں تارے دکھا دیے تھے

دنیا کا قدیم ترین پیشہ جسم فروشی ہے۔ یہ اس وقت بھی موجود تھا جب انسان جنگل اور غاروں کا باسی تھا، اور یہ آج بھی عروج پر ہے جب انسان سیاروں پر کمند ڈال رہا ہے اور مظاہر فطرت پر قابو پا چکا ہے۔ کہیں پر یہ کام آتشِ شکم کے لیے کیا گیا تو کہیں پر کسی اور ضرورت اور غرض کے تحت۔ کہیں یہ پسِ دیوار کیا جاتا ہے تو کہیں سرِ محفل، کہیں اس میں غریب ملوث ہے تو کہیں متمول طبقہ۔ آج جب کہ سائنسی ترقی کا غلبہ ہے، یہ ازلی ضرورت پہلے سے زیادہ فروغ پا چکی ہے۔ عوام کا تو ذکر ہی کیا، خواص بھی اس حمام میں ننگے ہیں۔

آج ایک ایسے ہی سکینڈل کا تذکرہ ہے جو امریکا کے وائٹ ہاؤس کی راہداریوں میں کھیلا گیا اور دنیا بھر میں بھونچال پیدا کر گیا۔ ایک عام سی لڑکی جو وائٹ ہاؤس میں پہلے بطور ٹرینی داخل ہوئی اور پھر مستقل نوکری پر رکھ لی گئی، جس نے جانے کس لمحہ امریکا کی خاتونِ اول بننے کا خواب دیکھا اور پھر اس کی تعبیر پانے کے لیے کوشاں ہو گئی۔

جی ہاں وہ بائیس سالہ مونیکا تھی، اور یہ واقعہ ہے 90 کی دہائی کا...... پھر دنیا بھر کے میڈیا نے یہ الفاظ بھی سنے!!

"میں حلفاً بیان کرتا ہوں کہ میں نے اس عورت کے ساتھ جنسی تعلق قائم نہیں کیا۔ میں نے کبھی کسی کو جھوٹ کے لیے نہیں کہا، کبھی نہیں۔ یہ میرے خلاف جھوٹا الزام ہے، جس کا مقصد میری ساکھ کو نقصان پہنچانا ہے۔"

پوری دنیا کے میڈیا پر یہ منظر دکھایا جا رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہویدا تھے۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایک گہری دلدل میں پھنس جائے گا۔ دنیا کا سب سے بااختیار انسان کہ جس کے ایک اشارے پر حکومتیں اِدھر سے اُدھر ہو جاتی تھیں، آج بے بسی سے ہاتھ مل رہا تھا۔ دنیا بھر کا میڈیا اس پر فوکس تھا۔ امریکا کے گلی کوچوں میں وہ زیرِ بحث تھا۔ کانگریس میں اس کا مواخذہ ہونے جا رہا تھا۔ گھریلو زندگی کے تنکے ہوا کی زد پہ تھے۔

کیوں، کیسے، کب کے الفاظ اس کے اندر بگولوں کی طرح اٹھ رہے تھے۔

☆......☆......☆

امریکہ کے 42ویں صدر کے طور پر بل کلنٹن کا شمار جدید امریکہ کے مقبول ترین صدور میں ہوتا ہے اور ان کے دور میں امریکہ میں آنے والی معاشی خوش حالی کے ڈیموکریٹ اور ری پبلکن دونوں ہی یکساں معترف

ہیں۔ کلنٹن 1993 سے 2001 تک امریکہ کے صدر رہے۔ جنہوں نے امریکی صدر جارج بش کے والد ہربرٹ بش کو شکست دی، جب 1991 میں الیکشن تھا ۔اس سے پہلے وہ آرکنساس کے گورنر رہے۔ بل کلنٹن 19 اگست 1946 میں پیدا ہوئے۔ کلنٹن نے بوسنیا کی مدد بھی کی تھی جب سربیا نے قبضہ کیا اور سربیا کی آرمی مسلمانوں کو ختم کر رہی تھی اور انہوں نے بوسنیا کو سربیا سے بچایا۔ ان کی بیوی اور انہوں نے وائٹ ہاؤس میں پہلی بار عید منائی اور قرآن بھی تحفے میں ملے۔ جنوری 2001 میں صدر بش نے کلنٹن کو الیکشن میں شکست دی اور بش امریکہ کے صدر منتخب ہوئے۔

دوسرے دور میں وائٹ ہاؤس میں ایک انٹرن (زیر تربیت) کے طور پر داخل ہوئی تھیں۔ پھر ان دونوں کے درمیان راہ و رسم بڑھے، تنہائی میں ملاقاتیں ہوئیں اور دونوں کے تعلقات کا ناخوشگوار بلکہ بھیانک انجام ہوا اور اس سے انھیں اپنی زندگی کا رُخ ہی تبدیل کرنا پڑ گیا تھا۔

جانے وہ کون سا لمحہ تھا جب کلنٹن مونیکا کے تیر نظر کا شکار ہوا، یا پھر ناقدین کے مطابق مونیکا نے ایک منصوبہ بندی کے تحت اسے متوجہ کیا، وجہ جو بھی رہی ہو۔ وہ ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔

ان کی خفیہ ملاقاتیں شروع ہوگئیں، مونیکا نے۔ اس راز میں اس نے اپنی دوست لنڈا ٹرپ کو بھی شریک

محبت کی بساط پر ڈھے جانے والے مہرے بل کلنٹن اور مونیکا لیونسکی (ایسی محبت سے ہم باز آئے)

یہ ایک داستان ہے عشق کی جو 22 سالہ مونیکا جو وائٹ ہاؤس میں انٹرن شپ پر آئی تھی اور 49 سالہ امریکی صدر، بل کلنٹن کے درمیان، یہ 1998 میں منظر عام پر آیا تھا۔ لیوس اینڈ کلارک کالج کی گراجویٹ مونیکا نے 1995 میں وائٹ ہاؤس میں انٹرن شپ شروع کی۔ جلد ہی کلنٹن سے اس کے ذاتی تعلقات شروع ہوگئے۔ یہ بطور صدر کلنٹن کا پہلا دور تھا۔ مونیکا 23 جولائی 1973 کو سان فرانسسکو ہاسپٹل میں پیدا ہوئیں۔ بڑی بڑی پلکوں والی مونیکا کے والد ایک ڈاکٹر تھے۔ اس تمام معاملے میں مونیکا کو دو طرح دیکھا گیا، اکثریت نے اسے دھوکے باز کے طور پر لیا، جس نے کلنٹن کو ٹریپ کیا اور اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ وہ امریکا کے سابق ڈیموکریٹ صدر بل کلنٹن کے

کرلیا، جس نے ان کی گفتگو کی ریکارڈنگ کی۔ بعد میں لنڈا ہی نے اس ریکارڈنگ کو اوپن کیا۔

مونیکا نے دعویٰ کیا کہ کلنٹن کے ساتھ نو ملاقاتیں ایسی رہیں جن میں وہ جسمانی قربت کی تمام حدود پھلانگ گئے۔ یہ ملاقاتیں 1995 سے 1997 کے دوران ہوئیں۔ مونیکا کی ہمراز لنڈا ہی نے مونیکا کو سمجھایا کہ وہ اس نیلے لباس کو سنبھال کر رکھے اور ڈرائی کلین نہ کرائے جس پر کچھ ایسے دھبے اور مواد لگا ہوا تھا، جو کلنٹن کو شکنجے میں لا سکتا تھا۔ اس سکینڈل کا راز سب سے پہلے 17 جنوری 1998 کو افشا ہوا، جلد ہی یہ کہانی بڑے اخبارات میں شائع ہوگئی۔ کلنٹن مسلسل انکار کرتا رہا۔

☆......☆......☆

بل کلنٹن بھی کوئی دودھ کے دھلے نہ تھے، لیکن اس

معاشرے کے معیارِ شرافت کچھ اور تھے، پورا مغرب مونیکا کو لعن طعن کر رہا تھا۔ امریکہ کے دل پھینک صدر کلنٹن مونیکا لیونسکی سے قبل پاؤلا جانز کی زلفوں کے اسیر رہے۔ یہ چکر بل کلنٹن کو اتنا مہنگا پڑ گیا کہ اس کی ساری عزت مٹی میں مل گئی۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ نہ صرف اس کی عزت خراب ہوئی بلکہ پوری امریکی قوم نے شرمساری محسوس کی۔ کیوں کہ وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ جس شخص کو وہ اپنا صدر منتخب کر رہے ہیں وہ ایوانِ صدر میں ایسی حرکت کر سکتا ہے۔ اس میں کوئی کہ وہ ایک غیر اخلاقی عمل کا حصہ بن رہے ہیں اور وہ بنے!

اگر مونیکا اور بل کلنٹن کے کیس میں دیکھا جائے تو کلنٹن ہر طرح سے اپنا نقصان کر بیٹھا اور جہاں تک مونیکا کا سوال ہے تو وہ لڑکی جو وائٹ ہاؤس میں انٹرن تھی، اس نے صدر کلنٹن کے ساتھ اپنے مذکورہ معاشقے سے اتنا فائدہ اٹھایا کہ وہ امریکہ کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ وہ اب تو یہ کہتی ہے کہ جو کچھ بھی ہوا اسے اس پر بڑی حد افسوس ہے مگر اس رشتے کی بنیاد پر اس نے

مونیکا لیونسکی سابق صدر کلنٹن کے ساتھ، اُن خفیہ لمحات میں جو بعد میں طشت ازبام ہو گئے

شک نہیں بل کلنٹن نے جو کچھ کیا وہ ناقابلِ معافی تھا اور ہے۔ مگر اس سکینڈل کو جس طرح مونیکا نے کیش کروایا اور جس طرح اس نے اس معاملے کے سارے شواہد اپنے پاس محفوظ کر رکھے تھے، اس سے بھی اور اس کے ساتھ ساتھ مونیکا کے انٹرویوز سے بھی صاف پتا چل رہا تھا کہ بل کلنٹن نے اس کے ساتھ ناجائز رشتہ قائم کر کے اپنی حیثیت اور قوم کے اعتماد کے ساتھ زیادتی کی مگر اس معاملے میں مونیکا بھی معصوم نہ تھی۔ کیوں کہ اس نے جس طرح کلنٹن کا حوصلہ بڑھایا اور جس طرح اس نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ صدر ایک بچے کی طرح تھا۔'' اس سے صاف پتا چل رہا تھا کہ صرف کلنٹن نے مونیکا کو نہیں پھنسایا بلکہ مونیکا نے بھی کلنٹن کو اپنے قریب لانے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس وقت مونیکا کی عمر بائیس برس تھی اور کلنٹن پچاس برس کا تھا۔ وہ دونوں بالغ تھے اور دونوں کو معلوم تھا بہت ساری شہرت اور دولت حاصل کی۔ مونیکا کی صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے ہمیں یہ بات بھی سمجھنا ہوگی کہ مونیکا مشرقی معاشرے کی لڑکی نہیں تھی جس کی ایسے واقعے کی وجہ سے عزت مٹی میں مل جائے۔ ایسا نہیں تھا۔ وہ مغربی اور مغرب کے سب سے ترقی یافتہ ملک امریکہ کی شہری تھی اور اس کو اپنا ملک اور معاشرہ اس بات کا حق دے رہا تھا کہ وہ نہ صرف صدر کلنٹن اور اپنے درمیان ہونے والے معاملے کی باریک جزئیات بیان کرے بلکہ یہ بھی کہے کہ

''جب میں بائیس برس کی تھی تب میں اپنے باس پر مرمٹی۔''

وہ اپنی صلاحیتوں سے واقف تھی۔ اس لیے ایسا کچھ کرنا چاہتی تھی جس کو بنیاد بنا کر وہ ساری زندگی فائدے حاصل کر سکے۔ اور ہم اس بات سے آگاہ ہیں کہ اس دنیا میں انسان کو فائدہ صرف اور صرف شہرت سے حاصل ہوتا

ہے اور جہاں غیر قانونی رشتہ جرم نہ ہو وہاں پر اس قسم کی شہرت بھی انسان کے لیے فائدے کا دروازہ بن جاتی ہے اور وہ فائدے کی وجہ بنی۔ اس نے کلنٹن کے ساتھ ہونے والے افیئر کو بنیاد بنا کر جتنے انٹرویوز دیے اور اس سے جتنی دولت اس کے ہاتھ لگی وہ بھی بہت ہے ایسی لڑکی کے لیے جس نے دل سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ صدر کی حیثیت کو دیکھ کر اس سے رشتہ قائم کیا تھا۔

مونیکا لیونسکی ایک بائیس سالہ یہودی النسل خاتون تھی۔ خوبصورت اور باصلاحیت تھی اسی وجہ سے وہ امریکی صدر کے آفس میں جاب کر رہی تھی۔ امریکی صدر سے مراسم رکھنا اس کا ایک خواب رہا ہوگا کیونکہ اس کی اپنی دلچسپی اور کوشش کے بغیر بل کلنٹن اس کی طرف پیش قدمی نہیں کر سکتا تھا بلکہ بل کلنٹن سے جب ان مراسم کے بارے میں دریافت کیا گیا تو اس نے انکار کر دیا تھا۔ امریکہ ایک بہت ہی آزاد معاشرہ ہے۔ وہاں اس قسم کے مراسم بہت ہی معمولی بات ہے تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ کوئی شخص کسی خاتون سے زبردستی کرے، خاص کر امریکی صدر! دراصل ان مراسم کے پیچھے مونیکا لیونسکی کا ذہن کام کر رہا تھا کیونکہ تعلقات بنانے کے بعد اس راز کو طشت از بام کرنے کے پیچھے بھی مونیکا خود ہی تھی کیونکہ اس نے ان مراسم کے بارے میں اپنی ایک سہیلی سے ذکر کرنے کا اعتراف کر لیا تھا بعد میں ریکارڈنگز اور گاؤن پر نشان جیسے ثبوت بھی فراہم ہو گئے اسی لیے امریکی عوام مونیکا کو ناپسند کرتے ہیں شاید مونیکا کی یہ خواہش بھی رہی ہو کہ امریکی صدر اس کو خاتون اول بنا دے جس کے پورا نہ ہونے کی صورت میں اس نے یہ راز طشت از بام کر دیا یا پھر ایک غیر معروف زندگی سے نکل کر ایک پاپولر فگر بننے کے چکر میں یہ راز کھول دیا ہو۔

اس تمام معاملے میں ہیلری کلنٹن اپنے شوہر کے شانہ بشانہ کھڑی رہیں اور اس الزام کو جھٹلاتی رہیں۔ اگلے کئی ماہ تک میڈیا اسی بات پر ڈسکس کرتا رہا کہ آیا کہ کلنٹن نے جھوٹ بولا ہے یا سچ۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ مونیکا نے وہ نیلا لباس میڈیا کو پیش کر دیا جو اس کے کلنٹن سے جسمانی تعلقات کا سب سے بڑا ثبوت تھا۔ 17 اگست 1998 کو کلنٹن نے مونیکا کے ساتھ اپنے جسمانی تعلق کا اعتراف کر لیا۔ اسے عدالت میں جھوٹا بیان دینے پر بھاری جرمانہ کر دیا گیا۔ اس تمام عرصے میں کلنٹن کے حامی اسے کلنٹن کا ذاتی معاملہ کہتے رہے۔

مونیکا کے ساتھ معاشقے کے نتیجے میں صدر کلنٹن کو 1999ء میں ایوان نمائندگان میں مواخذے کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن سینیٹ نے انھیں بری قرار دے دیا تھا اور یوں وہ اپنی مدت صدارت پوری کرنے میں کامیاب رہے۔

بعد میں مونیکا نے یہ بھی کہا کہ

''اس کے (صدر کے) طاقتور عہدے کو بچانے کے لیے مجھے قربانی کی بکری بنا دیا گیا۔ اس کے بعد ہی سب کچھ غلط ہوا''

اس کے بیان کے مطابق ''میرے اور صدر بل کلنٹن کے درمیان جو کچھ ہوا، مجھے اس پر سخت افسوس ہے۔ مجھے یہ دوبارہ کہنے دیجیے۔ جو کچھ ہوا، مجھے اس پر گہرا افسوس اور ندامت ہے''

لیکن یہ سب بعد کی باتیں تھیں، اس نے ایک کھیل کھیلا اور شاید وہ سب تو حاصل نہ کر سکی جو اس نے چاہا اور سوچا تھا مگر پھر بھی بہت کچھ حاصل کر گئی۔ اس نے ایک موقع پر بل کلنٹن کے ساتھ تعلقات کو اپنی مرضی کے خلاف بتاتے ہوئے کہا ہے کہ صدر نے میرا فائدہ اٹھایا۔ پھر قلابازی کھاتے ہوئے اس نے بیان بدلا کہ وہ بل کلنٹن کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی اور سکینڈل کے منظر عام پر آنے کے بعد وہ ٹوٹنے کے قریب تھیں۔ اس نے ایک موقع پر کہا کہ اسے تو ایک کروڑ ڈالرز کی پیش کش بھی کی گئی تھی لیکن انھوں نے اتنی بڑی رقم کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس نے مزید اضافہ کیا کہ تحقیقات کے دوران متعدد مرتبہ اور اس کے بعد دو ایک مرتبہ خودکشی کی بھی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کا فعل اس کے الفاظ کا گواہ نہ تھا۔

مونیکا نے یہ موقف اختیار کیا کہ کلنٹن انتظامیہ، خاص کر استغاثہ کے پیچھے، حکمران اور اپوزیشن کے سیاسی کارکن اور میڈیا میری ایک شبیہہ بنانے میں کامیاب ہوئے اور وہی شبیہہ چلتی رہی کیونکہ اس پر اقتدار کی

طاقتوں کا رنگ چڑھا دیا گیا تھا۔"

مونیکا نے اعتراف کیا کہ 1995ء میں ہمارے

مونیکا تسلیم کرتی ہیں کہ ان کے ماضی کی وجہ سے انھیں امریکہ میں ملازمت ملنے میں بہت مشکلات پیش

مونیکا لیونسکی جس نے ساری دنیا کے سامنے سابق صدر کلنٹن کے ساتھ اپنے تعلقات کا اعتراف کرتے ہوئے ہیلری کلنٹن اور کلنٹن کے درمیان خلیج ڈالنے کی بھرپور کوشش کی مگر وہ آج بھی ساتھ ہیں

تعلقات شروع ہوئے اور اتار چڑھاؤ کے ساتھ 2 سال تک جاری رہے۔ جب ان کا معاشقہ سامنے آیا تو ان کا خراب وقت شروع ہو گیا۔ وہ پورا دن کمپیوٹر اسکرین کو گھورتے ہوئے چلاتی رہیں، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ سب کچھ ہوگا، ان کے ذہن میں یہی مسئلہ تھا اور وہ مرنا چاہتی تھیں۔"

مونیکا لیونسکی اس اسکینڈل کے بعد منظر سے بالکل غائب ہو گئی تھیں۔ بعد میں انھوں نے لندن اسکول آف اکنامکس سے سماجی نفسیات (سوشل سائیکالوجی) میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ مگر اس واقعے کے بعد مونیکا لیونسکی کو کافی مشکلات سے گزرنا پڑا۔ صدر کلنٹن کی انتظامیہ کی ملازمت چھوڑنے کے بعد مونیکا نے کچھ دنوں تک ہینڈ بیگ ڈیزائنر کے طور پر کام کیا۔ پھر انھوں نے ایک رائلٹی ڈیٹنگ شو کی میزبان کے طور پر بھی کام کیا۔ اس کے بعد وہ گریجویشن کرنے لندن چلی گئیں۔

آئیں۔ مونیکا کو اس بات پر بھی افسوس تھا کہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر انہیں ایک آبرو باختہ عورت کے طور پر پیش کیا گیا، اس کی تذلیل کی گئی اور اسے تحقیر کی نظروں سے دیکھا گیا۔

بہرحال اپنی مرضی سے مراسم بنانے والی مونیکا نے پورے کا پورا مدعا امریکی صدر پر ڈال دیا اور خود معصوم بن گئی لیکن امریکی عوام نے اس کے اس سٹانس کو قبول نہیں کیا کیونکہ انہوں نے اس کی چالاکی اور عیاری کو جانچ لیا تھا اسی لیے وہ ان کے درمیان عزت پانے میں ناکام رہی!!

☆......☆......☆

ریپبلکن پارٹی نے بل کلنٹن پر مونیکا لیونسکی کے ساتھ جنسی تعلقات کے حوالے سے وفاقی تفتیش کاروں سے جھوٹ بولنے کا الزام لگایا تھا۔ اسی الزام میں ریپبلکن پارٹی نے کلنٹن کے خلاف مواخذہ بھی شروع کیا لیکن وہ

ناکام رہے۔ بل کلنٹن نے اپنے عہدہ صدارت کی مدت مکمل کی اور وہ سنہ 2000 تک امریکہ کے صدر رہے۔ انہوں نے صدارت چھوڑنے کے بعد مونیکا لیونسکی سے اپنے تعلقات کو ایک خوفناک اخلاقی غلطی قرار دیا تھا۔ مخالفین نے کلنٹن واقعے پر رائے زنی کی کہ باس کو اپنے دفتر کی نوجوان ملازماؤں کا استحصال نہیں کرنا چاہیے۔"

انھوں نے مزید کہا کہ "بل کلنٹن نے اپنے دفتر میں کام کرنے والی ایک 22 سالہ انٹرن سے فائدہ اٹھایا۔ اس پر کوئی بہانے بازی نہیں چلے گی، یہ جارحانہ طرز عمل ہے۔"

ہلیری کلنٹن نے مونیکا لیونسکی کے معاملے میں اپنے شوہر بل کلنٹن کو معاف کیوں کیا؟ ہلیری کلنٹن کا کہنا تھا کہ مونیکا ایک خود پرست خاتون ہے لیکن ان کے شوہر کے ساتھ اس کے تعلقات میں ان کی غلطیوں کا بھی دخل ہے۔ اخبار کے مطابق انھوں نے اعتراف کیا کہ اب وہ زیادہ سمارٹ نہیں رہیں، اس نے اپنے شوہر کی ضروریات پر زیادہ توجہ نہیں دی جس کی وجہ سے ان کے شوہر بہک گئے۔ ان کی دوست مس بلیر نے ایک فون کال کی تفصیلات لکھی ہیں جو اسی سال 9 ستمبر کو ہلیری کلنٹن نے انھیں کیا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ہلیری بل کلنٹن کو الزام نہیں دینا چاہتیں کیونکہ یہ ایک بڑی ذاتی غلطی تھی، اور وہ اس کی ذمہ داری قبول کر رہی ہیں۔

سابق امریکی صدر بل کلنٹن جہاں اپنے دور صدارت میں مونیکا لیونسکی کی وجہ سے میڈیا کی تنقید کا نشانہ بنے تو دوسری طرف انہیں اپنی بیوی ہیلری کلنٹن سے پٹائی کا خطرہ بھی لاحق رہتا تھا۔ ہیلری کی سوانح حیات "ہیلیریز چوائس" لکھنے والی امریکی صحافی اور مصنفہ گیل شے نے دعویٰ کیا تھا کہ ہیلری کلنٹن اپنے عاشق مزاج شوہر کی "باقاعدگی" سے پٹائی کرتی رہتی تھیں۔ کبھی وہ کلنٹن پر کتابیں تو کبھی ایش ٹرے مار دیتی تھیں۔ 1993 میں ہیلری نے ناخنوں سے بل کلنٹن کا چہرہ نوچ لیا تھا، اور کلنٹن کے چہرے پر ناخنوں کے نشانات رہ گئے تھے۔ گیل کے مطابق اس وقت وائٹ ہاؤس کی ترجمان دی دی میئرز نے گلوکارہ باربرا اسٹرسینڈ کے وائٹ ہاؤس کے دورے کو کلنٹن پر حملے کی وجہ بتایا تھا۔ تاہم سرکاری سطح پر کلنٹن کے جبڑوں پر نظر آنے والی خراشوں کو "شیونگ ایکسیڈنٹ" بتایا گیا تھا۔ جب کہ مونیکا لیونسکی کا معاشقہ منظر عام پر آنے کے بعد بھی ہیلری نے "سپر پاور" ملک کے "مظلوم" صدر بل کلنٹن کی پٹائی کی تھی۔

اسرائیل، روس اور برطانیہ کے خفیہ اداروں نے سابق امریکی صدر بل کلنٹن کی مونیکا لیونسکی کے ساتھ فون پر ہونے والی گفتگو ریکارڈ کی تھی۔ اسرائیلی وزیراعظم نے اس گفتگو کو بل کلنٹن کو بلیک میل کرنے کی لیے استعمال کیا تھا۔ اس بات کا انکشاف برطانوی مصنف ڈینیئل ہالپر نے اپنی کتاب "کلنٹن ان کارپوریشن" میں کیا ہے۔ برطانوی اخبار کی رپورٹ کے مطابق سابق امریکی صدر بل کلنٹن کو علم ہوگیا تھا کہ ان کی گفتگو ریکارڈ کی گئی ہے اور انہوں نے مونیکا کو ہدایت کی تھی کہ اس بارے میں کوئی پوچھے تو وہ جواب دیں کہ یہ سب مذاق تھا، انہوں نے برطانوی خفیہ اداروں کی جانب سے گفتگو کی ریکارڈنگ پر سخت تشویش کا اظہار کیا تھا۔ مصنف ہالپر کے مطابق اسرائیلی وزیراعظم بینجمن نیتن یاہو نے مذکورہ گفتگو کو امریکہ میں قید اسرائیلی جاسوس جوناتھن پولارڈ کی رہائی کی لیے بل کلنٹن کو بلیک میل کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔

☆☆......☆☆......☆☆

ایک وقت آیا جب کلنٹن کو وائٹ ہاؤس سے رخصت ہونا پڑا، صدارت چھوڑنے کے بعد بل کلنٹن مقروض ہوگیا تھا، بیٹی کی فیس کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں تھے، مکان کی قسطیں دینے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ مونیکا لیونسکی سکینڈل میں بھی وکیل کی فیسیں بجائے سرکاری خزانے کے اپنی جیب سے ادا کیں۔ زندگی ایک نئے ڈھب سے چل پڑی، 2016 میں ہیلری کلنٹن امریکی صدارت کا الیکشن لڑ رہی ہے اور مونیکا دوبارہ Twitter پر آچکی ہے، ہیلری پریشان ہے، دیکھتے ہیں کہ آنے والا وقت کیا پیغام لے کر آتا ہے!!

☆☆......☆☆......☆☆

اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے موصولہ، وہ سچ بیانیاں
جن کو پڑھ کر، اپنی مٹی کی خوش بو، آس پاس محسوس ہوتی ہے

محمد سلیم اختر

راولپنڈی سے، اُس نوجوان کی عجب داستان جسے ادھورے لوگوں سے نفرت تھی

انور علی کاروباری شخصیت تھے۔ انڈسٹریل ایریا میں ان کی بسکٹ بنانے کی فیکٹری تھی۔ ان کا تعلق ایک گاؤں سے تھا۔ شہر میں رہتے ہوئے اُن کو کئی برس بیت گئے تھے۔ مگر وہ پھر بھی اپنے گاؤں اور گاؤں والوں کو نہیں بھولے تھے۔ ہر دو ماہ بعد وہ گاؤں کا ایک پھیرا ضرور لگاتے تھے۔ گاؤں کے غریب لوگوں کی مدد کرتے۔ اور کئی ایک کو اپنی فیکٹری میں کام بھی دے رکھا تھا۔ میٹرک فیل اور کئی اَن پڑھ ان کی فیکٹری میں ملازم تھے۔ فیکٹری اور کوٹھی کے ملازم اور چوکیدار بھی ان کے گاؤں کے ہی تھے۔ وہ ان سب کی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا کاروبار خوب پھل پھول رہا تھا۔ تمام ملازم ان سے خوش تھے۔ اور دل لگا کر کام کرتے تھے۔

ارشاد عرف شادا اُن کے گاؤں کا مسلّی تھا۔ بہت ہی تیز طرار تھا۔ اسے کتے پالنے اور ان کی آپس میں لڑائی کرانے کا بہت شوق تھا۔ کتوں کی خریداری اور لین دین ہی اس کا پیشہ تھا۔ وہ باپ دادا والا کام نہیں کرتا تھا۔ اس کے دو کزن انور علی کی فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ انہوں نے شادے کو بھی شہر آ کر فیکٹری میں کام کرنے کا کہا۔ مگر وہ نہ مانا۔ کیونکہ اس طرح اس کا شوق ادھورا رہ جاتا تھا۔ اس کے ماں باپ اس کے اِس شوق سے تنگ تھے۔ کیونکہ آئے دن کوئی نہ کوئی جھگڑا ان کتوں کی وجہ سے انسانوں میں بھی ہو جاتا تھا۔ شادے کو بھی ایک دو بار مار پڑ چکی تھی۔ مگر وہ پھر بھی اس نکمے شوق سے باز نہ آتا تھا۔ پھر بھی اس کے ٹھاٹ باٹ نرالے تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں، بوسکی کی شلوار قمیض اور پشاوری چپل پہن کر وہ گھر سے باہر نکلتا تو وہ مسلّی نہیں۔ بلکہ کوئی بدمعاش لگتا تھا۔

شاہ سفیر کے سالانہ میلے میں وہ اپنا کتا لے کر گیا تھا۔ اس کا مقابلہ وہاں کے راجوں کے کتے سے تھا۔ کتوں کی اس لڑائی میں انسان بھی آپس میں لڑ پڑے تو اس لڑائی میں راجوں نے شادے کے کتے کو گولی مار کر مار ڈالا اور شادا اپنی ایک ٹانگ گنوا بیٹھا۔ اس کے بعد شادے نے اس شوق سے توبہ کر لی تھی اس کی ساری شان اور اکڑ خاک میں مل گئی۔ زمین کی مٹی زمین پر آن گری۔ بیساکھی اس کی زندگی کی ساتھی بن گئی۔ اور وہ گھر کا ہو کر رہ گیا۔ اب وہ گھر والوں کے لیے ایک بوجھ بن گیا۔ کیونکہ اب وہ کوئی کام بھی تو نہ کر سکتا تھا۔

شادے نے اپنے باپ سے کہا کہ وہ انور علی کو کہیں کہ وہ اسے فیکٹری میں ملازم رکھ لیں۔ اس کے باپ نے حامی تو بھر لی کہ وہ انور علی سے بات کرے گا۔ آگے ان کی مرضی وہ مانیں یا نہ مانیں۔ ایک معذور شخص کو وہ کیسے

ملازم رکھ سکتے تھے۔ مگر انور علی کی رحم دلی اور انسان دوستی کہ وہ شادے کو اپنے ہمراہ ہی شہر لے گئے اور انہوں نے شادے کو اپنی کوٹھی کا چوکیدار بنا دیا۔

رہائش، کھانا پینا اور تنخواہ بھی...... شادے کے تو مزے آگئے۔ وہ اپنی ڈیوٹی ایمانداری سے سرانجام دینے لگا۔

ان دنوں انور علی کا بیٹا عدیل پانچ سال کا تھا۔ اس نے شادے کی بڑی بڑی مونچھیں دیکھیں تو خوفزدہ

ہو گیا۔ کیونکہ اس نے اس سے پہلے ایسا انسان نہ دیکھا تھا۔ جس کی مونچھیں بڑی بڑی ہوں۔ ایک ٹانگ کا مالک ہو۔ بیساکھی کے سہارے ٹک ٹک کرتا چلتا ہو۔ شادا اب چلتا تو اس کی چال عجیب سی لگتی تھی۔ وہ سچ مچ کا کیدو لگتا تھا۔ وہ کیدو جو ہیر رانجھا کی زندگی میں زہر گھولتا رہتا تھا۔

کچھ دن گزرے تو عدیل کا خوف آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ مگر وہ پھر بھی شادے سے دور ہی رہتا تھا۔ شادا اسے پیار سے بلاتا تو وہ اس سے دور بھاگ جاتا۔

☆......☆......☆

اس روز انور علی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے فیکٹری نہیں گئے تھے۔ خانساماں بھی چھٹی پر تھا۔ انہیں کوئی کام تھا تو انہوں نے شادے کو بلا لیا۔ ان کا کمرہ بالائی منزل پر تھا۔ شادا ٹھک ٹھک کرتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر انور علی کے کمرے میں پہنچ گیا۔ انہوں نے اسے کام بتایا اور وہ واپس جانے کے لیے سیڑھیاں اُترنے لگا تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اس کی بیساکھی چھوٹ کر دور جا گری اور وہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے جا گرا۔ عین

اسی وقت عدیل سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔ عدیل...... شادے کے وجود کی زد میں آ گیا۔ اب عدیل نیچے تھا اور شادا اس کے اوپر۔ شادے نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو عدیل سے علیحدہ کیا۔ اور پھر عدیل کو تسلی دینے لگا۔

مگر عدیل نے ہاہا کار مچادی۔ اس کے رونے کی آواز سُن کر اس کی ماں باپ بھی آ گئے۔ شادے نے اُن کو سیڑھیوں سے گرنے کی تفصیل بتائی اور پھر لنگڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ مگر عدیل نے رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ انور علی

اوران کی بیگم نے عدیل کو بہت پیار کیا۔ تسلی دی۔ مگر اب اس نے ایک ہی رٹ لگائی کہ اس چوکیدار کو گھر سے نکال دیں۔ اسے اس لنگڑے سے خوف آتا ہے۔ عدیل تو ان کی جان تھا۔ اکلوتا اور لاڈلا تھا۔ اس لیے انہوں نے اس کی بات نہ ٹالی اور انور علی نے شادے کو واپس گاؤں بھیج دیا۔

☆......☆......☆

عدیل نے سکھ کا سانس لیا۔ مگر اس دن سے اسے ہر قسم کے معذور لوگوں سے نفرت اور ایک چڑ سی ہو گئی۔ وہ ایسے لوگوں کا وجود تک برداشت نہ کر پاتا تھا۔ ان دنوں عدیل سات برس کا تھا کہ اس کی ماں فوت ہو گئی۔ انور علی بیوی کی اچانک موت پر بکھر کر رہ گئے۔

نو سالہ طویل ازدواجی رفاقت کے دوران انہوں نے کبھی سوچا بھی تھا کہ وہ یوں انہیں تنہا کر جائے گی۔ انہیں اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ وہ بھی انہیں بہت چاہتی تھی اور ان کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اب عدیل ہی ان کے لیے جینے کی امنگ رہ گیا تھا۔ اس کی خاطر انہوں نے دوسری شادی بھی نہ کی اور عدیل کو ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا اور اسے کسی بھی موڑ پر ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ عدیل بھی بہت ہی ہونہار اور فرمانبردار تھا۔ انور علی اس سے خوش تھے مگر انہیں اس کی معذور لوگوں سے نفرت کرنے کی عادت سخت کھٹکتی تھی۔ عدیل کو ایسے لوگوں سے نہ صرف چڑ تھی بلکہ وہ ان کا وجود بھی اپنے پاس برداشت نہ کرتا تھا۔ انور علی نے اسے بہت سمجھایا کہ ایسے لوگ تو ہمدردی کے قابل ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی مدد کرنے سے اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوتا ہے اور اس کا اجر اور ثواب کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔

مگر عدیل پر ایسی باتوں کا کوئی اثر ہی نہ ہوتا۔ اس کا نظریہ تھا کہ جسمانی طور پر معذور لوگ ادھورے ہوتے ہیں اور ادھورے لوگوں کو ان کا پورا حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ مکمل لوگوں کے ساتھ چلیں۔ ان کے ساتھ میل جول رکھیں۔

انور علی کو بیٹے کے ان خیالات سے وحشت سی ہونے لگتی۔ پہلے ان کا خیال تھا کہ شاید شعور کی منزل پر پہنچ کر وہ ان بے ہودہ سوچوں سے پیچھا چھڑا لے گا۔ لیکن جوں جوں وہ سن بلوغت کو پہنچا یہ خیالات اس کے ذہن پر حاوی ہوتے گئے اور وہ ان کی گرفت سے نہ نکل سکا۔ وہ گاؤں بھی نہیں جاتا تھا کہ وہاں اس کا شادے لنگڑے سے سامنا نہ ہو جائے۔ ایسے معذور لوگوں سے نفرت بھی تو شادے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہ زندگی بھر شادے کی شکل نہ دیکھنے کی قسم کھا چکا تھا۔

انور علی...... خدا ترس، نیک اور پرہیزگار انسان تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے تھے۔ بیٹے کی اس عادت اور نادانی پر اکثر راتوں کو رو رو کر اللہ سے معافی مانگتے اور اس کی فلاح اور راہِ راست پر آنے کی دعائیں مانگتے رہتے۔

☆......☆......☆

عدیل پڑھائی کے معاملہ میں بہت آگے تھا۔ اس نے ایم بی اے امتیازی نمبروں سے پاس کیا تو انور علی کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ان کی کتنی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد تعلیمی مراحل طے کر کے ان کا ہاتھ بٹائے۔ اب ان میں مزید سکت نہ رہی تھی کہ وہ کاروباری کاموں میں اُلجھے رہتے چنانچہ اب انہوں نے عدیل کو بلا کر پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''عدیل بیٹا! اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اب بزنس تم ہی کو سنبھالنا ہے۔ بس کل سے آفس جانا شروع کر دو۔''

''لیکن...... ڈیڈی!''

''نہیں۔'' انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''میں کسی قسم کا عذر نہ سنوں۔ بس یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔''

عدیل نے ہنستے ہوئے باپ کے آگے سر جھکا دیا تو انور علی کے چہرے پر سکون و طمانیت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ جیسے ان کے دماغ سے کوئی بوجھ اُتر گیا ہو۔

☆......☆......☆

بانو...... عدیل کی پھوپی کی بیٹی تھی۔ بچپن میں ہی ان دونوں کو ایک دوسرے سے منسوب کر دیا گیا تھا۔ اس کی پھوپی کا خاندان عرصہ سے کراچی میں آباد تھا۔ اس لیے اُن کی ملاقات سال دو سال بعد ہی ہوا کرتی تھی۔ عدیل...... بانو کو چاہتا تھا۔ وہ اسے بہت ہی پسند تھی۔ تھی

بھی لاکھوں میں ایک...... برادری میں بھی اس کے حسن کے چرچے تھے۔ عدیل ایک سلجھے ہوئے ذہن کا لڑکا تھا۔ اس لیے اس نے کبھی بانو کو کوئی خط یا فون وغیرہ کے ذریعے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ البتہ جب بھی وہ آپس میں ملتے تو ان کی نظروں میں ایک دوسرے کے لیے چھپے چاہت کے دیپ جلتے ہوئے سبھی کو دکھائی دیتے تھے۔

انور علی نے بیٹے کی عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی بہن کو فون کر کے شادی کی تاریخ طے کر دی۔ عدیل نے انہیں اس قدر جلدی کرنے سے بہت روکا۔ مگر وہ نہ مانے وہ واقعی اب گھر میں بہو لانے کی ضرورت کو بڑی شدت سے محسوس کرنے لگے تھے۔ اس لیے انہوں نے عدیل کی ایک نہ سنی اور شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

☆......☆......☆

آج انور ولا اپنی رونقوں سمیت عروج پر تھا۔ رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔ قہقہوں کا ایک طوفان تھا جو امڈ رہا تھا۔ گیٹ پر گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا گویا سارا شہر شادی میں شرکت کرنے آیا ہوا ہے۔ انور علی کے ہاں برسوں بعد یہ خوشی کا دن آیا تھا۔ اس لیے انہوں نے جی بھر کر اپنے ارمان نکالے اور بیٹے کی شادی پر بے دریغ دولت لٹائی۔

حجلۂ عروسی میں عدیل نے پہلی بار بانو کو اس روپ میں دیکھا۔ بنارسی کپڑوں میں وہ ایک گٹھری کی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ کسی قدر مایوس ہو گیا۔ وہ خاصا آزاد خیال تھا۔ اس نے کبھی یوں سوچا بھی نہ تھا کہ بانو بھی روایتی دلہنوں کی طرح ہو گی۔

وہ بے دلی سے کھڑا رہا یوں لگتا تھا، جیسے اس کے خیالات اور سوچیں لامحدود ہو گئی ہوں۔ بانو اتنی دیر سے سر جھکائے بیٹھے رہنے سے تھک سی گئی اور کسمسانے لگی۔ لیکن عدیل تو اپنی سوچوں میں گم تھا۔ کچھ دیر یوں ہی گزر گئی۔ پھر عدیل کو بانو پر رحم آ ہی گیا...... وہ بانو کی طرف بڑھ گیا۔ جو اس کی منتظر تھی۔

☆......☆......☆

صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا بانو لڑکھڑاتے ہوئے باتھ روم کی طرف جا رہی تھی۔ اسے اس لمحہ اس پر بہت ترس آیا اور وہ سوچنے لگا شاید وہ بہت تھک چکی ہے بھی تو بے چاری صحیح طرح سے چل نہیں پا رہی۔ وہ بستر سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

دن یوں ہی گزرتے گئے۔ لیکن عدیل بانو کی رفاقت سے کوئی خاص خوشی محسوس نہ کر رہا تھا۔ اگرچہ شادی سے پہلے اس کے دل میں بانو کے لیے ایک نرم گوشہ تھا۔ لیکن اب نہ جانے وہ اسے پا کر مایوس سا ہو گیا۔ اس کے ذہن میں جو آئیڈیل تھا وہ کسی طور بھی اس پر پوری نہ اترتی تھی۔ انتہائی کم گو، سیدھی سادی سی بانو! حالانکہ دو سال قبل جب وہ اس سے ملا تھا تب تو وہ ایسی نہ تھی۔ اب نہ جانے کیوں اس میں اتنی سادگی آ گئی تھی۔

وہ ان ہی خیالوں میں اُلجھا ہوا تھا کہ آہٹ پا کر وہ چونک اٹھا۔ بانو کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ بنڈل تھے۔ وہ آہستہ سے چلتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ عدیل نے دیکھا کہ وہ کچھ لڑکھڑا بھی رہی تھی۔ بالکل ویسے ہی جب اس نے شب عروسی کے بعد اسے اگلے دن دیکھا تھا۔ پہلے تو وہ اسے اس کی تھکاوٹ سمجھتا رہا تھا۔ لیکن اتنے دنوں تک تھکاوٹ کا کیا کام؟

اس نے حیرت سے سوچا اور غور سے اُسے دیکھنے لگا۔ جو اس کے نزدیک سے گزر کر الماری میں سامان رکھ رہی تھی۔ پھر وہ پلٹ کر خاموشی سے بیڈ کی طرف بڑھی۔

''یہ تم اس طرح کیوں چل رہی ہو؟'' عدیل نے انجانے سے وسوسوں میں گھر کر اس سے پوچھا۔

''وہ...... وہ دراصل پچھلے سال جو حادثہ ہوا تھا نا!'' اس نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے کہا اور بدستور نگاہیں نیچے کیے کسی مجرم کی مانند کھڑی رہی۔

عدیل سمجھ گیا کہ پچھلے سال اس کی پھوپی نے بانو کے جس حادثے کا مختصر سا ذکر کیا تھا یہ لنگراہٹ اسی حادثے کا نتیجہ ہو گی۔ یہ جان کر اس کا پورا وجود پسینے سے بھیگ گیا۔ جس بات سے اسے چڑ تھی۔ جو اسے پسند نہ تھی۔ جس سے وہ نفرت کرتا تھا۔ آج تقدیر نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ اسے یہ سب کچھ برداشت کرنا تھا۔ وہ بھی زندگی بھر کے لیے۔

بانو خوفزدہ نگاہوں سے دھواں دھواں چہرہ لیے

اسے دیکھنے لگی۔ وہ عدیل کی نظروں میں چھپی نفرت اور ناپسندیدگی کے جذبات صاف پڑھ رہی تھی۔ دفعتاً وہ غصے سے پاؤں پٹختا کمرے سے باہر نکل آیا اور باپ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''ڈیڈی! آپ بخوبی جانتے ہیں کہ مجھے معذور لوگ پسند نہیں۔ پھر آپ نے کیوں مجھے اس اُدھوری لڑکی سے وابستہ کردیا؟'' وہ انتہائی جارحانہ انداز میں بولا۔ انور علی بیٹے کے اس لہجے پر چونک اٹھے اور ناگواری سے بولے۔

''کیا بکواس کررہے ہو، کون معذور ہے؟''

''بانو...... جسے آپ نے بنا دیکھے بھالے میرے پلے باندھ دیا۔'' وہ ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولا۔

انور علی کے ذہن میں فوراً بہن کا وہ خط گھوم گیا۔ جس میں انہوں نے بانو کے حادثے کا ذکر کیا تھا۔ تب انہوں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! وہ بچپن سے تمہارے ساتھ منسوب ہے۔ اگر یہ حادثہ شادی کے بعد پیش آتا تو کیا تم تب بھی یوں شور مچاتے۔''

''ہاں...... آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجھ سے یہ سب برداشت نہ ہوسکے گا۔ آپ جس قدر جلدی ہوسکے اسے اپنے گھر واپس بھیج دیں۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل آیا۔

اتنی گستاخی...... اتنی بے نیازی...... انور علی نے کبھی بیٹے کے بارے میں ایسا سوچا بھی نہ تھا کہ وہ یوں ایک دن اُن سے اس طرح پیش آئے گا۔

اُدھر جب بانو نے یہ سُنا تو اس کی حالت غیر ہوگئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''کاش...... عدیل! تم جان لیتے کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ میں نے تو تمہیں ٹوٹ کر چاہا ہے۔ میں بچپن ہی سے اپنا نام تمہارے نام کے ساتھ سنتی چلی آئی ہوں۔ میرے من مندر کے دیوتا تم ہو اور میں تمہاری پوجا کرتی ہوں۔ لیکن یہ کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ مجھ میں اتنی خامی تو نہیں کہ تم یوں مجھ سے شدید نفرت کرنے لگو۔ میں تمہارے علاوہ کسی اور کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اور میں اتنی کم ظرف بھی نہیں ہوں کہ تمہاری خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ بنوں۔

اور پھر بانو نے ایک عزم سے ایک فیصلہ کیا۔ واپس والدین کی دہلیز پر لوٹ جانے کا، سبھی نے اسے روکا سوائے عدیل کے۔

انور علی اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے۔ اسے واسطے دیے کہ وہ عدیل کو سیدھا کردیں گے۔ وہ نہ جائے، اس گھر میں خوشیاں آئی ہیں۔ تم چلی گئیں تو خزاں رُت ڈیرے ڈال دے گی۔ لیکن بانو نہ مانی، اس نے اٹل فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اپنی محبت کی توہین برداشت نہیں کرسکے گی۔ وہ عدیل کو ملے بغیر چلی گئی۔ تو عدیل نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ اسے کوئی دکھ اور پچھتاوا نہ ہوا۔

☆......☆......☆

جب جیون ساتھی اپنے مطلب کا نہ ہو تو ایک خالی پن کا احساس زندگی کو دیمک کی طرح چاٹنے لگتا ہے اور یہی خالی پن زندگی کو کسی پل چین نہیں لینے دیتا۔ ہر وقت بے قرار کیے رکھتا ہے۔ عدیل کو اور کوئی دکھ نہ تھا۔ اس نے خود ہی یہ دکھ پال لیا تھا۔ اب گھر میں بھی اور گھر سے باہر بھی خاموش سا رہنے لگا تھا۔ باپ سے اس کا اب کم ہی سامنا ہوتا تھا۔ وہ رات گئے گھر لوٹتا اور سیدھا اپنے کمرے میں گھس جاتا اور پھر اگلے دن صبح سویرے آفس نکل جاتا۔

انور علی اس سے ناراض تھے کہ اس نے بانو کی قدر نہیں کی۔ وہ اپنی بہن کے آگے بھی شرمندہ تھے۔ انہوں نے عدیل کو بہت سمجھایا تھا کہ وہ بانو پر یہ ظلم نہ کرے اللہ تعالیٰ سب دیکھ رہے ہیں۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ وہ کبھی کبھی انسان کو اس دنیا میں بھی اس کے ظلم کا حساب برابر کردیتے ہیں۔ مگر عدیل پر تو ان کی کسی بات کا اثر ہی نہ تھا۔ انہوں نے عدیل کو یہ وارننگ دی تھی کہ وہ بانو کو کبھی طلاق نہیں دے گا۔ اور اگر اس نے ایسا کیا تو وہ اس سے تمام ناتے توڑ لیں گے۔

☆......☆......☆

عدیل نے بانو کو طلاق نہیں دی تھی۔ مگر اُس نے اُس کے ساتھ زندگی بھی گزارنی تھی۔ اس کا یہ فیصلہ اٹل تھا۔ اب وہ کسی آئیڈیل کی تلاش میں تھا۔ ایسا آئیڈیل جس میں کوئی، کوئی نقص نہ ہو اور وہ لاکھوں میں ایک ہو۔ اسے ایک ترکیب سوجھی، اس نے لیڈی سیکریٹری

کی پوسٹ کے لیے اخبار میں اشتہار دے دیا۔ انٹرویو والے دن بارہ لڑکیاں آئی تھیں۔ ان میں سے صرف ایک کو ہی منتخب کرنا تھا۔ جو اس نے کر لی۔

ناجیہ لاکھوں میں ایک تھی۔ ہر عیب سے پاک، مکمل اور خوبصورت بھی۔ ناجیہ کو بھی اپنی خوبصورتی پر مان تھا۔ اپنے حسن پر، اپنی نگاہوں کے سحر پر، عدیل کو بھی وہ بھا گئی تھی۔ معصوم سی صورت۔ قلوپطرہ کی مانند حسین و جمیل اسے دیکھ کر اس کا دل ایک دم سے دھڑکا تھا۔ وہ ہو بہو اس کا آئیڈیل تھی۔ عدیل نے اس دن اسے اپائنٹمنٹ لیٹر دے دیا۔ اس نے اگلے دن سے دفتر آنا شروع کر دیا۔

بس یہیں سے ان کی جان پہچان کا سفر شروع ہوا۔ ناجیہ اچھی لڑکی تھی۔ اس میں وہ ساری خوبیاں موجود تھیں۔ جو عدیل کسی عورت میں دیکھنے کا متمنی تھا۔ آہستہ آہستہ وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور دفتری اوقات کے بعد بھی اکثر ایک ساتھ رہنے لگے۔

انور علی بیٹے میں رونما ہونے والی اس تبدیلی پر حیران تھے۔ اب وہ روزانہ صبح ناشتا ان ہی کے ساتھ کر کے جاتا تھا اور اُن سے باتیں بھی کرتا۔ لیکن جلد ہی جب انہیں بیٹے میں رونما ہونے والی اس تبدیلی کے متحرک کا علم ہوا تو وہ پریشان ہو کر رہ گئے۔ انہیں اپنی معصوم بھانجی بانو یاد آ گئی۔ جو بے چاری چار دن بھی خوشی کے ان کے گھر نہ گزار سکی۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگی؟ یہ سوچ کر وہ اور بھی پریشان ہو جاتے۔

ناجیہ جتنا وقت عدیل کے ساتھ رہتی وہ اپنے آپ کو بہت ہی خوش و خرم اور ہلکا پھلکا محسوس کرتا۔ اور وہ دفتر اور فیکٹری کی ساری کلفتیں بھول جاتا۔ اور جب وہ چلی جاتی تو پھر سے اُس کا دل خالی سا ہو جاتا۔ وقت کاٹے نہ کٹتا۔ اسے سمجھ نہ آ رہا تھا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے۔ اگر اسی کیفیت کا نام محبت ہے تو پھر...... واقعی اسے ناجیہ سے محبت ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

ناجیہ کے ساتھ رہنے میں عدیل کو ایک خوشگوار احساس ہوتا تھا۔ مگر وہ چاہنے کے باوجود بھی اس سے شادی کی بات کرنے کی ہمت نہ پا رہا تھا۔ اسے بانو پاؤں کی زنجیر محسوس ہونے لگی۔ لیکن وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے طلاق دینا۔ اس کے اختیار میں نہیں۔ بوڑھے باپ کو وہ اس عمر میں کسی صدمے سے دوچار نہیں کرنا چاہتا تھا تو پھر کیا ناجیہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ شادی شدہ ہے، اس کا ساتھ دے گی۔

وہ جتنا سوچتا اس کا ذہن تفکرات میں گھر جاتا۔

اُسے ناجیہ پر یقین تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور اس کی محبت میں سب کچھ کر سکتی ہے۔

عورت محبت کے جذبات کو زیادہ عرصہ پوشیدہ نہیں رکھ سکتی۔ ایک دن ناجیہ نے اس سے کہا۔

''عدیل! تم مجھے یہ کیا سزا دے رہے ہو۔ ہر روز ملنا پھر بچھڑنا پھر ملنا۔ آخر یہ کب تک ہوگا۔ میں تمہارے قرب کی اس قدر متلاشی ہوں کہ اب تم سے جدائی گوارا نہیں ہوتی۔ تم سے جدا ہو کر میں اپنے آپ کو نامکمل سمجھنے لگتی ہوں۔'' ناجیہ کی طرف سے اظہار محبت میں اس کے لیے بڑی طمانیت چھپی ہوئی تھی۔ یہ ڈھکے چھپے لفظوں میں شادی کی آرزو کا اظہار تھا۔ عدیل نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''ناجیہ! میں بھی تمہارے بغیر ایک ایک پل سُولی پر لٹک کر جی رہا ہوں۔ میں تمہیں بہت جلد اپنا جیون ساتھی بنالوں گا۔ پھر ہم ہوں گے اور خوشیوں کی برسات ہوگی۔''

ناجیہ مطمئن ہو گئی اور آنے والے خوشگوار دنوں کا انتظار کرنے لگی۔ جو اس کے دامن میں خوشیاں لے کر آ رہے تھے۔

☆......☆......☆

عدیل کا دفتر فیکٹری کے نزدیک ہی تھا۔ وہ روزانہ ہی فیکٹری کا ایک چکر لگایا کرتا تھا۔ اس کی فیکٹری کے سامنے مشروب بنانے کی ایک فیکٹری تھی۔ اس کے مالکوں کا کسی قبضہ اور بھتہ گروپ کے ساتھ کوئی تنازع چل رہا تھا اور ان کو دھمکیاں بھی ملتی رہتی تھیں۔ ایک روز وہاں فیکٹری کے گیٹ پر کوئی جھگڑا ہو گیا کہ نوبت فائرنگ تک آ گئی۔ اسی وقت عدیل عین اپنی فیکٹری کے گیٹ پر پہنچا تھا۔ فائرنگ زور پکڑ گئی تھی۔ جس وجہ سے کئی راہگیر زخمی ہو گئے تھے۔ اسی فائرنگ کی زد میں عدیل میں

آ گیا۔ بارود کے ذرّے اس کے چہرے پر بھی لگے۔ مگر ایک ذرّہ اس کی آنکھ کو شدید زخمی کر گیا۔

عدیل کو اسپتال لے جانا پڑا۔ اسے ایمرجنسی میں لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے اس کے مرہم پٹی کر کے گھر روانہ کر دیا اور تاکید کی کہ کل کسی آنکھوں کے ڈاکٹر سے معائنہ کراؤ۔"

تمام رات عدیل نے تکلیف میں گزار دی۔ اس کی آنکھ میں شدید درد ہو رہا تھا۔

"اگلی صبح آنکھوں کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں آئی۔ اسپیشلسٹ کو چیک کر دیا تو اس نے معائنہ کے بعد بتایا کہ اس کی آنکھ ضائع ہو گئی ہے۔ اور اب اس آنکھ کی بینائی بھی جاتی رہی ہے۔ جواب کسی صورت میں بحال نہیں ہو سکے گی کیونکہ اس نے دور تک آنکھ کو متاثر کیا ہے۔"

عدیل کو اس آنکھ سے کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس کی ایک آنکھ تاریکی کا سمندر بن گئی۔

اس نے بہت بھاگ دوڑ کی۔ مختلف ڈاکٹروں کو دکھایا مگر ہر ایک نے مایوسی کا ہی اظہار کیا۔ عدیل کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی دلدل میں دھنستا جا رہا ہے۔ کسی گہری دکھائی میں گر گیا ہو۔ وہ ہر طرف سے مایوس ہو گیا۔ اُسے یہ پچھتاوا چین نہ لینے دے رہا تھا کہ دوسروں کو ادھورا اور معذور کہنے والا آج خود معذور ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

انور علی بیٹے کی اس بے بسی پر کٹ کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے اس روگ کو سینے سے لگا لیا اور زندگی سے ناتا توڑ گئے۔ عدیل بھری دنیا میں تنہا رہ گیا۔ اب ناجیہ ہی اس کا سہارا تھی۔ گاؤں والوں کو تو وہ کب کا بھول چکا تھا۔ اس کے غریب رشتہ دار بھی انور علی کی موت کے بعد ہر طرف سے مایوس ہو گئے۔ کیونکہ عدیل کا رویہ ان کے ساتھ کبھی اچھا نہ رہا تھا۔ عدیل نے بھی ان کی پروا کرنی چھوڑ دی تھی۔ وہ کسی بھی رشتہ دار اور غریب کی مدد نہ کرتا تھا۔ اسے گاؤں کے چھوٹے لوگوں سے بھی نفرت تھی۔ دولت نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ وہ اب صرف ناجیہ کا ہی دم بھرتا تھا۔

مگر اب جبکہ عدیل ایک آنکھ کا مالک بن گیا تو وہ ناجیہ جو اس کا دم بھرتی تھی۔ ایک دم بدل گئی۔ اس دکھ نے عدیل کو کہیں کا نہ رہنے دیا۔ اس کے دل میں مایوسی اور محرومی کی آگ بھڑکنے لگی۔ اسے ناجیہ سے یہ اُمید نہ تھی۔ اس کی چاہت کا دم بھرنے والی اب بھی کبھار دفتر آتی اور رسمی سی باتیں کر کے واپس پلٹ جاتی۔ اگر وہ کبھی بیتے دنوں کا ذکر کرنا چاہتا تو وہ خوبصورتی سے پہلو بچا لیتی اور پھر ناجیہ نے اس کی ملازمت چھوڑ دی۔ اور ایک بزنس مین سے ہی شادی کر لی۔ یوں عدیل بالکل ہی اکیلا رہ گیا۔

تنہائی اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ ناجیہ کی بے وفائی نے اسے ایک اور گہرا زخم لگایا۔ تو وہ ہر چیز سے بیگانہ ہو گیا۔ اس کا اب تو کوئی بھی ہمدرد اور غم گسار اس دنیا میں نہ رہا تھا۔ اب پچھتاوے ہی اس کے ساتھی تھے۔ جنہوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ اندھیرے اس کا مقدر بن گئے۔ دن سونے اور راتیں بے کیف ہو گئیں۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اب تک سرابوں کے پیچھے بھاگتا رہا ہے۔ معذور لوگوں سے نفرت اسے مہنگی پڑ گئی تھی۔ معذوری کا روگ اسے کسی پل چین نہ لینے دے رہا تھا۔ دکھ اور درد کے اس عالم میں اس نے ایک فیصلہ کیا تو اس رات اُسے چین کی نیند آئی تھی۔

☆......☆......☆

اگلے روز وہ جہاز پر سوار ہو کر کراچی جا رہا تھا۔ اپنی بانو کے پاس...... کفارہ ادا کرنے اور اُس سے معافی مانگنے، اُس نے آنکھوں پر کالے رنگ کے شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی۔ تاکہ کسی کو اُس کے ادھورے پن کا احساس نہ ہو۔ پھوپی کا ایڈریس اس کے پاس تھا۔ وہ اس سے پہلے صرف ایک بار اُن کے گھر آیا تھا۔ اس لیے وہ آسانی سے ان کے ایڈریس پر پہنچ گیا۔ مگر وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اس کے پھوپا کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کی پھوپی اور بانو ایک کچی آبادی میں منتقل ہو گئی ہیں۔ کیونکہ وہ اس گھر کا کرایہ نہ دے سکتی تھیں۔

عدیل یہ سب کچھ جان کر پریشان ہو گیا۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ اور ان دونوں کو تلاش کر کے ہی دم لیا۔ وہ کچی آبادی سہراب گوٹھ کے علاقے میں تھی۔ جس

میں زندگی کی کوئی سہولت میسر نہ تھی۔

پھوپی نے اسے برسوں بعد دیکھا تھا۔ مگر وہ پھر بھی اس کو پہچان گئی تھیں۔ برسوں بعد وہ عدیل کو اچانک سامنے پا کر ششدر رہ گئی تھیں۔ انہوں نے اسے گلے سے لگالیا اور رونے لگیں۔ جب دل کا غبار کم ہوا تو وہ بولیں۔

''مجھے یقین تھا کہ ایک دن تم ضرور لوٹ آؤ گے مگر بانو نہیں مانتی وہ کہتی ہے عدیل...... بڑا آدمی ہے۔ میں غریب اور نامکمل اس کے کس کام کی ہوں۔ وہ اب میری طرف لوٹ کر نہیں آئے گا۔''

''کہاں ہے بانو؟'' عدیل بے تابی سے بولا۔'' میں اسے لینے آیا ہوں پھوپی اور آپ بھی میرے ساتھ چلیں گی۔ میں بھٹک گیا تھا۔ مگر اب منزل کی طرف لوٹ آیا ہوں۔''

''وہ بستی کے اسکول میں ہوگی۔'' پھوپی بولیں۔

''کہاں ہے اسکول؟ اور وہ وہاں کیا کر رہی ہے؟'' عدیل بے تابی سے بولا۔

''وہ پڑھاتی ہے وہاں...... بستی کے مشرق کی سمت جاؤ۔ اسکول اُدھر ہی ہے۔'' پھوپی نے اسے اسکول کا راستہ سمجھایا۔ تو وہ اس طرف روانہ ہوگیا۔

☆......☆......☆

بستی سے باہر ایک میدان تھا۔ ایک طرف گھنے درخت تھے۔ ایک کمرہ تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ بچے دھوپ میں پھٹے ہوئے ٹاٹ پر بیٹھے سبق پڑھ رہے تھے۔ وہ سارے بچے معذور تھے۔ وہ کسی نہ کسی بیماری اور معذوری میں مبتلا تھے ان کی استاد صرف بانو تھی۔ جو اُن کو پڑھاتی تھی۔ اُن کے حوصلے بڑھاتی تھی۔

گوٹھ کا ایک کونسلر بانو کی مدد کرتا تھا۔ اور وہ اس کی مدد کے سہارے ان بچوں کا مستقبل سنوارنے میں کوشاں تھی۔ اور اپنی زندگی بھی گزار رہی تھی۔ بستی کے غریب اور مفلس لوگ بانو کے اس کام سے متاثر تھے۔ اور اس کی عزت کرتے تھے۔ وہ اپنا غم اور دکھ بھلا کر انسانیت کی خدمت کر رہی تھی۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے سینے میں کتنے دکھ اور طوفان پنہاں ہیں۔ وہ عدیل کو ایک لمحے کو بھی نہ بھلا پائی تھی۔ وہ اس کی امانت تھی اور وہ امانت کی حفاظت بھی کر رہی تھی۔ عدیل نے اسے ادھوری ہونے کا طعنہ دیا تھا۔ اسی لیے وہ ادھورے بچوں کو جینا سکھا رہی تھی۔ یہی تو اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ اس کے ارادے بڑے نیک اور عظیم تھے۔ مگر وسائل کی کمی اس کے ارادوں کی تکمیل نہ ہونے دے پا رہی تھی۔

☆......☆......☆

عرصہ بعد اس نے عدیل کو سامنے دیکھا۔ تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ ''آپ اور یہاں؟'' بانو حیرت سے بولی۔

''ہاں میں عدیل اور یہاں...... چلو میرے ساتھ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔'' عدیل بولا۔ بانو کی آنکھوں میں غم کی پرچھائیاں اُمڈ آئیں اور وہ بمشکل آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''میں آپ کی ہم سفر ہی کب ہوں؟''

''نہیں بانو! ایسے مت کہو۔ تمہیں کھو کر میں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ میرا سارا غرور ٹوٹ چکا ہے۔'' بانو خاموش کھڑی فرش کو گھورتی رہی۔ عدیل اسے دیکھ کر دکھ سے بولا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟ میرے ساتھ نہیں چلوگی کیا؟''

''نہیں اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ میں تو ایک ادھوری عورت ہوں۔ آپ کی بیوی بننے کے لائق نہیں!''

''میں تمہارا دکھ سمجھ رہا ہوں بانو!'' وہ شرمساری سے بولا۔'' کیا تم مجھے معاف نہیں کروگی؟''

''میں نے کہا ناں...... میں آپ کے قابل نہیں ہوں عدیل صاحب! میں ایک ادھوری اور معذور لڑکی ہرگز آپ کا ساتھ نہیں دے سکتی۔'' بانو نے قدرے تلخی سے کہا۔

''میں کون سا مکمل انسان ہوں۔ میں بھی تو ادھورا ہی ہوں۔ ایک آنکھ کا مالک ہوں۔'' یہ کہہ کر عدیل نے چشمہ اُتار دیا۔ بانو نے اس کی طرف دیکھا اور حیرانی سے پوچھا۔

''یہ کیسے ہوا؟''

''قدرت نے مجھے غرور کرنے اور تمہارے ساتھ زیادتی کرنے کی سزا دی ہے۔ میں اتنی دور تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں اور پھوپی دونوں کو ساتھ لے کر

جاؤں گا۔ میں تمام زیادتیوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔" عدیل نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"ہاں عدیل......! اوپر والا بڑا بے نیاز ہے۔ تم نے ظلم کیا اور اس کی سزا دنیا میں ہی پالی۔ میں بھی تمہیں دل سے معاف کرتی ہوں۔ مگر میں پھر بھی تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔" بانو نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"کیوں نہیں جاؤ گی؟" عدیل بے تاب سا ہو کر بولا۔

"میں ان معذور بچوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں نے اپنا جیون ان کے لیے وقف کر دیا ہے۔ یہ میرے بغیر اور میں ان کے بغیر ادھوری ہوں۔ مجھے یہ اپنی اولاد لگتے ہیں۔ یہ مجھے اپنی ماں سمجھتے ہیں۔ اور ماں اپنے بچوں کو کیسے جدا کر سکتی ہے۔" بانو نے دل کا فیصلہ سُنا دیا۔

عدیل نے بہت ہی کوشش کی۔ اسے ساتھ لے جانے کی مگر بانو ان معصوموں اور معذوروں کو چھوڑ کر جانے پر رضا مند نہ ہوئی۔ عدیل غصہ سے بل کھاتا ہوا لوٹ آیا۔ اس نے اپنی پھوپی سے کہا کہ وہ بانو کو راضی کریں اور پھر دونوں میرے ساتھ چلیں مگر اس کی پھوپی بھی نہ مانیں۔ اور عدیل مایوس اور ناکام ہو کر اپنے شہر اپنے گھر لوٹ آیا۔

مگر عدیل کو اب کسی بھی پل چین نہ تھا۔ اسے اپنا آپ ہی نہیں۔ ساری دنیا ہی بانو کے بغیر ادھوری لگتی تھی۔ وہ بانو کی عظمت اور بڑائی کا قائل ہو گیا تھا کہ وہ کتنی سچی ہے۔ کتنی مخلص اور عظیم ہے۔ اسے اپنا آپ بہت ہی چھوٹا لگا۔ اس نے اپنے اعمال کا تجزیہ کیا کہ اس نے نہ جانے کتنے معذوروں کا دل دکھایا ہے۔ نفرت کی ہے ان چھوٹے غریب اور ادھورے لوگوں سے۔ اپنی بے اعتدالیوں کی اسے کوئی پروا ہی نہ تھی۔ اسے تو آئیڈیل کی تلاش سے فرصت ہی نہ تھی۔ اب جبکہ سنگِ حلاوت نے اس کے خوابوں کے شیش محل کو چکنا چور کر دیا تھا تو وہ ان کے ملبے میں دب کر سسکنے لگا۔ اب اس زندگی سے فرار ممکن نہ رہا تھا۔ وہ جو کچھ بننا چاہتا تھا۔ ویسا اسے قدرت نے بننے نہ دیا۔ اب اسے سچائی کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا تھا۔

وہ ریشم کے کیڑے کی طرح اپنے ہی گرد جال بنتے بنتے کہیں گم ہو گیا تھا۔ وہ روشنیوں کی دنیا سے نکل کر اندھیروں کا حصہ بن گیا۔ خوابوں اور خواہشوں کے تعاقب میں اتنا دور نکل گیا تھا۔ جہاں سے واپسی ممکن نہ تھی۔ مگر اب بانو کا انوکھا روپ دیکھ کر وہ واپس لوٹ آیا تھا۔ اب اسے احساس ہوا تھا کہ وہ تو سرابوں کے پیچھے بھاگتا رہا ہے۔ اصل زندگی تو وہ ہے جو بانو گزار رہی ہے۔ وہ کتنی خوش ہے ان ادھورے اور معذور بچوں کے ساتھ...... وہ عورت ہو کر بازی لے گئی ہے اور میں مرد ہو کر ہار گیا ہوں۔ لیکن نہیں...... میں ہار نہیں مانوں گا۔ میں اپنے کردار اور عمل سے ثابت کروں گا کہ میں بھی بانو سے کم نہیں ہوں۔ میں بانو سے قدم ملا کر چلوں گا۔ آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ زندگی وہ نہیں ہے جو وہ گزارتا رہا ہے۔ زندگی تو وہ ہے جو اوروں کے کام آئے کسی کے کام آنا اور اس کے دکھ بانٹنا ہی زندگی ہے۔ یہی ہمارے رب کا حکم ہے اور یہی انسانیت کی معراج ہے۔

☆......☆......☆

چند ہفتے گزر گئے تھے۔ عدیل ایک بار پھر بانو کی طرف سفر کر رہا تھا۔ بانو ایک بار حیرانی میں ڈوب گئی کہ اب عدیل کیوں آیا ہے؟

'میں بھی بھی اس کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میں ساری زندگی اس کے نام کے سہارے زندگی گزار لوں گی۔ مگر اپنے مشن کو ادھورا نہ چھوڑوں گی۔' اُس نے دل میں سوچا اور مصمم ارادہ کر کے اُس سے مخاطب ہوئی۔

"عدیل آپ پھر آ گئے۔ میں نے کہا تھا کہ میں نہیں جاؤں گی۔"

"تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گی۔" عدیل بولا۔ "کیونکہ میں تمہارے پاس آ گیا ہوں ہمیشہ کے لیے۔ میں نے اپنے تمام اثاثے فروخت کر ڈالے ہیں یہ لو بریف کیس...... اس میں لاکھوں روپے ہیں۔ جو ہم ان ادھورے لوگوں پر خرچ کریں گے۔ میں بھی اس راہ میں تمہارا ہم سفر بن گیا ہوں۔"

"سچ؟" اس نے بے یقینی کی سی کیفیت سے کہا۔

"ہاں سچ!" عدیل نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

بانو لنگڑاتی ہوئی آگے بڑھی اور عدیل کے سینے سے لگ گئی۔ دونوں کے آنسو بہہ نکلے جو خوشی کے تھے۔

☆......☆......☆

دوسری سچ بیانی

ملک صفدر عباس اعوان

شام کے دھندلکے میں وہ کندھے پر بیگ لٹکائے ہوئے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا۔ مختلف گلیوں میں سے گزرتا ایک تنگ سی گلی کے نکڑ پر آن کھڑا ہوا۔

شام کے سائے قدرے گہرے ہو رہے تھے۔ ہلکا ہلکا اندھیرا ہر سو بکھیرا ہوا تھا۔ اس گلی کے نکڑ پر لگے ہوئے اسٹریٹ لیمپ کی مدھم سی روشنی اندھیرے کو وہاں سے دور بھگا رہی تھی۔ اسٹریٹ لیمپ کا صرف ایک ہی بلب روشن تھا۔ دوسرا بلب شاید کسی شرارتی بچے کی شرارت کا نشانہ بن چکا تھا۔ اس نے کندھے سے بیگ اُتار کر نیچے زمین پر رکھا اور خود اسٹریٹ لیمپ کے کھمبے سے ٹیک لگائے اپنے سامنے اس تنگ سی گلی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی اُداسی تھی۔ چہرے پر ملال کے رنگ نمایاں ہو گئے تھے۔ اُسے وہ دن آج بھی اُسی طرح یاد تھا۔ اُس دن کی یادیں آج بھی اُس کے من آنگن میں بین ڈال رہی تھیں۔ مئی کا مہینہ اُسے یادوں کی رم جھم میں بھگو ڈالتا تھا۔ اور پانچ مئی کو اُس کے قدم خود بخود مناہل کی آخری آرام گاہ کی طرف اُٹھ جاتے تھے۔

وہ بھی پانچ مئی کا ہی دن تھا۔ وہ دیارِ غیر سے پورے پانچ سال بعد وطن لوٹا تھا۔ اپنے دیس سے محبت، انسیت اور دیس کی مٹی کی خوشبو محسوس کرتے ہوئے اس کے جسم کے انگ انگ میں نیا جوش، نئی توانائی سی بھر گئی تھی۔ وہیں کھڑے ہوئے وہ اپنے ماضی کے جھروکوں میں اپنا کھویا ہوا بچپن تلاش کرنے لگا۔

بچپن میں اس کو خود اپنے بارے میں بھی علم نہیں تھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اس کے والدین تھے یا نہیں، کہاں تھے اس بات کا بھی اس کو اندازہ نہیں تھا۔ اس کا بچپن اپنے ہی دیس کی گلیوں میں بے مقصد آوارہ پھرتے ہوئے گزرا۔ رہنے کے لیے اس کے پاس کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ پہننے کے لیے تن پر کپڑا نہیں تھا۔ کھانے کے لیے روٹی نہیں تھی۔ بعض اوقات وہ کسی گلی کو ہی اپنا گھر سمجھ کر نیچے زمین پر سو جاتا۔ لوگ ترس کھا کر کبھی کبھار اپنے بچوں کی پرانی اُترن اس کو دے دیتے۔ جس کو وہ اپنے تن پر اوڑھ لیتا۔ کھانے کو کہیں نا کہیں سے چند روٹی کے ٹکڑے مل ہی جاتے۔ جس سے وہ اپنے پیٹ کی دوزخ کو بھر لیتا۔ اس نے لوگوں سے نفرت، جھڑکیاں، گالیاں ہی سنی تھیں۔ وہ محبت پیار شفقت جیسی ٹھنڈی چھاؤں کا ترسا ہوا بچہ تھا۔ اس بے درد زمانے کی جھلساتی دھوپ نے اس کی خواہشات اور اس کے معصوم ارمانوں تک کو جھلسا کر رکھ دیا تھا کہ اچانک زندگی نے اس کو ایک فرشتہ صفت بندے 'کمال دین' سے ملوا دیا۔ تب اس کو پہلی بار احساس ہوا کہ والدین کی محبت، شفقت کیا ہوتی ہے۔

اس کا کوئی نام نہیں تھا۔ کمال دین نے اس کا نام عبدالرافع رکھا۔ کمال دین بھی زمانے کے درد کا مارا ہوا انسان تھا۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ مرحوم بھائی بھاوج کی آخری نشانی اپنی بھتیجی ہی اس کی کل کائنات تھی۔ کمال دین نے اس کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ کمال دین کی محلے میں کریانے کی چھوٹی سی دکان تھی۔ تھوڑی بہت زرعی زمین بھی تھی۔ جس سے گزر بسر آسانی سے ہو جاتا تھا۔ کمال دین نے اس کو اپنے ساتھ دکان پر بٹھا لیا۔

وہ شروع سے ہی کام میں چست اور سلیقہ شعار لڑکا تھا۔ جلد ہی اس نے کمال دین کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ کمال دین کو تو اپنا دوسرا بازو مل گیا تھا۔ پھر کمال دین کی بھتیجی مناہل کو بھی اس کے ساتھ انسیت سی ہو گئی تھی۔ دوکان سے واپسی پر مناہل اس کے ساتھ صحن میں کھیلا کرتی۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے وہ جھوٹ موٹ آپس میں لڑ بھی پڑتے۔ پر رافع ہمیشہ اس کو منا لیتا۔ بچپن سے جڑا یہ تعلق ان دونوں کی نوعمری تک پیار جیسے انمول رشتے میں بندھ گیا تھا۔ اس بات کا اندازہ کمال دین کو بھی بخوبی تھا۔ وہ بھی تو یہی چاہتا تھا۔ گھر کی بچی گھر میں رہ جائے۔ وہ اپنی بھتیجی کو اپنی آنکھوں سے دور کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

زندگی آرام وسکون سے بسر ہو رہی تھی کہ اچانک ملک میں خانہ جنگی جیسی صورت حال ہو گئی۔ ہر طرف بارود، گولیاں، بم دھماکوں کی آوازیں تھیں۔ جنہوں نے لوگوں کے دن کا سکون راتوں کی نیندیں تک

چھین لیں۔ ملک دشمن عناصر جگہ جگہ سرِ عام دندنانے لگے۔ پورے ملک میں کرفیو کی صورت حال شروع ہوگئی۔ خانہ جنگی کی وجہ سے ملک میں اناج کا قحط سا پڑ گیا۔ مہنگائی آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ لوگ گھروں میں مقید ہوکر رہ گئے۔ سڑکیں سنسان ہوگئیں، بازار ویران ہوگئے۔ لوگوں کے کاروبار ٹھپ ہوگئے۔ کمال دین کو بھی مجبوراً اپنی دکان بند کرنا پڑ گئی۔ کئی لوگ قسمت آزمائی کے لیے بیرون ملک جانے لگے۔ تاکہ وہاں جاکر وہ اتنا کما سکیں کہ اپنا اور اپنے پیچھے رہ جانے والوں کا پیٹ بھر سکیں۔ کمال دین نے بھی عبدالرافع کو باہر بھیجنے کی ٹھان لی۔ تھوڑی بہت اپنی زرعی زمین کو بیچ کر اس کو اتنے پیسے تو مل ہی گئے کہ وہ اس کو ویزا حاصل کر کے بیرون ملک بھجوا سکتا تھا۔

اپنی نوعمری میں ایک بار پھر رافع اپنوں سے بچھڑ کر باہر چلا گیا۔ اس کو رخصت کرتے ہوئے کمال دین کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ مناہل بھی اس کی دوری کو لے کر افسردہ اور رنجیدہ تھی۔ رافع خود بھی کوئی کم غم زدہ نہیں تھا۔ لیکن اس کے کندھے پر ذمہ داری تھی۔ وہ ہمیشہ سے اپنے محسن کا احسان مند رہا تھا۔ وہ احسان فراموش نہیں تھا۔ وہ محنتی تھا۔ اس نے باہر جاکر اتنی محنت کی کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا۔ پانچ سالوں میں ایک ایک پائی کما کر اس نے گھر بھیجی تھی۔

☆......☆......☆

اُس دن اسٹریٹ لیمپ کے سہارے ٹیک لگائے ہوئے رافع کی ٹانگیں دکھنے لگیں۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ کو سلگا کر گہرے گہرے کش لینے لگا۔ وہ گلی میں موجود اپنے مکان کے صدر دروازے کو دیکھنے لگا۔ اس وقت تک جب اس نے سگریٹ ختم کر کے نیچے زمین پر نہ پھینک دی۔ اس نے جھک کر بیگ کو کھولا اور اس میں خوب صورت پھولوں بھرا گلدستہ باہر نکالا۔

وہ مناہل کو تحفے میں یہ گلدستہ دینا چاہتا تھا۔ مناہل کا خیال آتے ہی رافع کے لبوں پر مسکراہٹ سی اُمڈ آئی۔ گلدستہ دے کر وہ اس کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اب بھی وہ اس سے اتنا ہی پیار کرتا ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ حسین اور خوب صورت ہوگئی ہوگی۔ اتنے لمبے عرصے تک وہ اس کو دیکھ نہیں پایا تھا۔ وہ تصور میں اُس کا حسین سراپا دیکھنے لگا۔

رافع نے تو اس کو اپنے واپس آنے کی خبر تک نہیں دی تھی۔ وہ اچانک اس کے سامنے آکر اس کو حیران کر دینا چاہتا تھا۔

جب وہ اچانک اس کو اپنے سامنے دیکھے گی تو حیرانگی اور خوشی کی کیفیت میں جیسے وہ سکتے میں آجائے گی۔ اپنی حیا آلود پلکیں جھپکے گی۔ خوشی سے سرشار اس کے ہونٹ تھرتھرائیں گے۔ خوشی سے اس کی حسین آنکھوں میں آنسو آجائیں گے۔

''رافع ......تم ......! تم آگئے۔ تم نے آنے کی اطلاع بھی نہیں دی۔'' پہلے پہل وہ جھوٹ موٹ اس سے ناراض ہوکر لڑنے لگے گی۔ پھر وہ خوب صورت پھولوں والا گلدستہ اس کی طرف بڑھائے گا، تو وہ مسکرانے لگی گی۔ اور......

رافع پھولوں کا گلدستہ ہاتھ میں لیے یہی کچھ سوچتا ہوا مسکراتا رہا۔ اس نے بیگ اُٹھایا اور گھر جانے کے ارادے سے اپنے قدم بڑھائے کہ......

اس کے گھر کا بیرونی آہنی گیٹ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ اندر جلتی ہوئی لائٹ کی روشنی چھن چھن باہر گلی میں آنے لگی۔ رافع نے اپنے قدم وہیں کے وہیں رُوک لیے۔ شاید چاچا کمال دین ہوگا، اس نے خیال ظاہر کیا۔

گیٹ کھلتے ہی ایک حسین سراپا اس کے سامنے تھا۔ وہ مناہل ہی تھی۔ وہ دروازے میں کھڑی ہوکر دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ رافع کو شدید حیرانی سی ہوئی۔ وہ کس کو آخریوں دیکھ رہی ہے۔

''کیا مجھے؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔ کیا مناہل کو اس کے آنے کی خبر ہوگئی تھی۔ لیکن کیسے......!

وہ شش و پنج میں تھا۔ جلد ہی اس نے اپنے خیالات کی نفی کر دی۔

''نہیں اس کو میرے آنے کی اطلاع کیسے ہوسکتی ہے۔'' وہ بغور گیٹ میں کھڑی مناہل کو تکنے لگا۔

ایک دم ہی اس نے اپنا چہرہ نیچے کرلیا۔ اسے لگا مناہل اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مبادا کہیں مناہل اس کو یوں گلی کے نکڑ پر کھڑا ہوئے دیکھ کر پہچان لے اور اس کا بغیر اطلاع دیے آنے کا سرپرائز سرپرائز نہ رہے۔

جلد ہی گیٹ دوبارہ بند ہوگیا۔ رافع نے چہرہ اُٹھا کر اس جانب دوبارہ دیکھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ مناہل شاید دروازہ بند کر کے اندر گھر میں جا چکی تھی۔ اچانک اس کو یوں محسوس ہوا کہ وہاں کوئی تھا۔ کوئی انسانی ہیولا جو اس کے گھر کے آہنی گیٹ سے تھوڑی دور دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ رافع اندھیرے کی وجہ سے بغور دیکھ نہیں پایا کہ آخر وہ کون ہے۔ وہ چونک پڑا۔

''یہ کون ہے؟'' وہ کافی وقت سے گلی کے نکڑ پر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے گلی میں کسی اور کو آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ شام رات میں تبدیل ہو چکی تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ گلی میں موجود تمام گھروں کے دروازے بند تھے۔ تو یہ آخر کون ہے۔ کیا یہ اس کے گھر سے باہر نکلا تھا۔ کوئی اجنبی نا آشنا...... اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہ سکا۔ اس کے دماغ پر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔

وہ ہیولا احتیاط سے نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب سے گزر گیا۔ مگر یکدم ہی وہ ٹھٹک کر اپنی جگہ رُک سا گیا۔ رافع نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ اس کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ آدمی واپس قدم اٹھاتے ہوئے اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

''او...... رافع...... تم...... ! یہاں...... !!...... تم ...... تم یہاں کیسے؟'' وہ آدمی اس کو وہاں کھڑا دیکھ کر ایسے گڑبڑا گیا۔ جیسے کسی نے اس کو چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔ رافع نے اس پر اچٹتی نگاہ ڈالی۔ جیسے وہ اس آدمی کو پہچان نا پا رہا ہو۔ یا پھر وہ اس کو پہچاننا ہی نہ چاہتا ہو۔

''رافع...... تم کب لوٹے۔ تم تو باہر گئے ہوئے تھے ناں۔'' وہ آدمی بات کرتے ہوئے اس سے پوچھنے لگا۔ مگر رافع خاموش رہا۔ اس کا انداز بالکل اجنبیوں کا سا تھا۔ اس آدمی نے بھی یہ بات محسوس کی۔

''تم...... تم...... مجھے بھول گئے۔ ارے میں سعید ہوں۔ تم اتنی جلدی مجھے بھول گئے۔ ہم اس محلے میں تو اکٹھے رہتے تھے۔ تم نے اچھا کیا جو باہر چلے گئے۔ بعد میں تو ملک کے حالات اور بھی خراب ہو گئے تھے۔ قتل و غارت کے ساتھ اناج کی قلت لوگ بھوکے مرنے لگے تھے۔

اب کچھ عرصہ گزرا ہے حالات کچھ نارمل ہوئے ہیں۔ خانہ جنگی بھی ختم ہوگئی ہے۔'' وہ آدمی بہت باتونی تھا۔ وہ ایک بار جو بولنا شروع ہوا تو چپ ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ آدمی بے تکان بولتا گیا۔

مگر رافع ایک لفظ نہیں بولا۔ اس کا رویہ سرد تھا۔ منہ میں کوئی شے چباتے ہوئے وہ آدمی بات کرتے وقت مسلسل ایک طرف زمین پر تھوک رہا تھا۔

''تم...... پان کھا رہے ہو کیا؟'' رافع سے آخر رہا نہ گیا اس نے اس آدمی سے پوچھ ہی لیا۔ اس آدمی کا یوں بار بار تھوکنا اس کو نہایت ناگوار گزر رہا تھا۔

''ہاں...... پان ہی کھا رہا ہوں۔ تم کو تو علم ہی ہے۔ پان کھانے کا شوق مجھے بچپن سے تھا۔ اس کے بغیر تو اب رہا بھی نہیں جا سکتا۔ ہوں تم کو میرا یوں پان تھوکنا برا لگا۔'' وہ آدمی اس سے پوچھنے لگا۔ مگر رافع نے کوئی بات نہیں کی اور وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''معاف کرنا...... مجھے پتا ہے تم کو پان کھانا پسند نہیں ہے۔'' اس آدمی نے پان کی گلوری منہ سے نکال کر باہر پھینک دی۔

تھوڑی دیر ان دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ ایک سرد خاموشی...... پھر وہ آدمی اپنی جیبوں میں ہاتھ مارنے لگ گیا۔

''اوہ! سگریٹ کی ڈبیا تو میں وہیں بھول آیا۔'' وہ منہ میں بڑبڑایا۔ مگر رافع نے اس کی آواز بخوبی سن لی۔

''تمہارے پاس سگریٹ ہوگی۔ وہ دراصل پان کھانے کے بعد میں سگریٹ لازمی پیتا ہوں۔ اگر تم کو

برا نہ لگے تو۔"

طوہاً کرہاً رافع نے جیب میں سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ اس آدمی نے سگریٹ کی ڈبیا کی طرف دیکھا۔

"اوہ! یار...... تم یہ عام سی سگریٹ پیتے ہو۔ اس سگریٹ کا پینا نا پینا ایک بات ہے۔" اس آدمی نے واپس ڈبیا اس کی طرف بڑھا دی۔

تم کبھی گولڈن اینڈ بلیک سگریٹ پی کر دیکھنا۔ اس کے پینے سے ایک سرور سا آجاتا ہے۔ میں وہی سگریٹ پیتا ہوں۔

"گولڈن اینڈ بلیک۔" رافع زیرلب بولا۔ اور اپنی سگریٹ کی ڈبیا کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے نجانے کیوں غور سے اس کو دیکھنے لگ گیا۔

رافع کو عجیب سی مسحور کن خوشبو کا احساس ہوا۔ اس کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ خوشبو اس کی سگریٹ کی ڈبیا سے آ رہی ہے۔ وہ اس سگریٹ کی ڈبیا کو ناک کے سامنے لا کر سونگھنے لگا۔

"کیسی دلفریب خوشبو ہے۔" وہ بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہاں......" وہ آدمی مسکرا اٹھا۔

"مگر یہ تمہاری اس ڈبیا سے نہیں بلکہ مجھ سے آ رہی ہے۔" اس آدمی کی بات پر رافع نے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ اس خوشبو کا کمال ہے۔ ایک وجود سے دوسرے وجود میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی تھوڑی دیر تک قریب رہے تو......" رافع نے بنا کوئی بات کہے سگریٹ کی ڈبیا واپس جیب میں ڈال لی۔

"تم یہاں کب سے کھڑے ہو؟" وہ آدمی دوبارہ اس سے گویا ہوا۔

"تم کو اپنے گھر چلے جانا چاہیے۔ رات بیت چکی ہے۔" رافع نے جیسے اسے وہاں سے بھگانا چاہا۔

"چاچا کمال دین تو یہاں موجود نہیں ہے۔" وہ آدمی یہ بتا کر اچانک ہی چپ ہو گیا۔ جیسے کوئی غلط بات اس کے منہ سے نکل گئی ہو۔ رافع نے ایک بار پھر عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ...... وہ صبح چاچا کمال دین مجھے ملا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی کام سے دوسرے شہر جا رہا ہے۔ رات گئے لوٹے گا۔"

رافع بنے کچھ بولے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گلدستے کو زور زور سے مسلنے لگا۔ اور پھر اس نے گلدستہ زور سے زمین پر دے مارا۔

"اوہ! یقیناً یہ گلدستہ تم کسی کے لیے لائے تھے مگر تم نے اس کو مسل کر پھینک کیوں دیا؟" اس آدمی کے چہرے پر حیرانگی کے آثار تھے۔

رافع کو اب وہاں کھڑے رہنا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے بیگ اٹھایا اور جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا نا چاہتے ہوئے بھی اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ گلی کی نکڑ سے گھر تک کا فاصلہ اس کو کئی میلوں کا لگا۔ آہنی گیٹ پر پہنچ کر اس نے کپکپاتے ہاتھ کے ساتھ اطلاعی گھنٹی بجائی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہی گیٹ آہستگی سے کھل گیا۔ مناہل اس کے سامنے تھی۔

رافع اب بہت قریب سے اس کا سراپا دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے تصور سے بھی زیادہ حسین و خوبصورت تھی۔ مگر اب وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ وہ نظریں چرانے لگا۔

مناہل چند لمحے سکتے کے عالم میں بغیر اپنی پلکیں جھپکائے ہوئے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے تیزی کے ساتھ اپنی حسین آنکھیں جھپکیں، جیسے وہ اب ہوش میں آ گئی تھی۔ وہ چلا اٹھی۔

"رافع تم...... یوں اچانک......! میں جاگتی آنکھوں سے کہیں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی۔ تم نے اپنے آنے کی کوئی اطلاع ہی نہیں دی۔" وہ ایک ہی سانس میں سارے سوال اس سے پوچھ بیٹھی۔ وہ بڑی خوش دکھائی دے رہی تھی۔ رافع کو یہ سب خوشی مصنوعی پن بناوٹ سی لگی۔

"اگر اطلاع دے دیتا تو اصل حقیقت سے پردہ فاش نہ ہوتا۔" وہ سرد لہجے میں بولا اور اندر آ گیا۔

"کیا مطلب؟" مناہل چونک پڑی۔

"میں کافی دیر سے گلی کی نکڑ پر کھڑا ہوا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ تم شاید سو رہی ہو۔ مگر تم جاگ رہی تھیں۔

تم نے ایک بار پہلے بھی دروازہ کھولا تھا۔'' وہ آہستگی سے بولا۔ اس کے لہجے میں دکھ نمایاں تھا۔

'اوہ تو...... تم باہر کیوں کھڑے رہے ہو۔ تم نے خوامخواہ کی اذیت سہی ہے۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ تم کو کسی کی اجازت کی ضرورت تھوڑی تھی۔'' مناہل اس کا بیگ اٹھا کے اندر کمرے میں لے آئی۔ وہ مردہ قدموں سے چلتا ہوا اس کے پہلے کمرے میں آن موجود تھا۔ اور چارپائی پر جا بیٹھا۔

'' چاچا کمال شاید دوسرے شہر گیا ہوا ہے۔ گھر میں نہیں ہے وہ...... وہ بظاہر اس سے پوچھ رہا تھا۔ حالانکہ اس حقیقت کا پتا اس کو خود تھا۔ مناہل نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ پوچھنا چاہ رہی ہو کہ تم کو کیسے معلوم ہوا۔ یہ واقعی سچ تھا۔

'' ہاں...... چاچا دوسرے شہر گیا ہوا ہے۔ کہتا تھا شام ہونے سے پہلے لوٹ آؤں گا۔ ابھی تک آیا نہیں۔ مجھے فکر ہو رہی تھی۔ ایک بار گلی میں بھی جھانک آئی ہوں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

'' مگر تم کو کیسے پتا چلا......؟'' وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

معقول جواب تھا۔ وہ افسردگی سے گویا ہوا۔ اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ وہ اس شکست خوردہ کسی سپاہی کی طرح لگ رہا تھا۔ جس کو کسی محاذ پر ہار کا سامنا کرنا پڑ گیا ہو۔ وہ کافی دیر اپنے جوتے سے فرش پر لکیریں بنانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

'' رافع تم بہت بجھے بجھے پریشان دکھائی دے رہے ہو۔'' وہ اس کے قریب آن بیٹھی۔

'' کیا بات ہے مجھے نہیں بتاؤ گے۔ اتنے سالوں بعد لوٹ کر آئے ہو۔ بالکل اجنبیوں جیسا رویہ ہو گیا ہے تمہارا۔ تم پہلے والے رافع نہیں رہے۔ اتنے سالوں میں تم بہت بدل گئے ہو۔'' رافع نے نظریں اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

'' ہاں واقعی بہت کچھ بدل گیا ہے۔'' وہ نظریں اُٹھا کر سامنے والی دیوار کی طرف دیکھنے لگا جہاں پان کے تھوکنے کے بہت سارے نشانات نظر آ رہے تھے۔ وہ کافی دیر ان نشانات کی طرف دیکھتا رہا کہ اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ مناہل نے اس کی حد نگاہ نوٹ کی۔

'' تم شاید پان کے ان نشانات کو دیکھ کر کوفت محسوس کر رہے ہو۔ وہ مبح محلے کی بوا رقیہ آئی ہوئی تھیں۔ ان کی عادت ہے پان بے تحاشا کھاتی ہے۔ اور جگہ جگہ تھوکتی رہتی ہیں۔''

'' میں نے تم سے کوئی سوال تو نہیں کیا تھا۔ تم خوامخواہ کا جواب گھڑنے لگ گئی ہو۔'' وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ تلخی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

'' میں تو بس یونہی......'' وہ اس سے نظریں چرانے لگی۔

'' تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ میرے خیال میں تم کو آرام کی ضرورت ہے۔ سفر نے تمہارے ذہن پر برا اثر ڈالا ہے۔ تم حد سے زیادہ بے مقصد سوچنے لگ گئے ہو۔ میں تمہارے لیے تکیہ لے کر آتی ہوں۔'' وہ سامنے پڑی چارپائی سے تکیہ اٹھا لائی۔ رافع اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ تکیہ اٹھانے پر چارپائی کے سرہانے اس کو سگریٹ کی ڈبیا نظر آئی۔ 'گولڈ اینڈ بلیک' مناہل کی بھی سگریٹ کی ڈبیا پر نظر پڑی مگر وہ کچھ بولی نہیں۔ چپ رہی۔

'' یہ سگریٹ کی ڈبیا کس کی ہے۔'' وہ بمشکل بولا۔ الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

'' یہ سگریٹ کی ڈبیا...... میری تھوڑی ہی ہے۔ میں بھلا کوئی سگریٹ پیتی ہوں۔'' وہ بولی اور خود ہی قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔

رافع اس کا منہ تکنے لگا۔ وہ کچھ دیر خوامخواہ ہنستی رہی۔ پھر مناہل اس کو سنجیدہ دیکھ کر یکدم ہی چپ ہو گئی۔

'' تم تو اس کو دیکھ کر یوں پریشان ہو گئے جیسے کوئی سگریٹ نہیں بم دیکھ لیا ہو۔ چاچا سگریٹ پیتے ہیں تو ظاہر ہے ان کی ہی ہو گی۔'' وہ لاپروائی سے بولی۔ وہ بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔

'' چاچا کمال دین سگریٹ کب سے پینے لگا۔ وہ تو حقہ پیتا تھا۔'' وہ اس کی کہی ہوئی بات کی نفی کرنا چاہتا تھا۔

'' ہاں...... مگر چاچا اب سگریٹ پینے لگا ہے۔'' وہ اس طرح بولی جیسے اس سوال جواب سے جان

چھڑانا چاہتی ہو۔ اس کے چہرے پر بے زاری کے تاثرات اُمڈ آئے تھے۔

''تم رافع بالکل پولیس والوں کی طرح سوال جواب کرنے لگ گئے ہو۔ مجھے لگ رہا ہے کہ تم میرے اور اپنے درمیان خوامخواہ اجنبیت کی دیوار کھڑی کرنا چاہتے ہو۔'' وہ اس کے دوبارہ قریب آن بیٹھی۔ رافع کو چپ لگ گئی تھی۔

''تمہاری یہ بے اعتنائی، تمہارا یہ سرد رویہ میرے لیے بڑا جان لیوا ہے۔ بولو...... جواب دو...... آخر تم کو ہو کیا گیا ہے۔''

''تم...... تم......'' رافع بمشکل بول سکا۔ الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ ''مناہل تم اعتراف کرلو کہ تم کسی اور سے محبت کرنے لگی ہو۔'' اس کے دل میں طوفان مچانے والی یہ بات آخر اس کی زبان تک آ ہی گئی۔

''یہ...... یہ...... کیا کہہ رہے ہو۔'' مناہل ہکلانے لگی۔

''حقیقت کبھی مٹ نہیں سکتی۔ مناہل...... اور یہ حقیقت ہے کہ تم کو اب میری ضرورت نہیں رہی۔ تم...... تم کسی اور کو دل دے بیٹھی ہو۔'' وہ ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا کر سسک پڑا۔

''رافع تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ آخر تم کو کیا ہو گیا ہے۔ تم اس طرح کیوں سوچ رہے ہو۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی۔'' وہ بے تابی سے بولی۔

''کیوں ایسی باتیں کر کے اپنے ساتھ مجھے بھی میری ہی نظروں میں گرا رہے ہو۔''

مناہل نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ مگر اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ مناہل اس کو دیکھتی رہ گئی۔

''میں...... میں...... واقعی اپنی نظروں میں بہت گر چکا ہوں۔ شاید اب کبھی اٹھ نا پاؤں۔'' وہ غم میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تم مناہل سچ سچ بتا دو۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہاری زندگی سے دور چلا جاؤں گا۔ پھر لوٹ کر نہیں آؤں گا۔''

''رافع میں صرف تم سے محبت کرتی ہوں۔ تم میرا یقین......'' مناہل اس کو سمجھانا چاہ رہی تھی کہ رافع نے

اندازِ معذرت

محکمہ ٹیلیفون کے ڈائریکٹر نے ایک شخص کو فون پر اطلاع دی۔ ''جناب! کل شام آپ نے ہمارے آپریٹر سے سخت بدتمیزی کی تھی، اس لیے آپ اس سے معذرت نہیں کریں گے تو آپ کا ٹیلیفون منقطع کر دیا جائے گا۔''

اس شخص نے معذرت کا وعدہ کرلیا اور فون ملا کر آپریٹر سے بولا۔ ''کل میں نے آپ سے یہی کہا تھا ناں کہ آپ جہنم میں جائیں۔''

آپریٹر نے اس کی تائید کی تو وہ شخص دوبارہ بولا۔ ''تو اب میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں، پلیز آپ جہنم میں نہ جائیں۔''

مرسلہ: بخش شکور۔ ٹنڈو الہ یار

اس کی بات کاٹ دی۔

''تم کو پتا ہے مناہل مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔ تم جھوٹ پر جھوٹ بول کر خود کو سچا اور بے گناہ ثابت نہیں کر سکتی ہو۔'' تم مجھ سے نہیں بلکہ اس شخص سے محبت کرتی ہو۔ جو راتوں کو چھپ کر تم سے ملنے آتا ہے۔ میں نے آج خود اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اب تم اس کو بھی جھوٹ کہو گی۔'' اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ وہ پاگل جنونی سا لگ رہا تھا۔

مناہل نے ترحم آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ خود بھی پریشان، خوف زدہ سی دکھنے لگی تھی۔

''رافع تمہاری طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔ تم خوامخواہ کے وہم اپنے ذہن میں پیدا نہ کرو۔ ایسا کچھ بھی نہیں۔ میری بات کا یقین کرو۔'' رافع نے اس کے معصوم چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کو لگا جیسے اس حسین معصوم چہرے کے پیچھے منافقت، جھوٹ چھپا ہوا ہے۔ ایک دم ہی اس کو اپنے پاس سے عجیب سی خوشبو کا احساس ہوا۔

''یہ خوشبو...... یہ...... تمہارے پاس سے آ رہی ہے؟'' مناہل کچھ دیر اس کے چہرے کی طرف

دیکھتی رہی پھر ٹھوس لہجے میں بولی۔

"ہاں...... اچھی ہے ناں...... چند دن ہوئے میری پڑوس والی دوست نے مجھے گفٹ کے طور پر یہ پرفیوم دیا تھا۔ اس خوشبو کی یہ خصوصیت ہے کہ قریب بیٹھے ہوئے دوسرے بندے میں بھی منتقل ہو جاتی ہے۔" اپنی بات پوری کرتے ہی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"میرا خیال ہے تمہارے لیے میں اچھی سی چائے بنا لاؤں۔ شاید اس سے تمہاری تھکن اور ذہن پر چھایا جمود ختم ہو جائے۔" وہ بنا اس کے جواب کا انتظار کیے کمرے سے باہر نکل گئی۔ رافع اس کو جاتے دیکھتا رہا۔ اس کے دماغ میں تیز آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا۔ وہ بے مقصد خلاؤں میں اس وقت تک گھورتا رہا جب تک مناہل واپس اس کے پاس نہ آ گئی۔ اس کو اپنے اردگرد کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ ہوش تب آیا جب وہ اس کے سامنے چائے کا کپ لیے ہوئے موجود تھی۔

وہ اس کے ہاتھ سے بنا چائے کا کپ لیے مناہل کے چہرے کی طرف دوبارہ دیکھنے لگا۔ پھر وہ ایک دم ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ چائے کا کپ ہاتھ میں تھامے بس اس کو دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اس کے کھلے بکھرے ہوئے بالوں کو درست کرنے لگا۔

"مناہل...... کاش تم یہ جان پاتیں کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ دیارِ غیر میں رہنے کے باوجود میں ایک پل بھی تم کو نہیں بھول پایا تھا۔ اور اب میں لوٹا تھا ناں۔" رافع کی آنکھیں پھر بھیگنے لگیں۔

"صرف تمہارے لیے۔" مناہل اس کی باتیں سننے لگی۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔

"اس لیے میں نے ابھی ابھی یہ فیصلہ کیا ہے۔" وہ اٹک رہا تھا۔ "کہ اگر تم میری نہیں ہو سکتی ہو تو میں تم کو کسی اور کا بھی نہیں ہونے دوں گا۔" اچانک اس کا لہجہ پہاڑ جیسا سخت ہو گیا تھا۔

عبدالرافع نے اس کے گلے میں جھولتے ہوئے دوپٹے کو ایک گرہ لگا کر پھندا سا بنا لیا۔ مناہل کی آنکھوں میں سوالیہ نشان تھا۔ وہ ابھی کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ آخر کیا کرنے جا رہا ہے۔ رافع نے ایک جھٹکے میں اس دوپٹے سے بنے ہوئے پھندے کو اس کی گردن میں کس دیا۔ گردن پر دباؤ پڑا تو مناہل کی آنکھیں اُبلنے لگیں۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر بے سود وہ دوپٹے سے بنے ہوئے پھندے کو مزید کستا جا رہا تھا۔ مناہل نے ایک طرف بھاگنے کی کوشش کی۔

وہ کچھ بولنا چاہ رہی تھی۔ مگر تکلیف کی وجہ سے بول نہیں پا رہی تھی۔ جان نکلنے کی اذیت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں، کراہیں نکلنے لگیں۔ وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ رافع کو اس پر کوئی رحم نہیں آیا۔

وہ اس وقت تک اس کا گلا دوپٹے سے کستا رہا جب تک مناہل نے تھک ہار کر اپنی جان نہ دے دی۔ آن کی آن میں وہ کسی ریت کی دیوار کی طرح نیچے فرش پر جا پڑی۔ وہ مر چکی تھی۔

"اب تم ہمیشہ میری رہو گی مناہل۔ تم کو اب مجھ سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔" وہ نیچے فرش پر پڑی مناہل کے مردہ وجود کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا۔

رافع کو یکدم ہی محسوس ہوا کہ اس کا دل بیٹھنے لگا ہے۔ گھر کی چار دیواری میں انجانی سی گھٹن کا احساس ہوا۔ وہ مزید مناہل کے مردہ وجود کے ساتھ وہاں کھڑا نہیں رہنا چاہ رہا تھا۔ اچانک اس کو احساس ہوا کہ اس کے ہاتھوں قتل جیسا فعل سرزد ہو گیا ہے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ گھٹن کا احساس مزید بڑھنے لگا۔ اس سے رہا نہ گیا وہ تقریباً بھاگتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ گلی سے ہوتا ہوا وہ دائیں طرف بنی ہوئی کھلی سڑک پر آ گیا۔ وہ لمبے لمبے گہرے سانس لینے لگا۔ مگر گھٹن تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ رات بہت بیت چکی تھی۔ دور اس کو سڑک کے ایک طرف کوئی بندہ نظر آیا، جو موبائل پر کسی کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ رافع کو اس بندے سے کوئی سروکار نہیں تھا مگر وہ بلا ارادہ اس کی جانب چل پڑا۔ وہ بندے کی پشت رافع کو نظر آ رہی تھی۔ رافع آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ یکدم اس کو محسوس ہوا کہ یہ وہی آدمی ہے۔ جس نے اس کی

محبت میں نقب لگانے کی کوشش کی تھی۔ شدید غم و غصے کا احساس رافع کے اعصاب ایک بار پھر جواب دینے لگے۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر خون اُتر آیا۔

موبائل پر باتیں کرتے اس آدمی کو لگا جیسے اس کے پیچھے کوئی کھڑا ہے۔ رافع کو اپنے پیچھے کھڑا دیکھ کر وہ آدمی بری طرح گھبرا گیا۔ وہ شدید خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس کو یقین نہیں تھا کہ وہ اس طرح اس کے پیچھے آ جائے گا۔

''اوہ...... رافع تم کو سب پتا چل گیا۔'' وہ آدمی ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ دیکھنے کے لائق تھا۔ رافع غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ سڑک چاروں طرف سنسان خاموش سی تھی، سوائے اس نسوانی آواز کے جو اس آدمی کے موبائل سے آ رہی تھی۔ وہ اس کو مارنے کے لیے آگے بڑھا مگر موبائل سے نسوانی آواز کو سنتے ہی ٹھٹک کر اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

رافع کو پتا چلا کہ وہ کسی لڑکی سے اس وقت خوش گپیوں میں مصروف تھا۔

یہ...... یہ کس کی آواز ہے؟ کیا یہ مناہل سے باتیں کر رہا تھا۔ مگر...... نہیں مناہل کو تو وہ خود اپنے ہاتھوں سے مار کر آ رہا تھا، یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ اس گتھی کو سلجھانا چاہتا تھا۔

''تم اس وقت موبائل پر کس سے باتیں کر رہے تھے۔'' رافع دھاڑا۔

''وہ...... وہ۔'' وہ آدمی بوکھلاہٹ کا شکار تھا۔ ''عارفہ...... سے۔''

''عارفہ...... کون عارفہ؟''

''تایا رحیم بخش کی بیٹی۔ جس کا مکان تمہارے گھر کے بالکل ساتھ ہے۔'' رافع کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ وہ آدمی کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

''اچھا، جب تم کو سب پتا ہی چل گیا ہے تو تم سے چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دراصل میں اور عارفہ شروع دن سے ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ مگر عارفہ کے والدین مجھے پسند نہیں کرتے۔ اس لیے ہم کبھی کبھار چھپ کر ایک دوسرے سے مل لیتے ہیں۔ آج میں عارفہ سے ملنے اس کے گھر گیا۔ ہم صحن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مگر کمرے میں سوئے تایا رحیم بخش کی آنکھ کھل گئی۔ پکڑے جانے کے خوف کی وجہ سے میں صحن کی بیرونی چھوٹی دیوار پھلانگ کر بھاگ آیا تھا۔ پھر تم سے ملاقات ہو گئی۔ تم سے درخواست ہے کہ تم یہ بات کسی کو نہ بتانا۔''

رافع یقین بے یقینی کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ آدمی مزید بھی کچھ بولے جا رہا تھا۔ مگر اب اس کی آواز رافع کو سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک شور تھا جو اس کے کانوں میں تیز تیز ہوتا جا رہا تھا۔ رافع کا دل چاہا کہ دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر اپنی جان دے دے۔ دل میں سلگتی ہوئی شک کی آگ سے وہ اپنا سب کچھ ہی جلا کر رکھ بیٹھا تھا۔

''ہاں میں پاپی ہوں۔ میں نے پاپ کیا ہے۔ میں نے اپنی مناہل کو مار ڈالا۔'' وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ کبھی سر پر خاک ڈالنے لگتا اور کبھی منہ کو طمانچے مار مار کر پیٹ ڈالتا۔ لوگ پچھلے پندرہ سال سے اس تماشے کو دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ مناہل کو کوئی مردہ نہ سمجھتا تھا۔ چاچا کمال دین شہر گیا تو وہیں پر روڈ ایکسیڈنٹ میں مارا گیا تھا۔ رافع راتوں رات مناہل کو واپس پردیس لے گیا تھا۔ ساری دنیا یہی حقیقت جانتی تھی لیکن اُس رات! پانچ مئی کی رات کو ہونے والا خونی ڈرامہ کوئی نہیں جانتا تھا

رافع نے مکان فروخت نہ ہونے دیا تھا۔ آخر اس مکان میں اس کی مناہل دفن تھی۔

ہاں پورے دو سال بعد سے رافع یہاں آتا تھا اور پانچ مئی کے دن مکان کے باہر گلی کے نکڑ پر موجود اسٹریٹ لیمپ سے ٹیک لگا کر روتا تھا۔ دیوانہ وار روتا تھا۔ اور شاید تادم مرگ! اُس نے یہی کرنا ہے۔ یادوں سے پیچھا چھڑانا آسان تھوڑی ہوتا ہے اور جو آسان ہو وہ عشق کہاں...... وہ تو سودا ہوتا ہے۔ اُس کے عشق نے شک سے دھوکا کھایا تھا مگر اب شک مر کر عشق زندہ ہو گیا تھا۔

☆☆......☆☆

تیسری سچ بیانی

ارم ناز

اعلیٰ سوسائٹی میں جا کر بھی اپنے اصل سے پیچھا نہ چھڑا سکنے والی دوشیزہ کی داستانِ عجب، کراچی سے

میں ہانیہ صدیقی امیر کبیر صدیقی ملز کے مالک اشرف صدیقی کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ بہترین اسکول کالج سے اعلیٰ تعلیم یافتہ، خوبصورتی میں بے مثال۔ بیش بہا قیمتی کار میں گھومتی، لاکھوں اپنے دوستوں پر لٹاتی، شہر کے بہترین ہوٹلوں میں کھانا کھاتی۔ نہ کوئی غم، نہ کوئی فکر مگر نجانے کیوں کہیں کچرے کا ڈھیر دیکھتی تو بے چین ہو جاتی۔

دل کرتا لمبی لکڑی لے کر کچرے کو الٹ پلٹ کروں۔ اس میں سے کام کی چیزیں الگ کروں۔ اس کچرے کی بُو مجھے پرفیوم سے زیادہ اچھی لگتی مگر میں اس خواہش کو اپنے اندر دبا لیتی اور سوچتی یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ کیا مجھ پر کوئی آسیب سوار ہو گیا ہے؟

بچپن میں تو یہ سوچ مجھ پر کم ہی حملہ آور ہوتی تھی، مگر جوانی کی دہلیز تک پہنچتے پہنچتے یہ خواہش زور پکڑتی جا رہی تھی۔ کیا مجھے کوئی نفسیاتی بیماری ہے؟ کیا مجھے کسی ماہر نفسیات سے مشورہ کرنا چاہیے؟

جتنا بھی سوچتی دماغ اتنا ہی ماؤف ہوتا اور سوچتے سوچتے مجھے اپنا سر درد سے پھٹتا محسوس ہوتا۔ میں نے اس مسئلے کو کبھی مما پاپا سے ڈسکس نہیں کیا تھا اور میں انہیں کیا بتاتی کہ میں کچرے کا ڈھیر دیکھ کر خوش ہوتی ہوں۔ کچرا میرے اندر انوکھے احساسات پیدا کر دیتا ہے۔ میں اپنی سوچوں میں خود ہی الجھتی رہتی۔

☆......☆......☆

اور پھر میری زندگی نے ایک نیا موڑ لیا۔ مما پاپا نے میرے لیے اپنے ہی حلقہ احباب میں سے ایک لڑکا پسند کیا، نعمان ملک۔ نعمان ملک ایک وجیہہ شخص تھے۔ ان کے والد فوت ہو چکے تھے۔ ان کی امی اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ کینیڈا میں رہتی تھیں۔ شاید میرے والدین نے یہی سوچا ہوگا کہ ساس نندوں کے جھنجھٹ سے دور، ان کی اکلوتی بیٹی راج کرے گی۔ منگنی کے بعد میری نعمان سے دوستی بھی ہو گئی تھی اور ہم دونوں اکثر ساتھ ساتھ رہتے۔ کبھی ڈنر پہ تو کبھی لونگ ڈرائیو پہ۔ نعمان جادوئی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ میرے کہے بغیر ہی شاید میرے دل کا حال جان لیا کرتے تھے۔ مجھے لگتا تھا ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں۔

☆......☆......☆

کچھ عرصے بعد نعمان سے میری شادی ہو گئی۔ ہم ہنی مون کے لیے کینیڈا چلے گئے۔ ایک ماہ بعد جب ہم واپس پاکستان آئے تو بقول مما کے میں اور بھی خوبصورت ہو گئی تھی۔ دن یونہی ہنسی خوشی گزر رہے تھے۔ اور پھر وقت جیسے پر لگا کر اڑنے لگا۔ اب میں دو بچوں کی ماں تھی، ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ ممتا کے جذبے سے سرشار سارا دن بچوں کے کام میں مگن رہتی۔ ان کا بہت خیال رکھتی۔ نعمان کی مجھ سے محبت پہلے سے بھی دوچند ہو گئی تھی کیوں کہ میں اب ان کی محبوب بیوی ہونے

کے ساتھ ساتھ ان کے بچوں کی پیاری ماں بھی تھی۔

☆......☆......☆

بچے اب اسکول جانے لگے تھے۔ نعمان صبح آفس چلے جاتے اور بچوں کے اسکول چلے جانے کے بعد فراغت ہی فراغت تھی۔ اس فراغت میں پھر وہی کچرا کریدنے کی سوچ مجھ پر حملہ آور ہو جاتی۔ میں جتنا اس سوچ کو جھٹکنے کی کوشش کرتی یہ اتنی ہی شدید سے شدید تر ہو جاتی۔ کوئی مجھے اندر سے اکساتا کہ کچرے کے قریب جاؤ۔ جیسے کچرے کی خوشبو مجھے اپنی جانب کھینچتی ہوئی محسوس ہوتی۔

جب ملازمہ کچن میں مصروف ہو جاتی، تو میں ڈسٹ بن لے کر بنگلے کے پچھلے حصے میں چلی جاتی۔ ڈسٹ بن الٹ کر میں سارا کچرا پھیلا دیتی اور ایک لکڑی پکڑ کر اسے الٹ پلٹ کرتی۔ اس میں سے کچھ چیزیں الگ کرتی اور تھیلی میں باندھ کر ایک طرف رکھ دیتی۔ اور جب تک موقع ملتا میں کچرے کی بُو کو لمبی سانس لے کر اپنے اندر جذب کرتی۔ میں کئی گھنٹے یہ عمل کرتی۔

کچھ دنوں سے میرا دل مجھے مسلسل اکسا رہا تھا کہ اپنے گھر کے علاوہ کچرا کسی اور گھر کا بھی ہو۔ اب اپنے گھر کے کچرے سے مجھے بیزاری محسوس ہو رہی تھی اور کچرے کے اس مزے دار کھیل میں مزا نہیں آ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ خواہش اتنی شدت اختیار کر گئی کہ میں برابر والے بنگلے کا ڈسٹ بن نظر بچا کر اٹھا کر لے آتی۔ پھر وہی کھیل۔ سارے کچرے میں سے میں نے کافی سامان تھیلیاں باندھ باندھ کر اکٹھا کر لیا تھا۔ یہ تھیلیاں مجھے زندگی بھر کی کمائی کی طرح عزیز تھیں۔

☆......☆......☆

کئی دنوں سے نعمان کہہ رہے تھے کہ چھٹی کے دن مالی بابا سے اپنی نگرانی میں بنگلے کے پچھلے حصے میں کچھ پودے لگواؤں گا۔

اتوار کی دوپہر میں کچن میں کچھ کام کر رہی تھی اچانک مجھے باہر سے نعمان کی آواز آئی۔ وہ چوکیدار کو بری طرح ڈانٹ رہے تھے۔ میں باہر نکلی اور پوچھا "کیا ہوا! کیوں

بچارے کو ڈانٹ رہے ہیں۔" نعمان کہنے لگے۔

"یہ سارا دن گیٹ پر رہتا ہے یا ادھر اُدھر گھومتا رہتا ہے۔ دیکھو بنگلے کے پچھلے حصے میں کسی نے کچرے کے تھیلے باندھ کر رکھے ہیں۔ ضرور اس چوکیدار کی غیر موجودگی میں کوئی کچرا چننے والا یا کوئی فقیر یہاں اپنا سامان رکھ کر جاتا ہے۔ اس طرح تو چور ڈاکو با آسانی گھر میں گھس کر صفایا کر سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر نعمان وہ کچرے کی تھیلیاں اٹھا کر باہر والے ڈسٹ بن میں ڈال آئے، میں بھی اندر آ گئی۔

نعمان جب مالی سے کام مکمل کروا کر واپس آئے تو میں نے ان سے کہا کہ آپ غسل کر لیں۔ میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔"

نعمان باتھ روم میں گھس گئے۔ میں نے جب اطمینان کر لیا کہ نعمان نہا رہے ہیں تو میں باہر گئی، چوکیدار بیٹھا تھا۔ میں نے اسے پیسے دے کر کہا کہ ذرا سامنے مارکیٹ سے جا کر فروٹ لے آؤ۔"

وہ فروٹ لینے چلا گیا۔ میں اسے جاتا دیکھتی رہی۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی میں وہ کچرے کی تھیلیاں، اپنی اتنے دن کی محنت ڈسٹ بن سے نکال لائی اور اسٹور روم میں حفاظت سے چھپا دیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرا خزانہ لٹنے سے بچ گیا ہے۔

اب میں بہت زیادہ احتیاط کرنے لگی تھی کہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے اور نعمان کی نظر کبھی بھی میری اس متاع پر نہ پڑے۔

میں بہت بے بس تھی۔ لاکھ کوششوں کے باوجود بھی میں اپنی اس عجیب عادت سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہی تھی۔ اب میں کچرا چننے کی یہ سرگرمی رات میں انجام دینے لگی تھی۔ اس وقت جب میں اطمینان کر لیتی کہ نعمان اور بچے سو گئے ہیں تو میں گھر سے باہر آتی۔

کچھ دنوں سے میں یہ محسوس کر رہی تھی جیسے مجھے کوئی دیکھ رہا ہے۔ مگر میں اپنے اس انوکھے نشے سے دور نہیں جا سکتی تھی۔ میں بہت روتی۔ خدا سے بہت دعائیں مانگتی اور اپنے آپ سے عہد کرتی کہ اب میں یہ حرکت دوبارہ نہیں کروں گی مگر اگلے ہی لمحے اپنا عہد توڑ دیتی۔ کوئی میرے اندر سے مجھے پکارتا اور تسلی دیتا کہ ہانیہ تم کوئی گناہ نہیں کر رہی ہو۔"

میں سوچتی واقعی یہ کوئی گناہ تو نہیں ہے۔ یہ تو میرا شوق اور ذاتی فعل ہے۔ اس سے بھلا کسی کو کیا تکلیف ہو سکتی ہے اور پھر میں اسی مستعدی سے اپنے کھیل میں جت جاتی۔

☆......☆......☆

ایک دن منگل کی دوپہر مجھے مما کا فون آیا۔ مما نے مجھے اپنے پاس کسی ضروری کام سے بلایا تھا۔ میں کچھ دیر بعد ان کے پاس پہنچ گئی کیوں کہ آج کل مما کا بلڈ پریشر ہائی رہتا تھا۔ میں سمجھی شاید وہ بیمار ہیں۔

"السلام وعلیکم مما! آپ کیسی ہیں۔" انہوں نے میری بات کا جواب دیے بغیر کہا۔

"ہانیہ! نعمان تمہاری طرف سے بہت پریشان ہے۔ یہ آج کل تم نے کیا حرکت شروع کر دی ہے۔" مما کی بات سن کر میں ایسے خاموش ہو گئی۔ جیسے میری چوری پکڑی گئی ہے۔

"مما میں سمجھی نہیں، آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔"

"بیٹا تم سب سمجھ رہی ہو جو میں کہنا چاہ رہی ہوں۔ اگر کسی کو یہ بات پتا چلی تو ہماری کتنی رسوائی ہو گی۔ لوگ تمہیں پاگل سمجھیں گے۔ تم کسی ماہر نفسیات کے پاس کیوں نہیں جاتیں۔"

میں ان کی بات سن کر رونے لگی۔ "مما میں یہ سب کچھ جان بوجھ کر نہیں کرتی۔ اللہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے اس کچرے سے میرا کوئی گہرا رشتہ ہے۔ یقین کریں یہ سب کچھ نادانستہ ہو جاتا ہے۔ میں اپنے آپ کو روک نہیں پاتی۔"

میری بات سن کر مما جیسے خوفزدہ سی ہو گئی تھیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

نعمان نے میرا علاج شہر کے معروف ماہر نفسیات سے کرانا شروع کر دیا۔ کئی عالموں سے دم درود بھی کروایا کہ اگر آسیبی معاملات ہیں تو ختم ہو جائیں اس سب سے مجھے بس اتنا فائدہ ہوا کہ یہ عمل میں صرف ہفتے میں ایک بار کرنے لگی۔ اب میں اپنی کچرے کی تھیلیاں اسٹور روم میں نہیں رکھتی تھی اس ڈر سے کہ کہیں میری چوری پھر سے پکڑی نہ جائے۔ میرا علاج اب بھی جاری تھا۔

مما بہت بیمار تھیں۔ میرا زیادہ وقت مما کے پاس گزرتا۔ بابا کے بعد وہ بالکل اکیلی ہو گئی تھیں۔

ایک دن مما نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ ان کی

طبیعت بہت زیادہ خراب تھی کچھ دیر بعد وہ بولیں۔

"ہانیہ! میرے سینے پر بہت بھاری بوجھ ہے۔ میں یہ بوجھ لے کر مرنا نہیں چاہتی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم حقیقت جان لو۔ میری بچی! میں تمہاری ماں نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں پالا ضرور ہے مگر تمہیں اپنی کوکھ سے پیدا نہیں کیا۔ تمہیں پیدا کرنے والی ان ہی سڑکوں پر کچرا چنتی تھی۔ وہ لڑکی سچ مچ بہت خوبصورت تھی۔ اس نے محبت میں دھوکہ کھایا تھا اور تم اس محبت کا نتیجہ ہو۔ وہ اکثر ہمارے پاس آتی تھی اور بچا ہوا کھانا لے کر چلی جاتی تھی۔ مجھے وہ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے بے حد پسند تھی۔ وہ جب بھی کھانا لینے آتی تو میں اسے لان میں بٹھا لیتی۔ اب اکثر میں اس سے اس کے بارے میں معلومات بھی حاصل کرتی رہتی تھی۔

ایک دن وہ بہت اداس تھی۔ میں نے اس سے اس کی اداسی کا سبب پوچھا تو اس نے مجھے روتے ہوئے بتایا کہ کوئی کم ظرف شخص حسین خواب دکھا کر اسے لوٹ گیا ہے۔ اچھے مستقبل کی خواہش میں اس نے زندگی کا سب سے بڑا دھوکہ کھایا تھا اور اس دھوکے نے اس سے اس کی عزت کا موتی چھین لیا تھا۔ محبت میں خسارہ عورت ہی کے حصے میں آتا ہے۔ اب وہ ماں بننے والی تھی۔ یہ سب سن کر میرا دل درد میں ڈوب گیا۔ اب میں اسے کھانے کے ساتھ ساتھ کچھ فروٹ اور پیسے بھی دے دیتی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، وہ بہت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سارا دن سخت محنت کرتی۔ دھوپ میں کچرا چنتی اور شام کو بوجھ لاد کر اپنی بستی کی طرف چلی جاتی۔ ردی کاغذ بیچ کر کماتی اور اپنے باپ کے ہاتھ پر رکھ دیتی۔ اس کا باپ بہت ظالم تھا۔

ایک رات وہ روتی ہوئی میرے پاس آئی۔ اس کی گود میں گٹھری تھی۔ میں نے اس سے جب اس کے رونے کا سبب پوچھا تو وہ ہچکیوں سے روتی ہوئی بولی۔

"بی بی میں نے ایک بیٹی کو جنم دیا ہے۔ میرا ابا کہتا ہے اس گندگی کی پوٹ کو کچرے میں پھینک آ، ورنہ میں اس کا گلا دبا دوں گا۔ بی بی میں ماں ہوں۔ یہ میرے وجود کا حصہ ہے۔ میں اسے کیسے کچرے میں پھینک دوں۔"

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس گٹھری میں میری بچی ہے اور پھر اس نے گٹھری کھول کر میرے سامنے رکھ دی۔ اتنی حسین بچی دیکھ کر میرا دل بھر آیا اور میری ممتا چیخ چیخ کر میرے اندر بین ڈالنے لگی کہ یہ وہ وقت ہے کہ شاید خدا نے میری سونی کوکھ کو اولاد کے موتی سے بھر دیا ہے۔ اب میں نے اس سے کہا کہ تم نے اپنی ساری زندگی کچرا کر لی ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ تمہاری بیٹی بھی تمہاری طرح کچرا ہو جائے۔ یہ بچی مجھے دے دو اور اپنے باپ سے کہو تم بچی کچرے میں پھینک آئی ہو۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں بچی کو اپنی بیٹی سمجھ کر پالوں گی مگر میری ایک شرط ہے۔ تم دوبارہ یہاں نہیں آؤ گی۔" اس نے بچی میری گود میں دی اور کہا اس کے اچھے مستقبل کے لیے میں یہ قربانی ضرور دوں گی۔ یہ حرام زادی نہیں آپ کی بیٹی کہلائے گی۔" وہ روتی ہوئی چلی گئی۔

ہانیہ جب تم تخلیق کے عمل سے گزر رہی تھیں تو تم نے صرف کچرے کی بو سونگھی۔ تمہاری ماں کا یہ عمل تمہارے خون میں شامل ہو گیا۔ اسی لیے تمہاری کچرے سے انسیت بے معنی نہیں۔" میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"مما میں آپ کی بیٹی ہوں۔"

"میری بچی خود پر قابو رکھو۔ یہ راز میرے اور تمہارے درمیان رہے۔ اگر نعمان کو پتا لگ گیا تو تمہاری خوش حال زندگی پر بہت بُرا اثر پڑے گا۔"

میرے کانوں میں عصر کی اذان کی آواز آئی اور میں جائے نماز بچھا کر اپنے رب کے حضور جھک گئی۔

"یا اللہ! میں کیا، میری اوقات کیا۔ مجھ جیسے کچرے کے ڈھیر کو اتنی عزت بخشی۔ اتنا نوازا۔ بے شک تُو جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت۔"

آج مما بھی بابا کے پاس جا چکی ہیں۔ میں نعمان اور اپنے بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہی ہوں لیکن کبھی کبھی میرا دل مجھے کھینچتا ہوا کچرے کی ڈھیری پر پہنچا دیتا ہے اور میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ یہ سارا کچرا میرا ہے۔ دل چاہتا ہے سارے کچرے کو اٹھا کر اپنی کار میں بھر لوں اور اس کچرے کے اوپر بیٹھ کر قہقہے لگاؤں اور دنیا کو پکار پکار کر کہوں۔ سارا کچرا میرا ہے۔ سارا کچرا میرا ہے۔ لیکن مما کا وعدہ نبھانے کی خاطر اور خاندان کی عزت کے لیے میں اپنے جذبات کا گلا گھونٹ دیتی ہوں۔ آخر دوسروں کے لیے جینا ہی اصل خوشی ہے۔

☆☆......☆☆☆

چوتھی سچ بیانی

صنم تیرے لیے چلے آئے ہم

ارشد علی

کوئٹہ سے ایک پریمی جوڑے کی سچی محبت کی انوکھی داستان

''کیا سوچ رہے ہو، ارش۔'' ندا نے آنکھوں سے کہا کہ میں کب تک اسی طرح تکتا رہوں گا۔

میں اسے دیکھتا رہا جیسے برسوں سے اسے نہیں دیکھا ہو اور سوچ کے پانیوں میں تیرتا۔

اس کی آنکھوں میں آج اتنی خوشی تھی کہ جیسے وہ برسوں سے اس دن کا انتظار کر رہی ہو۔ یہ آج سے سات سال پہلے کی بات ہے۔ جب دو مہینوں بعد میری اور ندا کی منگنی طے پائی تھی۔ ہم بہت خوش تھے اس دن۔

''ارش ایک بات کہوں؟'' اس نے مجھے مزید ڈوبنے سے روکنے کے لیے کہا۔

''ہاں بولو۔'' میں سوچوں کی گہرائیوں کو توڑتا ہوا اس کے سوال کا جواب دینے لگا۔

☆......☆......☆

''یہ جو وقت ہے جو آج ہم ساتھ گزار رہے ہیں یہ بہت حسین ہے۔ تم اسے کبھی مت بھولنا!'' یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ کہ یہ اس کے خوشی کے آنسو تھے۔ جو اس کی آنکھوں سے چھلک رہے تھے۔ خیر کچھ خوش گپیوں کے بعد میں نے ندا کو گھر ڈراپ کیا اور اپنی شاپ پر چلا گیا۔ شہزاد جو میرے بچپن کا ساتھی ہونے کے ساتھ ساتھ میری پرچھائیں بھی تھا۔ بدستور میرے انتظار میں بیٹھا تھا۔

''ایک گھنٹہ ہو گیا ہے سر آپ کے انتظار میں اور آپ اب آ رہے ہو؟ کہاں تھے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''یار تمہاری بھابی سے ملنے گیا تھا۔ واقعی میں وقت کیسے گزرا کچھ پتا ہی نہ چلا۔''

ابھی میں اور شہزاد منگنی کی تقریبات کے سلسلے میں بات چیت کر ہی رہے تھے۔ کہ اچانک میرا موبائل بجا اسکرین پر دیکھا تو ندا کی کال تھی، میں نے کال ریسیو کی۔

''ہیلو۔'' میں نے کہا۔

''ارش! میں ایک ضروری بات کرنا تو تم سے بھول گئی۔ میرے پاس تمہارے لیے ایک گفٹ ہے۔ جو میں نے تمہیں دینا ہے اور وہ بھی کل شام 6 بجے۔ تو شہزادے آپ خوش ہو جائیں دوبارہ ملاقات کے لیے۔ اب بولو کل فارغ ہو کہ نہیں۔'' ندا اپنی پوری بات دم توڑے بول گئی۔

☆......☆......☆

''جان تمہارے لیے وقت نہیں ہو گا تو کس کے لیے ہو گا۔ ٹھیک ہے کل شام CSD پر ملتے ہیں۔''

''او کے۔ پر شہزادے میرے ساتھ سعدیہ بھی ہو گی۔ اب چلاتا نہیں اللہ حافظ۔'' یہ کہہ کر ندا نے فون بند کر دیا۔

ندا اکثر مجھے چڑانے کے لیے اپنی سب سے قریبی سہیلی سعدیہ کا نام لیتی۔ کیوں کہ وہ بہت خوبصورت اور خوش اخلاق

مزاج کی مالکن تھی۔ پچھلی ملاقات کے برعکس میں بہت بے چین تھا۔ ندا سے ملاقات کے لیے اور مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ہماری اتنی جلد ملاقات ہو جائے گی۔ مجھے بے چینی سے کل شام کا انتظار تھا۔ رات کے بارہ بجے جب میں شہزاد کو ڈراپ کرنے کے لیے گیا تو اسے تاکید کی کہ کل میری ملاقات ہے اس کی بھابی سے لہٰذا وہ ٹھیک پانچ بجے شاپ پر آ جائے۔ اور میری غیر موجودگی میں ذمہ داری سنبھالے۔''

گھر پہنچ کر میں نے کھانا کھایا اور کچھ دیر قبل کی چہل قدمی اور نقل وحرکت کے بعد اپنے کمرے میں سونے چلا گیا۔ صبح اٹھنے کے بعد آفس کے لیے تیار ہوتے ہوئے من ہی من میں سوچتا رہا آج کی ملاقات میں اسے کیا گفٹ دینا چاہیے۔ جو پہلے نہ دیا ہو۔

خیر دفتر پہنچ کر دفتری کام میں اتنا مصروف ہو گیا کہ کب چھ بج گئے مجھے پتا ہی نہ چلا۔ ٹیبل پر سے کار کی چابیاں اٹھانے کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں سے الوداع لیا اور CSD کی طرف روانہ ہو گیا۔

منزل پر پہنچتے ہی آس پاس کا جائزہ لیا۔ اور وہاں ندا کو نا پاتے ہوئے پارکنگ سے ملحقہ شاپ پر پہنچ گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ میں حیران اس بات پر تھا کہ آج تک ہر ملاقات میں ندا مجھ سے پہلے آ جاتی۔ حالانکہ میں اگر لیٹ ہو جاتا۔ اور وہ منہ بنا کر ناراض ہو جاتی۔ پھر میں اسے منانے کے لیے اس کی پسندیدہ آئسکریم کھلانے لے جاتا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرے موبائل پر شہزاد کی کال آئی۔

☆......☆......☆

''ہاں کیا مسئلہ ہے تم سے کچھ دیر صبر نہیں ہوتا کیا؟'' ندا کے لیٹ ہونے سے میں پریشان بھی تھا۔ اور غصہ بھی آ رہا تھا جو میں شہزاد پر اتارنے لگا۔

''تم ابھی کہاں ہو؟'' شہزاد کے لہجے میں پریشانی جیسے تاثرات تھے۔ جیسے وہ مجھے کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔ اور بتا نہیں پا رہا تھا۔

''CSD میں ہوں۔ کیوں خیر تو ہے؟'' میں اس کی بات کے انداز سے مزید پریشان ہو گیا۔

''ہاں خیر ہے تم وہیں رکو میں ابھی آ رہا ہوں۔'' یہ کہتے شہزاد نے فون بند کر دیا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر

بات کیا ہے جو شہزاد دکان چھوڑ کر مجھ سے یہاں ملنے آ رہا ہے۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میری دائیں جانب نظر پڑی جہاں میں نے ندا کو اپنے پاس آتے ہوئے دیکھا۔ یہ ایک عجیب منظر تھا۔ کیوں کہ آج تک میں نے ندا کو کبھی ننگے سر چلتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور سر پر چوٹ کا نشان تھا۔ جس پر سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے اسے گلے لگایا اور سوال پر سوال کرنے لگا۔

"کہاں تھیں تم؟ کیا ہوا ہے تمہیں اور یہ چوٹ کیسے لگی۔ کیا ہوا ہے مجھے بتاؤ۔ تم ابھی میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو۔ دیکھو کتنا خون بہہ رہا ہے۔ سعدیہ کہاں ہے۔ تم نے کہا تھا وہ ساتھ آئے گی؟"

☆......☆......☆

ہم پاس والی بینچ پر بیٹھ گئے۔ ندا نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگی۔

"میں اب ٹھیک ہوں۔ کچھ نہیں ہوا مجھے تم فکر مت کرو۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ ہوا یہ تھا کہ میں سعدیہ کے گھر جا رہی تھی۔ اس کے گھر پہنچی تو سڑک کے پار والی فلاور شاپ پر نظر پڑی۔ کچھ پھول پسند آئے۔ تمہارے لیے لینے جا رہی تھی کہ ایک گاڑی سے ٹکر ہو گئی پھر بے ہوش ہو گئی اور کچھ پتا نہیں چلا۔ جب ہوش آیا تو 6:30 ہو رہے تھے۔ تم سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا کہ تم میرا انتظار کر رہے ہو۔ تو جلدی جلدی تمہارے پاس آ گئی۔ بہت دور سے سفر کرتی آ رہی ہوں ارش۔ لیکن تم فکر مت کرو پہلے درد ہو رہا تھا۔ لیکن اب سب ٹھیک ہے۔"

میں خاموش بیٹھا اس کے ہلتے ہوئے لبوں کو دیکھتا رہا اور غور سے سنتا رہا۔ اس کا لہجہ پُر سکون تھا۔ جیسے اسے کسی بات کا ڈر نہیں۔ پھر ندا نے دوسری جانب کھڑے ہوئے چار، پانچ لوگوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارش چلو یہاں سے۔ دیکھو سارے لوگ ہماری طرف گھور رہے ہیں۔ میں نے اسے اٹھایا کار کا دروازہ کھولا اور اسے بٹھاتے ہوئے کہا کہ پہلے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ پھر جہاں وہ کہے گی وہاں چلیں گے۔ مگر اس کی وہی بات کہ ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا۔ تم چلو پلیز۔ اسی جلدی جلدی میں مجھے یاد نہ رہا کہ میں اپنا موبائل وہیں بینچ پر چھوڑ چکا ہوں۔ آس پاس کے لوگوں پر نظر پڑی تو وہ مجھے دیکھ کر بڑبڑانے لگے کہ پاگل ہے کیا۔ میں نے پروانہ کی اور گاڑی اسٹارٹ کر کے شہر کی آبادی سے دور جانے لگا۔ ندا سارے راستے خاموش رہی میں یہی سوچتا رہا کہ کیا بات ہے۔ جو مجھ سے ندا چھپا رہی ہے۔ وہ کیوں اس حالت میں ہے۔ ایک کے بعد دیگر کئی سوالات میرے ذہن میں آنے لگے۔ رات کے نو بج چکے تھے اور ہم تقریباً ایک گھنٹہ سے اسی طرح چلے جا رہے تھے۔ کہ اچانک ندا نے گاڑی سڑک کے کنارے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ قریب آئی اور اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ کر رونے لگی۔ اس کا جسم ٹھنڈا تھا جیسے اسے کسی نے فرج میں کئی گھنٹوں تک رکھ دیا ہو۔

☆......☆......☆

"کیا بات ہے جان تم کیوں رو رہی ہو کیا بات ہے؟ اور تمہارا جسم کیوں اتنا ٹھنڈا ہے؟ میں اس کی اس کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔"

"ارش! میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔ آخر ایسا کیوں ہوا ہمارے ساتھ۔ کاش کہ آج ہم ملتے ہی نہ۔ ارش میں تم سے دور نہیں جا سکتی۔" وہ مستقل رونے کے انداز میں کہتی رہی۔

"کون تمہیں مجھ سے دور کرے گا جان۔ دو مہینے بعد ہماری منگنی ہے۔ مجھے بتاؤ کسی نے کچھ کہا ہے کیا تم سے۔ کیا بات ہوئی ہے؟"

میں پھر سوال پر سوال کرنے لگا۔

"کچھ نہیں ہوا ہے۔ تم گھر چلو پلیز۔ وہ لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے جانا ہے۔ ابھی اسی وقت دیر مت کرو۔" اس کا انداز اچانک تلخ ہو گیا۔ میں اس کے انداز سے ڈر گیا۔

"کون لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔؟" میں نے چونک کر جواب دیا۔

"تم گھر چلو پلیز میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ کچھ مت پوچھو بس تم چلو۔"

میں نے وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ آخر وہ جلدی گاڑی سے اتری اور گھر کی طرف بھاگنے لگی۔ پھر مڑ کر مجھے دیکھا اور گھر کے اندر چلی۔ اس

کے گھر کے باہر لوگوں کا رش لگا ہوا تھا۔ ابھی میں یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ شہزاد میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"تم کہاں تھے؟ میں CSD گیا تو پتا چلا تم وہاں سے نکل گئے ہو اور اپنا موبائل وہیں چھوڑ آئے ہو۔ میں سمجھا تمہیں پتا چل گیا ہوگا۔ اس لیے یہاں آیا شاید تم مجھے یہاں مل جاؤ۔ حوصلہ رکھو یار ہم انسان بے بس ہیں۔ اس کے سامنے ہر کسی کو اس فانی دنیا کو ایک دن چھوڑ جانا ہے۔" شہزاد مجھے تسلی دینے لگا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو تم؟ کس نے جانا ہے۔ کیوں تسلی دے رہے ہو مجھے۔" میں غصے میں ایک دم اس پر ٹوٹ پڑا۔

شہزاد نے ایک پل میری طرف حیرت کے ساتھ دیکھنے لگا اور پھر کہا۔

جب تم CSD چلے گئے تو سعدیہ کا فون دکان پر آیا اس نے بتایا کہ جب ندا اس کے گھر آ رہی تھی۔ تو راستے میں ایک تیز رفتار گاڑی سے اس کی ٹکر ہوگئی۔ وہ زخموں کی تاب نہ لا سکی اور خالق حقیقی سے جا ملی۔ میں تم کو فون پر یہ بات نہیں بتا پا رہا تھا۔ اس لیے وہاں بتانے آ گیا اور تم وہاں پر نہیں تھے۔" شہزاد نجانے کیا بڑبڑاتا چلا گیا اور میں اس سے بے خبر اپنے ہوش وحواس کھو کر پتا نہیں کہاں ڈوب گیا، میرے پاؤں سے جیسے زمین نکل گئی کہ ابھی ابھی جو مجھ سے ملی تھی وہ ندا نہیں تو کون تھی؟

میں اپنا سر پکڑ کر خوب رونے لگا اور اپنے آپ بڑبڑانے لگا کہ ابھی تو مجھ سے مل کر گئی ہو اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم اس دنیا میں نہیں ہو۔ میری سمجھ میں سب آنے لگا۔ اس رات میں جتنا رویا شاید اپنی زندگی میں کبھی بھی اتنا نہ رویا ہوں گا۔ پر کیا کرتا ہم سب بے بس ہیں اس کے فیصلے کے آگے۔ یہ بات میں اس وقت کسی کو بتا نہ سکا کہ میرے ساتھ اس رات کیا ہوا تھا۔

واقعی سچی محبت میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ چاہے وہ عشق حقیقی ہو یا عشق مجازی بات صرف سچائی کی ہوتی ہے۔ آج سات سال گزرنے کے بعد بھی جب وہ مجھے یاد آتی ہے تو ان پلوں کو میں خود سے چھڑا نہیں پاتا۔

کیا آپ میری مدد کریں گے کہ وہ کون تھی جو میرے ساتھ کار میں بیٹھ کر اپنے گھر گئی تھی۔

☆☆......☆☆☆

معجزے اب بھی ہوتے ہیں

عروج فاطمہ

مانسہرہ سے اُس دوشیزہ کی کتھا، جو غرور حسن میں خدا کو بھول بیٹھی تھی مگر......

میں اس وقت بہت ہی اہم پارٹی اٹینڈ کر رہی تھی، جب مجھے یہ خبر ملی کہ میرا اکلوتا بیٹا کار ایکسیڈنٹ کے باعث زندگی اور موت کی کشمکش میں پڑا ہے معلوم نہیں میں کیسے اور کس حالت میں با عجلت بھاگ ہاسپٹل پہنچی۔ میرے شوہر پہلے سے ہی وہاں موجود تھے۔ وہ مجھے حوصلہ دینے لگے، مگر ایک ماں کو اس وقت تک کوئی بات سکون نہیں دے سکتی کہ جب تک اس کی اولاد سکون میں نہ ہو۔ میرے جذبات منجمد ہو گئے تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ میں سکتے میں ہوں میں خالی خالی نظروں سے فضا میں گھور رہی تھی۔ تب ہی ڈاکٹر نے آ کر کہا۔

''آپ کے بیٹے کی حالت کافی سیریس ہے۔ آپ کے بیٹے کو دوا کی نہیں دعا کی ضرورت ہے اس لیے اللہ سے دعا کیجیے۔'' مجھے ڈاکٹر کی آواز دور کسی صحرا سے آتی ہوئی محسوس ہوئی میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''اللہ!! دعا!!!''

احمد نے مجھے زبردستی ڈرائیور کے ساتھ گھر بھیج دیا۔ کیوں کہ ان کے بقول وہاں رہ کر میری طبیعت بھی مزید خراب ہو سکتی ہے۔ اپنے کمرے میں آتے ہی میری پہلی نظر کمرے میں لگے سامنے آئینے پر پڑی۔ جس میں میرا روپ مجھے واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے دیکھا میرے شولڈر کٹ چمکیلے بال اور کھلے گلے والی شرٹ میرا ابھرا ابھرا دودھیا جسم جو کسی واعظ کے لیے تو بے شکن تھا، خوب قیامت ڈھا رہا تھا۔ واقعی میں آج بھی اتنی حسین تھی کہ لوگ مجھے ایک بار ضرور پلٹ کر دیکھتے تھے۔ میرے جسم کے خدوخال بھی اتنے جاذب نظر تھے کہ سب ہی یکساں نظر سے دیکھتے تھے۔ میں اب بھی حسن کی پرکار تھی میں انہی سوچوں میں گم تھی کہ اچانک میرے کانوں میں ڈاکٹر کی آواز گونجی۔ ''اللہ!! دعا!!!'' پھر تو جیسے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح زمین پر ڈھے گئی۔ ''اللہ!! دیا!!!''

یہ وہ الفاظ تھے جو میں پچھلے 20 سالوں میں بھول ہی گئی تھی اور ایسا بھولی کہ مجھے پھر کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ماضی کی کتاب پر سے برسوں کی جمی ہوئی دھول ہٹنے لگی۔ اپنے ماضی کا ایک ایک صفحہ صاف اور ہر سطر واضح ہوتی چلی گئی اور میں کسی تھکے ہوئے مسافر کی طرح ایک ایک لفظ پڑھتی چلی گئی۔

میرا نام زیب النساء تھا۔ والد مسجد کے امام اور والدہ گھریلو خاتون تھیں۔ میرے والدین صرف ہر جائز خواہش پوری کیا کرتے تھے۔ ناجائز خواہش پر ڈانٹ کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا۔ میرا گھریلو ماحول خالص مذہبی تھا۔ اس لیے تو صرف مجھے سات سال کی عمر سے ہی سکارف اوڑھایا گیا تھا۔ جب پہلی بار امی نے مجھے سکارف اوڑھایا تو میں رونے

لگی تھی اور ضد کر رہی تھی کہ میں سکارف نہیں لوں گی۔" مگر امی میری تعریفیں کرنے لگی، اور مجھے لے کر ابو کے پاس بیٹھ گئیں۔ میں نے جھٹ سے ابو سے امی کی شکایت کردی۔

"ابو دیکھیں نا امی نے مجھے سکارف اوڑھایا ہے۔ ایک تو گرمی ہے اور اوپر سے مجھے ڈھک دیا ہے۔ میری دوستیں بھی تو سکارف نہیں لیتیں، میں بھی سکارف نہیں لوں گی۔" یہ کہہ کر میں سکارف کھولنے لگی۔

"نہیں بیٹا! اچھے اور شریف گھرانے کی لڑکیاں ہمیشہ باپردہ رہتی ہیں۔ چاہے چھوٹی ہوں یا بڑی۔" انہوں نے بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھرتے ہوئے کہا۔

"مگر ابو......" ابھی میرا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ ابو بول پڑے۔ "بس بیٹا کوئی اگر مگر نہیں، دیکھو ہماری بیٹی کتنی پیاری لگ رہی ہے۔" اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی میں سکارف لینے لگی۔ نماز کی پابندی میری عادت بنا دی گئی۔ مجھے اس وقت تک کھانا نہیں دیا جاتا، جب تک میں نماز نہیں پڑھ لیتی۔ اس طرح مجھے سویرے اٹھا دیا جاتا تھا۔ اور آہستہ آہستہ میں ان باتوں کی عادی ہوتی چلی گئی۔ میں نے کم عمری سے ہی پردہ کرنا سروع کر دیا تھا۔

جب میں میٹرک میں تھی تو ابو اچانک ہمیں روتا ہوا چھوڑ کر اگلے جہاں چلے گئے اس جہاں جس کی باتیں اکثر وہ مجھے سنایا کرتے تھے۔ میں اور امی اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئے۔ جس طرح دنیا پرانی ریت ہے کہ غریب کا کوئی نہیں ہوتا بالکل اسی طرح ہم بھی تنہا رہ گئے۔ سب نے ہم سے منہ پھیر لیا۔ کیا اپنے کیا پرائے، سب بیگانے ہو گئے۔ عزیز واقارب نے تو لاوارث چھوڑ دیا۔

امی پہلے تو کچھ عرصہ صبر سے بیٹھی رہیں۔ مگر پھر کیا کرتیں کہ پیٹ کا دوزخ بھی تو بھرنا تھا۔ اس لیے امی نے محلے بھر کے کپڑے سینا شروع کر دیے۔ یہی وہ باعزت کام تھا جو وہ گھر میں بیٹھ کا با آسانی کر سکتی تھیں۔

جب میں نے میٹرک فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا، تو

امی نے مجھے کالج میں داخلہ دلوایا۔ کالج جوائن کرنے سے ایک رات پہلے وہ میرے پاس آئیں اور خاموشی سے مجھے دیکھتی رہیں اور پھر یوں کہنا شروع کیا۔

"زیب النساء، میں نے تمہیں کالج میں داخلہ اس لیے دلوایا ہے کہ تمہیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ بیٹی میں نے آج تک تمہاری چال ڈھال میں وہ فرق نہیں دیکھا جو عموماً اس عمر کی لڑکیوں میں آجاتا ہے اور وہ زمین طپر اترا کر چلتی ہیں۔ نزاکت حسن انہیں مغرور کر دیتا ہے۔ والدین کو اللہ نے وہ جس بھی دی ہوئی ہے۔ جس سے وہ اپنی اولاد کہ باطن جو جان لیتے ہیں، لیکن مجھے تم پر اس قدر بھروسہ ہے کہ جتنا خود پر۔" پھر وہ سانس لینے کے لیے رکیں، اس کے بعد یوں گویا ہوئیں۔

'میری بیٹی یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔ تنہا لوگوں بلکہ خاص طور پر تنہا لڑکیوں کو تو اس طرح کھا جاتی ہے کہ ان کا نام و نشان بھی نہیں رہتا۔ میری بچی میری ایک بات یاد رکھنا کبھی کسی کا اعتبار نہ کرنا، بلکہ مرد کی گھٹی میں ہی بے وفائی شامل ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کسی بھی قسم کا کوئی پچھتاوہ ہو اس لیے اپنے آپ کو سنبھال کر رکھنا اور کسی کے قریب نہ جانا اور نہ کسی کو اپنے قریب ہونے دینا، کیوں کہ اس کی خوشبو انسان کو بے قابو کر دیتی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہارا گوشت کوئی غیر نوچے۔" بیٹی! تم میری بات سمجھ رہی ہونا۔ انہوں نے بڑے پیار سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

ان کی نصیحت بھری باتیں سن کر میں نے انہیں یقین دلاتے ہوئے کہا۔" امی آپ کی بیٹی آپ کا اعتماد کبھی نہیں توڑے گی، آپ اس پر مکمل بھروسہ رکھیں۔

شاباش مجھے تم سے یہی امید تھی۔ انہوں ے انتہائی پر جوش ہو کر مجھے گلے لگالیا۔

☆......☆......☆

اگلے روز میں نے کالج جوائن کر لیا، اس طرح کہ صرف اور صرف اپنے کام سے کام رکھتی یہی وجہ تھی کہ میری دوستی بھی بہت کم بلکہ یوں کہیں کہ صرف اور صرف ایک لڑکی سے ہوئی۔ شایدہ بھی میری ہی طرح ایک غریب لڑکی تھی۔ ہم دونوں کے گھریلو حالات کافی ملتے تھے۔ وہ بہت اچھی اور مخلص لڑکی تھی۔

میرے شہارنے اور کسی کو منہ نا لگانے کی وجہ سے کالج کی تمام لڑکیاں مغرور کہا کرتی تھیں۔ میرا انتہائی اور خاموشی میں اس طرح وقت گزرتا گیا، یہاں تک کہ میں نے انٹر کر لیا اس کے بعد میرا تھرڈ ایئر کلیئر ہو گیا۔

یہ بی اے فائنل ایئر کی بات ہے کہ میں پرنسپل کے آفس میں دو دن کی چھٹی کی درخواست لے کر گئی تھی۔ کیوں کہ میری امی کی طبیعت خراب تھی۔ پرنسپل بہت اچھی خاتون تھیں وہ میرے گھریلو حالات سے اچھی طرح واقف تھیں۔ اسی لیے وہ مجھے محنت اور لگن سے پڑھنے کا بہت سراہا کرتی تھیں۔

ابھی وہ مجھ سے بات کر ہی رہی تھیں کہ ایک 25 سے 30 سالہ نوجوان کمرے کہ اندر داخل ہوا، وہ پرنسپل کا رشتے دار معلوم ہوتا تھا کیوں کہ اس نے آتے ہی سلام کیا اور صوفے پر گرنے کے انداز سے بیٹھ گیا۔ لیکن جب ادھر اُدھر دیکھنے کے بجائے اس کی نظریں مجھ پر آکر ٹھہر گئیں تو میں ایک دم سے گھبرا گئی۔ اور گھبراہٹ میں اپنے دوپٹے سے اپنے چہرے کو چھپانے کی کوشش کرنا لگی۔ پرنسپل فوراً میری گھبراہٹ کو جان گئیں اور انہوں نے جلدی سے میری درخواست پر دستخط کر دیے اور مجھے پکڑا دی۔ اس کے بعد مجھے پتا نہیں چلا کہ میں کیسے آفس سے باہر نکلی اس وقت میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس واقعے کے بعد سارا دن بے چینی سی رہی۔ رات کو جب میں سونے کے لیے لیٹی تو تو چھم سے وہی سراپا میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اِک لمحے کو میرے دل میں اس کا ہم سفر بننے کی خواہش جاگی مگر اگلے ہی لمحے میں نے سر کو جھٹک دیا، لیکن پھر بھی میرے ذہن میں عجیب قسم کے سوالات گردش کرتے رہے۔

"کیا میں اس کے معیار کے مطابق خوبصورت نہیں؟" میرے دل میں ایک سوال اٹھا میں آئینے کے سامنے چلی آگئی، میں نے ہر انداز اور ہر پہلو سے اپنا جائزہ لیا دیر تک اپنا سراپا دیکھتی رہی ایک ایک انگ کا مشاہدہ کرتی رہی، بغیر کسی قسم کے بناؤ سنگھار کے مجھے اپنا آپ بڑا پُرکشش اور خوبصورت لگا۔ ویسے بھی دیکھنے والے مجھے خوبصورت ہی کہا کرتے تھے بھرا بھرا جسم، خوبصورت ابھار حسین نقش و نگار، چکنی چکیلی گوری جلد، صراحی گردن، قیامت چال لمبے بال، لچکیلی کمر اور قد بے مثال اسی لیے محلے کی لڑکیاں مجھے دیکھ کر جلتی تھیں۔ پتا نہیں لڑکیوں میں حسد اس قدر کیوں بھرا ہوتا ہے۔ وہ اپنا سراپا دیکھنے کے بجائے دوسروں پر نظر رکھتی ہیں۔ اس لیے وہ اپنی نظر میں خود ہی گر جاتی ہیں۔

اتنا کچھ ہونے کے باوجود میں سوچنے لگی، ایسی کیا چیز

ہے جو میرے راستے میں حائل ہے۔ پھر مجھے فوراً جواب ملا کہ غربت؟؟؟"

جائے اس کا بیڑا غرق دامن کٹ جائے پھر بھی داغ نہیں جاتا اور داغ مٹ جائے تو عیب نہیں جاتا۔ غربت ہے جو حسن کو کھا جاتا ہے۔ حسن دولت ہے، لیکن غربت میں مٹی ہو جاتا ہے۔ میں اپنے آپ کو دیکھتی ہوں تو لاکھوں میں کھلتا ہوا پاتی، لیکن جب اپنے سراپے سے نظر ہٹاتی ہوں تو زمین پر گرا ہوا پاتی۔ اس غربت کے درمیان اس طرح معلق تھی کہ معاملہ اوپر پہاڑ نیچے کھائی والا نظر آتا تھا۔ اس لیے میری سوچ میں نہ کوئی تسلسل رہا اور نہ ہی اس وجہ سے خدا کے ساتھ رابطہ رکھ سکی میں اکثر سوچا کرتی کہ بھلا اس کچی آبادی کے اس غریب سے گھر میں کوئی امیر آ سکتا ہے بھلا۔ اس کی تو بڑی سے کار میرے گھر آنے سے انکار کر دے گی۔ یہ سوچ کر میرا دل جیسے ٹوٹ سا گیا۔ دن بھی ویسے ہی تھے اور وقت بھی بلکہ سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا۔ بس میرا دل بدل گیا تھا۔ ہر پل بے چین سا رہنے لگا تھا۔ شاید میں بھی پہلی نظر میں محبت کا شکار ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

اس دن فری پیریڈ میں، میں یونہی درخت کے نیچے بیٹھی کاغذ پر آڑھی ترچھی لکیریں بنا رہی تھی۔ اس روز میری سہیلی بھی شاہدہ بھی کالج نہیں آئی تھی۔ اس لیے میں کچھ زیادہ ہی بے چین تھی، کیوں کہ اکیلے وقت کاٹنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ میں ابھی انہی سوچوں میں گم تھی۔ کہ اچانک...... "زیب النساء! تب ہی مجھے پرنسپل کی آواز سنائی دی۔

"ج...... جی"...... میں جو اپنے خیالوں میں گم بیٹھی تھی، بوکھلا سی گئی۔

"اگر تم فارغ ہو تو میرے آفس میں آ جاؤ۔" وہ یہ کہہ کر چلی گئیں۔

"May I Come in Madam۔" میں نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔

"Yes۔" انہوں نے مختصراً کہا اور نظریں فائل پر جما دیں۔

"میں آج تم سے کوئی ذاتی بات پوچھنا چاہتی ہوں۔ میڈم نے جھکی نظروں سے کہا۔

"جی میڈم! آپ سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ پھر بھی آپ کچھ پوچھنا چاہیں تو میں جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے انتہائی سادگی سے کہا۔"

"اس دن جو شخص میرے آفس میں آیا تھا۔ وہ میرا پھوپھی زاد بھائی ضیاء احمد ہے۔" میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں ان کی بات دھڑکتے دل کے ساتھ سن رہی تھی۔

"اس کا اپنا گارمنٹس کا بزنس ہے اور وہ ایک کامیاب بزنس مین ہے۔ کراچی میں رہتا ہے، والدین کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"مگر میڈم آپ یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہی ہیں۔" میں نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

"Good question۔" میڈم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دراصل اس نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ اس کی میں وجہ کسی بھی لڑکی کا پسند نہ آنا ہے۔ اب اس نے مجھ سے تمہارے لیے بات کی ہے۔"

"میرے لیے، کیا مطلب؟" میں نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے کہا۔

"بھئی وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے، اگر تم بھی چاہو تو۔" وہ یہ بات انتہائی پرشوق نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں وہ بھی اس کے حق میں تھیں۔ کہ میں اس سے۔"

"لیکن میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔"

"اس سلسلے میں آپ میری امی سے بات کر لیں۔ جو وہ فیصلہ کریں گی وہی میرا فیصلہ ہوگا۔"

شاباش مجھے تم سے یہی امید تھی۔ انہوں نے انتہائی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھرتے ہوئے کہا۔

کچھ روز بعد پرنسپل صاحبہ خود میرے گھر رشتہ لے کر آئیں میری امی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا کہ قسمت کی دیوی خود ان پر مہربان ہو رہی تھی اتنا اچھا رشتہ ٹھکرا کر وہ کفران نعمت کیسے کر سکتی تھیں۔

جیسے ہی یہ رشتہ طے ہوا لوگوں کی باتیں شروع ہو گئیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ایک سے ایک نئے جملے مارکیٹ میں آ رہے تھے۔

"ہائے ماں دیکھو کتنی شریف بنی پھرتی ہے، ویسے ہی تو نہیں اسے کالج میں پڑھا رہی تھی۔ توبہ کیا زمانہ آ گیا ہے۔"

"سارا چکر لڑکی کا ہے ورنہ ہماری بیٹیاں بھی تو ہیں، ہمارے گھر تو کوئی اچھا رشتہ نہیں آیا۔"

"سیانے سچ کہتے ہیں کہ والدین خود تعلیم کے بہانے لڑکیوں کو گھر سے نکالتے ہیں اور وہ خود اپنے لیے اچھے رشتے ڈھونڈ لیتی ہیں۔ گھر بیٹھے تو اتنی اچھی جگہ سے کوئی بھی نہیں آتا۔"

"بے حیانے تو کچھ مرے ہوئے باپ کی لاج رکھی ہوتی۔ خوب کالک ملی ہے دونوں ماں بیٹیوں کے اس کے منہ پر۔"

"ہائے دیکھ کیسا پردے میں زور لگایا ہے چھنال نے۔"

"بہن کچھ دال میں کالا ہے، اٹھتی جوانی ہے، کچھ تو گل کھلایا ہوگا۔"

محلے بھر کی عورتوں کے پاس صرف ایک ہی موضوع تھا۔ زیب النساء، کالج پرنسپل اور میری ماں۔ اس حوالے سے جس قدر باتیں بن سکتی تھیں بنائی جارہی تھیں۔

مگر ہم خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے۔ ہم کس کس کو جواب دیتے اور کس کس کے آگے صفائی پیش کرتے۔

رفتہ رفتہ شادی کے دن قریب آگئے۔ احمد نے جہیز کے نام پر ہم سے کسی بھی چیز کا تقاضا نہیں کیا، قبول ان کے۔

ان کے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ جس قیمتی چیز کی کمی تھی وہ صرف وہی لے کر جائیں گے۔"

☆......☆......☆

"اُن کی اس بات پر اور اعلی سوچ پر میں اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کرتی وہ کم تھا۔ بالآخر وہ دن بھی آگیا جس کا ہر لڑکی کو شدت سے انتظار ہوتا ہے۔ دلہن بن کر مجھ پہ بھی خوب روپ آیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی حور دودھ میں نہا کر آئی ہو۔ احمد کے گھر آکر مجھے زندگی کی حقیقی خوشی ملی۔ مجھے تو اب معلوم ہو رہا تھا کہ سچی اور پُرخلوص محبت کیا ہوتی ہے۔ ہم شادی کے ایک ہفتہ تک ہوٹل میں رہے، جب ہم کراچی جانے لگے تو امی سے کہا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ چلیں، یہاں اکیلی رہ کر کیا کریں گی، مگر انہوں نے یہ کہہ کر مجھے خاموش کروا دیا کہ "اگر میں اس گھر سے گئی تو تمہارے ابو کی روح کو تکلیف ہوگی۔ اب تو یہاں سے میرا جنازہ ہی نکلے تو اچھا ہے۔"

انہوں نے ڈھیروں دعاؤں کے سائے میں مجھے رخصت کیا۔

کراچی پہنچ کر میں نے ہر چیز اپنی پسند اور مرضی سے سیٹ کی حتی کے نوکر بھی میں نے اپنی مرضی کے رکھے۔

احمد کا سوشل ورک زیادہ تھا۔ معاشرے میں ان کا ایک الگ مقام تھا۔ آئے دن پارٹیز اور میٹنگز ہوتی رہتی تھیں۔ سماجی خدمت کے حوالے سے ان کا ایک نام تھا۔ احمد مجھے بھی ہمیشہ ساتھ لے جانے کی خواہش کرتے، مگر میں جانے سے کتراتی تھی۔ شادی کے دو ماہ بعد ہی امی ہمیں تنہا چھوڑ کر اگلے جہاں چلی گئیں۔ اس لیے میں نے خود کو گھر میں ہی محصور کر لیا۔

شادی کے سال بھر بعد اللہ تعالی نے مجھے ایک بیٹا عطا کیا۔ جس کا نام میں نے شایان رکھا۔ پھر میں اپنے اکلوتے بیٹے کی پرورش میں مصروف ہوگئی۔ جو میرا بیٹا دو سال کا ہوا تو احمد مجھے بھی اپنے ساتھ پروگراموں میں لے جانے لگے رفتہ رفتہ مجھے یہ ساری سوشل ایکٹوٹیز اچھی لگنے لگی اور پھر ان کی عادی ہوتی چلی گئی۔ احمد نے مجھے زیب النساء سے زیب احمد بنا دیا۔ میرا پردہ تو کب کا خواب ہو چکا تھا۔ میں نے خود کو اسی ماحول میں ڈھال لیا تھا جس کا تقاضا اس وقت زمانہ کر رہا تھا۔ اب میں فیشنی اور ٹائٹ لباس بھی پہننے لگی میرے لباس سے ہی لوگ میرے انگ انگ کا بھرپور تعارف حاصل کر لیتے تھے۔ اس کے لیے ایک نظر ہی کافی ہوتی تھی۔ بال ویسے پہلے ہی گھنے اور لمبے تھے۔ اب کٹنگ کے بعد شانوں تک رہ گئے تھے۔ مجھے اپنا یہ روپ اچھا لگنے لگا تھا۔ آخر میں بھی چاہتی تھی کہ ہمیشہ شمع محفل بنی رہوں اور لوگ میری پوجا کرتے رہیں۔ جب لوگ سر محفل میری تعریف کرتے تھے۔ میں تو جیسے ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ احمد بھی بہت خوش ہوتے اور اپنی خوشی کا اظہار اکثر وہ مجھ سے تنہائی میں کرتے۔

"زیب تمہیں پتا ہے جب لوگ تمہاری تعریف کرتے ہیں تو میرا سر فخر سے تن جاتا ہے اور میں خوشی سے سرشار ہو جاتا ہوں کہ اتنی خوبصورت عورت میری زندگی کی ساتھی بنی۔"

میں احمد کی بات سن کر ہنس دیتی۔ کیوں کہ ایک عورت اس وقت اپنے اوپر بہت فخر محسوس کرتی ہے جب اس کا شوہر اس کا ہم سفر اس کی تعریف کرے۔ اس وقت وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ عورت اپنی جھوٹی تعریف سن کر ہی رام ہو جاتی ہے اس کے بعد زبردستی بھی اسے رضامندی معلوم ہوتی ہے۔

☆......☆......☆

دن یونہی گزرتے جارہے تھے۔ مجھے کسی بھی خاص

تقریب کی جان سمجھا جانے لگا تھا اور اگر کبھی طبیعت خرابی کی وجہ سے میں کوئی تقریب مس کر دیتی تو لوگ احمد سے میرا اتنا پوچھتے کہ گھر آ کر وہ مجھ سے یوں کہتے۔

''زیب تم بستر مرگ پر بھی ہو تو پارٹی مس نہ کیا کرو۔ بھئی میں کس کس کو جواب دیتا پھروں کہ تمہاری طبیعت خراب ہے، بلکہ کبھی تو میرا جی چاہتا ہے کہ پہلے سے اعلان کروا دیا کروں تاکہ مجھے بار بار جواب نہ دینا پڑے۔

ان سب باتوں کے باوجود بھی میں اپنے بیٹے شایان کو نہ بھولی تھی۔ کہیں بھی جانے سے پہلے اسے اپنے گلے لگا کر پیار کرتی تھی اور واپس آ کر سب سے پہلے اس سے ملتی تھی احمد میرا مذاق اڑانے لگے کہ اس کے لیے دو آیا ئیں موجود ہیں، پھر بھی تمہیں ہر وقت اسی کی فکر لگی رہتی ہے، بالکل روایتی یا پھر کہنا چاہیے دیہاتی ماؤں کی طرح تم خواہ مخواہ تم اپنا آدھا آدھا خون جلاتی ہو۔''

میں ان کی بات سن کر مسکرا دیتی اور پھر ملائمت سے کہتی۔ ''نہیں احمد یہ بات نہیں، اصل میں بچے کو جب تک ماں کا پیار نہ ملے، وہ ادھورا ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت میں کمی رہ جاتی ہے۔ اسی طرح Sicky Case جنم لیتے ہیں۔''

احمد میری بات پر زچ ہو جاتے اور کہتے۔

''Come On Yar۔'' میں تم سے بحث میں نہیں جیت سکتا جیسے تمہاری مرضی ویسا کرو۔''

وہ ہمیشہ کی طرح ہار مان لیتے شایان بھی مجھ سے کافی اٹیچ ہو گیا تھا۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا اور وہ 20 سال کا ہینڈسم جوان بن گیا۔ اور بقول اس کے ''لڑکیاں اس کے پیچھے پھرتی ہیں۔'' واقعی اس کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ کوئی اس سے نظر نہیں ہٹا سکتا تھا۔

ان 20 سالوں میں، میں نے ایک لمحے کے لیے بھی اللہ کو یاد نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ دنیا دکھاوے کو بھی نہیں۔ اس اللہ کو جو میری تمام کوتاہیوں کو پس پشت ڈال کر مجھے عطا کرتا جا رہا تھا۔ اور پھر جیسے تو میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب ابل پڑا۔

میں نے رو رو کر اپنے رب سے معافی مانگی۔ جانے کتنی ہی دیر میں حالت سجدہ میں روتی رہی اور اپنے رب سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگتی رہی کہ اچانک مجھے احمد کی آواز سنائی دی۔

''زیب مبارک ہو شایان کو ہوش آ گیا ہے اور وہ بالکل ٹھیک ہے، مگر!!''

''مگر کیا؟'' میں ایک دم تڑپ اٹھی۔

''اس کی بیک بون متاثر ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ چل پھر نہیں سکے گا۔'' اتنا کہہ کر وہ رونے لگے۔

''نہیں احمد خوشی کے موقع پر رویا نہیں کرتے۔ آج مجھے زندگی کی سب سے بڑی اور حقیقی خوشی ملی ہے مجھے میرا کھویا ہوا رب مل گیا ہے۔ اور رہی بات شایان کے چلنے پھرنے کی تو کوئی بات نہیں۔ مجھے اپنے رب پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ ہمیں مایوس نہیں کرے گا، کیوں کہ معجزے تو اب بھی ہوتے ہیں۔''

☆......☆......☆

اب دنیا نے میرا نیا روپ دیکھا۔ میں مکمل حیاء اور عبائے میں بند ڈھکی چھپی، نقاب کر کے باہر نکلتی، پانچ وقت کی نمازی بن گئی۔ فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی میں ہر وقت توبہ کرتی رہتی ہوں۔ احمد بھی پانچ وقت کے نمازی ہیں۔ اور ہر وقت توبہ استغفار کرتے رہتے ہیں۔

میں اللہ کا لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے کسی بڑے نقصان سے بچا لیا۔ اور میری توبہ قبول کر لی بے شک وہ سچے دل سے کی جانے والی توبہ ضرور قبول کرتا ہے۔ اور گناہ چاہے بڑے سے بڑا بھی ہو، معاف کر دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ بے شک بخشنے والا مہربان رب ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر انسان کو کھلی چھوٹ دیتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ وہ کب توبہ کرتا ہے۔ جو اللہ کے پسندیدہ بندے ہوتے ہیں، اللہ انہیں دنیا میں ہی توبہ کا موقع فراہم کرتا ہے یا پھر دنیا میں ہی سزا دے دیتا ہے۔ اور گنہگاروں کے لیے توبہ بھی ہے۔ اللہ کا لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے دنیا میں ہی توبہ کا موقع فراہم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا اپنے کرم سے نوازتا ہے۔

میرے بیٹے شایان کے بارے میں ڈاکٹر کا کہنا ہے۔ کہ وہ تیزی سے صحت کی جانب آ رہا ہے۔ شاید جلد ہی وہ چلنا شروع کر دے۔

اس واقعے کو آج پانچ سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اللہ ہر مؤمن انسان کا دکھ درد دور کرے اور اس کے دکھ درد کا ساتھی بنے آپ بھی دعا کریں۔

☆......☆......☆

چھٹی سچ بیانی

تیرا ہی عکس ہے

الماس فاطمہ ارمان

کراچی سے ایک جواں سال بیوہ کے ارمانوں کی کتھا

آج صبح سے بارش ہو رہی تھی ٹوٹ کر برستے بادل، بجلی کی چمک آج سب کچھ تہس نہس کرنے کے موڈ میں تھے۔ کمرے کی خاموشی میں کبھی کبھار بجلی کی گرج سے ارتعاش پیدا کر دیتی پھر وہی سکوت چھا جاتا۔ دن دھیرے دھیرے بیت رہا تھا۔ تاجی کمرے کے ایک کونے میں سر چھپائے بیٹھی تھی۔ اردگرد سے بے خبر اپنی یادوں میں گم...... آنسو پلکوں سے ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ یادوں کے تانے بانوں سے الجھتی کچھ دیر کھڑکی کے پاس پہنچ کر اس نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھولے۔ نم ہوا کے جھونکے نے بڑھ کر استقبال کیا۔ آسمان سرمئی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کہیں دور بادلوں سے جھانکتے چاند کو دیکھ کر ایک دکھی سے مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔ زخم پھر سے ہرے ہو گئے، شرجیل یاد آنے لگا۔ اس کے سینے میں ہوک سی اٹھی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب اس کی دل کی بھڑاس نکل گئی تو بیڈ پر جا کر لیٹ گئی۔ کوشش کے باوجود نیند آنکھوں سے دور تھی۔ وہ ماضی میں کھو گئی۔

وہ کوئٹہ کی رہنے والی تھی۔ شرجیل کا اس کی پھوپھی زاد بیٹا تھا۔ وہ اکثر گرمیاں گزرنے کوئٹہ آتا تھا۔ تاجی کے والد پردے کے بہت پابند تھے۔ وہ شرجیل کے سامنے بھی زیادہ جانے کو برا سمجھتے تھے۔ اگر وہ گھر میں ہوتا تو وہ بڑی سی چادر اوڑھ کر گھر کے کام میں مصروف رہتی۔ کبھی وہ مل جل کر ساتھ نہیں بیٹھے تھے۔ اس لیے شرجیل نے کبھی غور سے تاجی کو نہیں دیکھا تھا۔ البتہ اس کی بہن شمائلہ نے بتایا تھا۔ تاجی بہت حسین ہے۔

شمائلہ کی شادی کے دن قریب تھے۔ تاجی کے ماموں اپنی بہن کو لینے آئے۔ تاجی نے بھی ماں سے ضد کی امی مجھے بھی ساتھ لے کر جائیے۔ میں بھی سب سے ملنا چاہتی ہوں۔ تاجی کی والدہ طیبہ بیگم نے بھائی سے کہا آپ ان کے ابو سے جانے کی اجازت دلا دیجیے بڑی مشکل سے انہوں نے بہن اور بھانجی کے لیے رضا مندی حاصل کی۔ تاجی کے والد بضد تھے صرف طیبہ بیگم ہی جائیے۔ آخر وہ بڑی مشکل سے تاجی کے لیے رضا مند ہوئے۔ تاجی کا خوشی کے مارے برا حال تھا۔

وہ جلدی جلدی اپنا اور امی کا سامان پیک کر رہی تھی۔

پھر وہ کراچی آ گئے۔

سب خوش تھے۔ کافی عرصے بعد طیبہ بیگم اپنے کنبے سے ملنے کراچی آئی تھیں۔ خوشی کے مارے ان

کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ ایک ایک کو گلے لگا کر خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔

شمائل نے اپنی سہیلی سے کہہ کر تاجی کو تیار کرایا۔ مایوں کی مہندی سے ولیمہ تک کے کپڑے شمائلہ خود جا کر لے آئی تھی۔ وہ چاہتی تھی اس کی پیاری سی کزن شرجیل کی آنکھوں میں بس جائے۔

تاجی تیار ہو کر نیچے آئی تو شرجیل نے پہلی دفعہ غور سے اُسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ پہلی بار اس نے تاجی کو چادر کی بکل سے آزاد دیکھا تھا۔

☆......☆......☆

رات تک کزنز کی محفل جمی رہی۔ شرجیل کی نگاہیں تاجی کا طواف کرتی رہیں۔ شرجیل وقفے وقفے سے تاجی کے قریب ہو رہا تھا۔ شمائلہ نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ تاجی بھی کچھ کچھ شرجیل کے قریب ہونے لگی تھی۔ بارات ولیمہ سب کچھ اختتام پذیر ہو چکا تھا۔ شمائلہ نے شرجیل کے حوالے سے پوچھا تو شرجیل نے بہن سے رضامندی کا اظہار کر دیا۔

گاؤں سے تاج کے بڑے بھائی کا فون آ گیا تھا کہ جلدی گھر واپس آؤ ابا بہت ناراض ہو رہے ہیں۔ سب نے ہی تاجی کو تحفے تحائف دیے۔ شرجیل کی سمجھ سے باہر تھا کہ وہ کیا پیش کرے آخر بہت سوچنے کے بعد شرجیل نے تاجی سے اپنے دل کی بات کی۔

"تاجی سب نے تمہیں ہر طرح کے تحفے تحائف دیئے ہیں مگر میں تم کو ایک سب سے قیمتی تحفہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ تم اس تحفے کو ہمیشہ سنبھال کر رکھو گی۔"

تاجی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی کہ شرجیل گویا ہوا تاجی میں تم کو اپنا دل دے رہا ہوں میں نے ہمیشہ سے تمہیں اپنے قریب پایا ہے۔ کیا تم بھی مجھے پسند کرتی ہو؟"

تاجی بھی چپکے سے شرجیل کو دل میں بسا بیٹھی تاجی کی طرف سے بھی پیار کا اظہار تھا۔ دونوں بہت خوش تھے۔ تاجی اور اس کی امی گاؤں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ شرجیل بہت اداس تھا۔ شمائلہ نے اسے تسلی دی کہ تم پریشان مت ہو۔ میں امی اور ابو سے بات کر کے انہیں گاؤں بھیجوں گی۔ تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے تاجی کو مانگ لیں۔

☆......☆......☆

شمائلہ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ شرجیل کے امی ابو نے گاؤں جا کر اپنے بیٹے کی خوشی کے لیے تاجی کے والدین کے سامنے جھولی پھیلا دی۔ تاجی کے والد سخت گیر انسان تھے لیکن اپنے سالے سے بہت پیار کرتے تھے اس لیے وہ اس رشتے سے انکار نہ کر سکے اور تاجی کے لیے شرجیل کا رشتہ قبول کر لیا۔

جلد ہی تاجی شرجیل کی دلہن بن کر اس کے گھر آ گئی۔ دونوں فریقین بہت خوش تھے۔ شرجیل تاجی سے بہت پیار کرتا تھا۔ تاجی شرجیل کے ساتھ ماموں اور مامی کا بھی خیال رکھتی تھی۔ کسی کو بھی یقین نہ آتا تھا کہ گاؤں کی رہنے والی لڑکی اتنی سگھڑ ہو سکتی ہے۔

وقت گزرتا گیا شمائلہ دو پیارے بچوں کی ماں بن گئی مگر شاید شرجیل کے گھر دیر تھی۔ دو سال گزر گئے مگر کوئی خوشی کی امید نہ بنی۔ شرجیل سے چھوٹے بھائی شیری کی بھی شادی ہو گئی۔ اسے بھی خدا نے بیٹا عطا کیا۔ تاجی بہت اداس رہتی۔ مگر شرجیل اسے ہمیشہ ہی یہی کہتا جب خدا کو منظور ہو گا وہ ہمیں بھی اولاد جیسی نعمت عطا کر دے گا۔

سات سال پر لگا کر گزر گئے پھر شاید اللہ کو رحم آ گیا۔ تاجی امید سے تھی۔ گھر میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ شرجیل بہت خوش تھا۔ وہ ہر وقت تاجی کا خیال رکھتا تھا اور پھر وہ گھڑی آ گئی۔ جس کا تاجی کو انتظار تھا۔

تاجی کا بی پی کم تھا۔ وہ ویسے ہی بہت کمزور تھی۔ ڈاکٹر نے آپریشن بتا دیا تھا۔ تاجی نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ شرجیل کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا وہ بار بار بیٹے کو گود میں لے کر چوم رہا تھا۔ پھر وہ خوشی سے اٹھا اور ماں سے کہا۔

''امی جان میں چاہتا ہوں اللہ کی راہ میں پورے ہسپتال میں مٹھائی تقسیم کروں۔'' یہ کہہ کر وہ گاڑی کی چابی لے کر کمرے سے نکل گیا۔ شرجیل تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا تاکہ وہ تاجی کے ہوش میں آنے سے پہلے وہ مٹھائی لے کر پہنچ جائے۔ اچانک تیزی سے آتے ہوئے ٹرک نے ایک زوردار ٹکر ماری، شرجیل گاڑی نہ سنبھال سکا۔ وہ تیزی سے فٹ پاتھ سے گاڑی سمیت ٹکرایا۔

شرجیل کے سر میں بہت خطرناک چوٹ آئی اور وہ موقع پر ہی وہ ہلاک ہو گیا۔ ادھر تاجی کو ہوش آیا تو اس نے ساس سے پوچھا ''شرجیل کہاں ہے؟'' شرجیل کی لاش گھر پہنچ چکی تھی جہاں اس کے والد اور بہن شمائلہ سکتے میں اسے دیکھ رہے تھے۔ محلے والوں نے ان کے والد کو سنبھالا

اور یہ اطلاع خاموشی سے ماں اور تاجی کی والدہ کو سنائی۔ شرجیل کی والدہ سنتے ہی سکتے میں آ گئیں۔

''میرا بچہ مٹھائی لینے گیا تھا۔ موت لے کر آیا ہے۔'' تاجی کی والدہ نے بڑی مشکل سے اپنے دل کو سنبھالا۔ انہیں اپنی تاجی کو سنبھالنا تھا۔ جو ایک خوشی پا کر دوسری خوشی کھو بیٹھی تھی۔

تاجی بار بار شرجیل کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ آخر ماں نے اسے تسلی دی۔

''بیٹا شرجیل کے دفتر میں کسی ورکر کا انتقال ہو گیا۔'' تمہیں معلوم تو ہے، وہ کسی کا دکھ نہیں برداشت کر پاتا۔ بس وہ وہاں مصروف ہو گیا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کے پاس اسپتال میں تھیں۔ وہاں شرجیل کا جنازہ گھر میں پڑا تھا۔

☆......☆......☆

شمائلہ غش پہ غش کھا رہی تھی۔ اس کا لاڈلا بھائی کفن میں لپٹا پڑا تھا۔ ماں اپنے جوان بیٹے کی لاش دیکھ رہی تھی۔

ہر آنکھ اشکبار تھی۔ آخر تمام لوگ تاجی سے کب تک چھپتے۔ تاجی کی ماں کب تک نہ روتی۔ تاجی کو جب پتا چلا تو وہ سکتے میں آ گئی۔ بڑی مشکل سے اسے ماں اور بھائیوں نے سکتے سے باہر نکالا۔ تاجی اپنے بچے کو کلیجے سے لگائے رو رہی تھی۔ ماں سمجھا رہی تھی۔

شائلہ بھتیجے کو گود میں لے کر تاجی کو تسلیاں دے رہی تھی ۔مگر تاجی کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ اس نے شرجیل کا آخری دیدار بھی نہیں کیا تھا۔ وقت بہت برا مرہم ہوتا ہے۔

☆......☆☆

آہستہ آہستہ تاجی سنبھل رہی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام تنزیل رکھا۔ جب وہ بہت پیار سے تنزیل کو بلاتی تو ایسا لگتا جیسے سامنے شرجیل کھڑا ہے۔ تنزیل تین سال کا ہو گیا تھا۔ وہ دادا دادی کی جان تھا۔ جب بھی کوئی خوشی کا تہوار آتا۔ تاجی غمگین ہو جاتی۔ تاجی نے تنزیل کو نرسری میں داخل کرا دیا۔ تنزیل ماں کا سہارا بنتا چلا گیا۔ تاجی نے تنزیل کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیا۔ ماں اور بھائیوں نے بہت کوشش کی وہ گاؤں آ جائے تاکہ اس کی دوسری شادی کر دی جائے۔مگر تاجی نے منع کر دیا۔

☆......☆☆

ربیع الاول کا مبارک مہینہ قریب تھا۔ شرجیل کے گھر میں نیاز اور میلاد کا اہتمام ہوتا تھا۔ شرجیل جب زندہ تھا تو وہ ہر تہوار کا اہتمام کرتا تھا۔مگر آج تنزیل نے ماں کو حکم دیا کہ مما سب کچھ پاپا کرتے تھے ویسے ہی ہوگا''۔

تاجی حیران ہو کر تنزیل کو دیکھ رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ شرجیل حکم دے رہا ہے۔ وہ فیصلہ کر کے اٹھی وہی سب ہوگا جو شرجیل کرتا تھا۔

اس نے ساس سسر کو بتایا اور ساس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

بس میری بچی جس طرح تُو نے ہماری زندہ رہنے کی آس بڑھائی ہے۔ تو شرجیل کی جگہ ہمارا سہارا ہے۔ ورنہ ہم تو اسی دن مر چکے تھے۔

تاجی مسکرا رہی تھی۔ کیوں کہ اب تنزیل میں ہی ساری خوشیاں دیکھنی تھیں۔ تاجی کے ارمانوں کی دنیا ایک بار پھر سے آباد ہو گئی تھی۔ اب شرجیل کی جگہ خدا نے تنزیل کو اس گھر کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔ وہ شرجیل کا عکس بن کر ہمیشہ ان کے سامنے تھا۔

☆☆......☆☆

منتظر سویرا ہے

بتول خان نیازی

زندگی کے فیصلے لمحوں میں کرنے والوں کے لیے ایک آئینہ داستان، لاہور سے

آج اس کا اسکول میں آخری دن تھا۔ میٹرک کے امتحان کا آخری پرچہ دینے کے بعد افشاں ہمیشہ کی طرح مطمئن اور پُر امید تھی کہ اس کا رزلٹ بہت بہتر آئے گا۔ ایک طرف اسے خوشی تھی کہ اس کا امتحان بہت اچھا رہا تھا اور دوسری طرف اسے یہ دُکھ تھا کہ آج اسکول میں اس کا آخری دن تھا۔ اپنی دوستوں اور سہیلیوں سے بچھڑ جانے کا غم اسے شدت سے ستا رہا تھا۔ اس کی طرح ہی اس کی سہیلیوں کی بھی بچھڑنے کے غم میں آنکھیں نم تھیں اور وہ بہت اداس تھیں۔ اسکول کی زندگی کا دور سب سے خوبصورت ہوتا ہے۔ اس میں تفکرات سے بے فکر مستقبل کے سہانے خواب بُنے اور زندگی کے نئے راستے چُنے جاتے ہیں۔

سائرہ، افشاں کی دوست نے پوچھا۔ ''افشاں تمہارا کیا خیال ہے؟ رزلٹ کے بعد کالج جوائن کرو گی؟'' افشاں بولی۔

''نہیں سائرہ، میرے لیے کالج جوائن کرنا مشکل ہو جائے گا۔ بابا کو اتنا کام ہوتا ہے۔ بھیا ویسے ہی ہاسٹل میں ہوتے ہیں۔ اور پھر کوئی اور لڑکی بھی گاؤں سے کالج نہیں جاتی۔ میرے لیے بہت مشکل ہو جائے گا کہ میں اس قدر جھمیلوں اور مسائل کے ہوتے کالج میں داخلہ لے سکوں۔''

افشاں تم بہت محنتی لڑکی ہو۔ تمہیں اس طرح اپنی تعلیم ترک نہیں کرنی چاہیے بلکہ آگے پڑھ کر اپنا اچھا مستقبل بنانا چاہیے۔ تعلیم ہی تمہاری زندگی ہے اور اچھی زندگی تعلیم سے عبارت ہے۔'' سائرہ نے افشاں کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔

افشاں سائرہ کی بات سن کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''نہیں...... نہیں تم نے یہ سوچا بھی کیسے کہ میں اپنی تعلیم یہیں پر ختم کر رہی ہوں۔ اچھے رزلٹ کے بعد میں اوپن یونیورسٹی کے ذریعے اپنی تعلیم جاری رکھوں گی، یہی طریقہ میرے لیے بہتر رہے گا۔''

اس کے بعد نم آنکھوں سے سب سہیلیاں ایک دوسرے سے گلے ملیں، گلے شکوے دور کیے، ملتے رہنے کے وعدے وعید ہوئے اور خوشی خوشی رخصت ہونے کے لیے اللہ حافظ کہہ کر سب جدا ہو گئیں۔

☆......☆......☆

پر لگی رفتار کے ساتھ وقت ایسے ہی تیزی سے گزرتا چلا گیا۔ اس کی کئی ہم جماعت لڑکیوں کی شادی ہو گئی، اور کئی نے اس کے ساتھ اپنی تعلیم کو جاری رکھا۔ اور خواہش مند ہونے کے باوجود بھی کئی لڑکیوں نے اپنی تعلیم کا

سلسلہ وسائل نہ ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا۔

ایک دن اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ افشاں نے کال ریسیو کی تو اس کی عزیز دوست سائرہ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"تمہیں سال گرہ بہت مبارک ہو میری دوست۔ تمہاری ہر خواہش پوری ہو۔ اللہ تمہارا نصیب خوشیوں سے بھر دے۔"

"افشاں ہر دعا پر بس آمین آمین کہتی رہی۔ کیسے یاد آ گئی جناب کو آج ہماری۔" افشاں شوخ لہجے میں بولی۔

"بس ایسے ہی، خود ملی نہیں رابطہ کیا تھا، سوچا تھا اب تمہاری برتھ ڈے پر ہی کال کروں گی اور تمہیں حیران کروں گی۔" سائرہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"بہت شکریہ تمہارا کہ تم نے آج بھی میرا جنم دن یاد رکھا ہوا ہے۔ اور سناؤ کیسی مصروفیات چل رہی ہیں آج کل۔"

"اچھا میں بعد میں کال کروں گی۔ ٹھیک ہے۔" سائرہ نے بڑی جلدی میں کہا اور فون بند کر دیا۔

☆......☆......☆

"ایف اے کے بعد افشاں نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے اوپن یونیورسٹی کو ہی چنا تھا اور اس نے وہاں داخلہ بھی لے لیا تھا۔ اوپن یونیورسٹی سے یہ سہولت تھی کہ گھر بیٹھے خط و کتابت کے ذریعے پڑھائی جاری رہ سکتی تھی۔ افشاں جس ماحول میں رہ رہی تھی، اس میں تعلیم حاصل کرنے کا یہی ایک مؤثر ذریعہ تھا۔

ایک دن افشاں کی اماں نے اس کو اپنے پاس بلا کر کہا۔

" افشاں میرا بیٹا، میں تم سے ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں اور تمہارے بابا چاہتے ہیں کہ اب ہم تمہارے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔" یہ بات افشاں نے سنی تو حیرت بھری نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور بولی۔

"مگر ماں میں نے ابھی تک ایسا کچھ نہیں سوچا۔

میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔ میں اپنی زندگی میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ بابا خود ہی تو چاہتے تھے کہ میں اپنی تعلیم جاری رکھوں اور ایک قابل شخصیت بنوں۔ آج ایسی کیا بات ہوگئی کہ آپ دونوں نے اچانک میری شادی کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

ماں نے کہا۔'' بیٹا جب بیٹیاں بڑی ہو جاتی ہیں۔ تو ماں باپ کے دل میں یہ بات خود بخود لاگو ہو جاتی ہے کہ ان کی بیٹی اپنے گھر کی ہو جائے۔ اس کا اپنا اچھا سا گھر ہو۔ وہ اپنے گھر میں خوش رہے' یہی ان کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔ تیرے بابا تجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ تم تو جانتی ہو گاؤں کے حالات اور لوگوں کو بھی۔ تم سے چھوٹی لڑکیاں ہیں جن کی شادی ہو چکی ہے اور ہنسی خوشی سے اپنا گھر بسا رہی ہیں۔ ہم بھی جانتے ہیں تمہاری کچھ خواہشات ہیں۔ مگر بیٹا جب اللہ چاہے گا تو تیری خواہش ضرور پوری ہوگی۔''

'' مگر ماں میں اپنی زندگی میں آپ دونوں کا سہارا بننا چاہتی ہوں۔ بھائی ابھی بہت چھوٹا ہے۔ بابا کب تک اکیلے گھر کی ضرورتوں کے لیے حالات سے لڑتے رہیں گے۔'' افشاں نے ماں سے کہا۔

یہ سن کر ماں بولی۔'' بیٹا اپنی جگہ تم ٹھیک ہو۔ لیکن یاد رکھو۔ وقت کی ایک عادت بہت اچھی ہوتی ہے کہ جیسا بھی ہو۔ وہ کبھی رُکتا نہیں گزر جاتا ہے۔ اللہ سب بہتر کرے گا مجھے تجھ سے کوئی گلہ نہیں۔ یہ تو ہماری خواہش تھی جو میں نے تمہارے سامنے پیش کی ہے لیکن ہم اپنی بیٹی پر زور زبردستی تھوڑا کریں گے۔ تم اچھی طرح سوچ لو، پھر جو تمہارا دل کہے، وہ ہی جواب دینا۔'' ماں نے افشاں کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اُٹھ کر باہر کی طرف چلی گئی۔

رات ہوتے ہی افشاں کے باپ عبداللہ نے اس کی ماں سے پوچھا۔'' افشاں سے کیا بات ہوئی۔ اس نے کوئی جواب دیا۔'' تو اس کی ماں نے بتا دیا جو کچھ افشاں نے کہا تھا۔

عبداللہ نے کہا۔'' دیکھو رشتہ بہت اچھا ہے۔ ایسے رشتے روز روز نہیں آتے۔ نمبردار نے خود مجھ سے بات کی ہے کہ وہ اپنے بیٹے ناصر کی شادی افشاں سے کرنا چاہتا ہے۔ اس کا بیٹا کچھ دن پہلے ہی باہر ملک سے آیا ہے اور تم تو جانتی ہی ہو کہ پورا گاؤں میری بیٹی کی بہت تعریف کرتا ہے۔ نمبردار بھی افشاں کے اخلاق سے بہت متاثر ہے۔ آج نہیں تو کل اس کی شادی کرنی ہے۔ تو اتنا اچھا رشتہ کیوں ہاتھ سے جانے دیا جائے۔''

'' مگر عبداللہ افشاں نہیں چاہتی کہ اس کی ابھی شادی ہو۔'' افشاں کی ماں نے اپنے شوہر سے کہا۔

'' نہیں افشاں کی ماں، اسے نہیں چلے گا۔ تم ایک بار پھر سے اس سے بات کرو اور اسے بتاؤ کہ نمبردار اپنے بیٹے ناصر کا رشتہ لے کر آیا ہے۔ شاید وہ مان جائے۔''

'' ٹھیک ہے میں پھر سے اس سے بات کروں گی۔ شاید وہ مان جائے۔'' افشاں کی ماں نے کہا۔

'' ہاں ہاں ضرور بات کرو اس سے اور اس کو مناؤ، پتا نہیں دوبارہ اس طرح کا رشتہ آتا بھی ہے یا نہیں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ یہ رشتہ ہاتھ سے نہ نکلنے دیا جائے۔'' افشاں کے باپ نے کہا اور اس کی ماں یہ سن کر خاموش ہوگئی۔

افشاں بھی اپنی ماں کی باتوں پر بار بار غور کرتی رہی۔ وہ چارپائی پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہی اور سوچتی رہی کہ بابا اور ماں نے میری ہر خواہش پوری کی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ میری ہر ضرورت کا خیال رکھا ہے۔ شاید جو فیصلہ وہ کر رہے ہیں وہی میرے لیے بہتر ہو۔ اس لیے اب میرا بھی فرض بنتا ہے کہ اپنی من مانی کرنے کے بجائے مجھے ماں بابا کا دل نہیں توڑنا چاہیے بلکہ ان کی بات مان لینی چاہیے۔

شاید ان کا یہ فیصلہ میرے لیے بہت بہتر ہو۔ میں نے اگر ان کی بات نہ مانی تو وہ کیا سوچیں گے کہ میں آج اپنی زندگی کی خواہشات کے لیے ان کا فیصلہ رد کر رہی ہوں۔ اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔'' نہیں مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پتا نہیں میری ماں اور بابا کیا سوچ رہے ہوں گے۔ میں صبح ماں سے خود بات کروں گی۔'' یہ سوچ کر وہ سوگئی۔

☆......☆......☆

صبح کا سورج جب نمودار ہوا تو عبداللہ اٹھتے ہی اپنی زمینوں کی طرف چلا گیا اور ماں اپنے کاموں میں لگ گئی۔ افشاں اپنی ماں کو دیکھتی رہی کہ ماں مجھ سے کہیں

ناراض تو نہیں۔ اس طرح کے کئی خیالات اس کے دماغ میں منڈلاتے رہے۔ کافی دیر جانچنے کے بعد کہ ماں کا موڈ اچھا ہے۔ افشاں نے اپنی ماں کو آواز دی۔

''ماں...... '' ماں نے آواز سنتے ہی اُس کی طرف دیکھا اور اس کے پاس آ گئی۔

''ماں اگر میں تم سے کہوں کہ میں اس رشتے کے لیے راضی ہوں تو۔''

ماں نے سنتے ہی حیرت زدہ ہو کر بولی۔ ''کیا۔'' اس کے چہرے پر خوشی کی لہر چھا گئی۔

مجھے آپ دونوں کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہے، بلکہ میں بہت خوش ہوں۔'' افشاں نے اپنا فیصلہ بڑے تحمل سے ماں کو سنا دیا۔

یہ سن کر ماں نے خوشی سے اس کو گلے سے لگا لیا اور کہا۔ ''کیا تُو یہ نہیں پوچھے گی کہ کہاں تیری قسمت کا فیصلہ ہوا ہے؟''

افشاں نے کہا۔ ''جو کوئی بھی ہو گا میرے لیے اچھا ہی ہو گا۔ تب ہی تو تم دونوں نے میرے لیے اس کو چنا ہے۔''

''لیکن بیٹا یہ جاننا بھی تیرا حق ہے کہ تیری تقدیر کا مالک کون بننے والا ہے؟''

''تو بتا دو کون ہیں وہ لوگ؟'' افشاں نے استفہامیہ لہجے میں کہا۔

''نمبردار اپنے بیٹے کے لیے تمہارا رشتہ مانگ رہا ہے۔'' اماں نے خوش ہو کر بتایا۔

نمبردار کا نام سنتے ہی افشاں چونک گئی۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''ماں اس نے میرا رشتہ مانگا اپنے بیٹے کے لیے۔''

''ہاں جی...... '' ماں نے سرشاری سے کہا۔ ''تم اسے بہت پسند ہو۔ ان کو تم جیسی بہو کی ضرورت ہے۔''

''مگر ماں ان کی برادری میں اتنی لڑکیاں ہیں تو انہوں نے مجھے ہی کیوں اپنے بیٹے کے لیے چُنا۔''

افشاں نے حیرت میں ڈوب کر ماں سے پوچھا۔

ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا وہ سب میری بیٹی جیسی تھوڑی ہی ہیں۔ حسن میں یکتا، کردار گفتار میں بے مثل۔'' یہ کہہ کر ماں نے افشاں کو پیار کیا اور وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔

سورج ڈھلتے ہی بابا گھر آئے۔ معمول کے مطابق انہوں نے اپنی بیٹی کو آواز دی۔

''افشاں......افشاں بیٹا پانی لے کر آؤ۔'' اس کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

نمبردار کے بیٹے سے رشتے کی بات کو سن کر وہ سرشاری کے عالم میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی تھی۔ وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولی۔

''جی بابا......ابھی لے کر آئی۔''

افشاں نے نیچی نگاہوں کے ساتھ پانی اپنے بابا کو تھمایا اور شرمیلے انداز سے اندر چلی گئی۔

عبداللہ کو اپنی بیٹی پر بڑا ناز تھا، جب اس طرح وہ اس کو ادب اور تمیز میں دیکھتا تو بہت خوش ہوتا۔ اس کو یقین تھا کہ میری بیٹی جس گھر میں بھی جائے گی، اس گھر کی شان بن جائے گی۔ وہ اپنے ماں اور بابا کو کبھی تکلیف نہ دے گی۔ یہی وجہ تھی آج کا فیصلہ بھی اس نے ماں باپ کی خوشی کے لیے قبول کیا تھا۔

☆......☆......☆

افشاں کی ماں نے موقع پاتے ہی عبداللہ سے بات کی۔

''ہماری بیٹی نے ہماری خوشی کے لیے یہ رشتہ قبول کر لیا ہے۔'' یہ سن کر تو عبداللہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اسی سرشاری میں اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔

''مجھے اپنی بیٹی پر پورا یقین تھا کہ وہ ضرور مان جائے گی۔ میں آج نمبردار سے ملا تھا۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ میری بیٹی آپ لوگوں کو شکایت کا موقع نہیں دے گی۔ وہ بہت باصبر اور باعزت ہے مگر میری ایک شرط ہے کہ شادی کے بعد بھی میری بیٹی کو پڑھنے سے نہ روکا جائے۔''

انہوں نے کہا کہ ان کا بیٹا کافی پڑھا لکھا ہے اور ان کو پڑھی لکھی بہو کی ضرورت ہے جو پردیس میں ان کا ساتھ دے سکے۔ اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے نبھا سکے۔ وہ خود بھی تعلیم کو بہت اہمیت دیتا ہے اور پڑھے لکھے لوگوں کی قدر کرتا ہے۔ اسی لیے اس نے افشاں کو

پسند کیا اور اس کا رشتہ طلب کیا ہے۔

''کیا سچ میں۔'' افشاں کی ماں نے حیرانگی سے کہا۔

''جی، افشاں کی ماں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ شادی کے بعد ہماری بیٹی کو انگلینڈ اپنے ساتھ لے جائے گا اور وہ پڑھائی لکھائی میں ہماری بیٹی کی مدد بھی کرے گا۔ یہ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔'' بابا نے خوش ہو کر بتایا۔

یہ سب کچھ سُن کر وہ بہت خوش ہوئی اور اُداس بھی کہ اس کی بیٹی اتنی دور چلی جائے گی۔ اس سے رہا نہ گیا اور وہ اُٹھ کر افشاں کے پاس، اسے ساری حقیقت بتانے کے لیے بے تابانہ چلی آئی۔

جب افشاں نے خوشی کے عالم میں ماں کو دیکھا تو بولی۔

''ماں...... کیا بات ہے، خیر ہے۔ تیرا چہرہ اس قدر مسرور اور تُو اس قدر مسحور کیوں ہے؟''

''بیٹا آج میں بہت خوش ہوں۔ آج میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ آج میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہی ہے۔'' ماں جذبات میں بہے اور کہے چلی جا رہی تھی۔

افشاں مسکرائی۔ اس نے کہا۔'' ایسی کیا بات ہو گئی ہے۔''

''بات ہے نہ بیٹا۔ تجھے دکھ تھا نہ کہ میرے سپنے ٹوٹ جائیں گے۔ میں اپنی تعلیم نہیں جاری رکھ پاؤں گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہے۔ تو اپنی زندگی کا ہر خواب پورا کرے گی میری بچی۔''

''ماں تُو کہنا کیا چاہ رہی ہے۔ کچھ مجھے بھی تو پتا چلے کہ میری ماں کو کون سی خوشی کی دولت ملی ہے۔''

ماں نے کہا اگر تو بھی سنے گی تو میری طرح نہال ہو جائے گی سن کر......

''بیٹا تمہارے بابا نے ان سے بات کی کہ وہ تجھے تعلیم سے نہیں روکیں گے۔ تو جتنا پڑھنا چاہے گی وہ تجھے پڑھائیں گے اور تیری مدد بھی کریں گے۔ تو پتا ہے انہوں نے کہا کہا؟''

''کیا کہا...... ماں؟'' افشاں نے حیرانی و تجسس میں ڈوبی آواز میں پوچھا۔

انہوں نے کہا کہ وہ تمہیں روکنے کے بجائے تمہاری مدد کرے گا۔ اور تم کو اپنے ساتھ انگلینڈ لے جائے گا تاکہ تو خوب پڑھے اور پڑھ لکھ کر ان کا نام روشن کرے۔''

''سچ ماں۔'' افشاں خوش ہو کر بولی۔

''ہاں جی، میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' ماں نے بھی خوش ہو کر کہا تو افشاں خوشی سے اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کی نئی چمک پیدا ہو گئی جو اس کی زندگی کا اصل مقصد تھی۔

''ماں میں بہت خوش ہوں۔ بہت خوش ہوں میں۔ مجھے بابا پر یقین تھا کہ بابا کبھی بھی ایسا فیصلہ نہیں کریں گے، جس سے مجھے صدمہ پہنچے۔ میں بہت خوش ہوں ماں۔'' افشاں نے خوشی سے ماں کے ہاتھوں پر بوسہ دیا اور ماں سے لپٹ گئی۔ آج اسے ماں پر بڑا پیار آ رہا تھا۔ کافی دیر وہ ماں کے ساتھ چمٹی رہی اور سرشاری میں باتیں کرتی رہی۔

''اب تم سو جاؤ......'' یہ کہہ کر ماں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ افشاں کی آنکھوں کی نیند خوشی کی روشنی میں مٹ گئی۔ رات بھر وہ خوشی کے سپنے دیکھتی رہی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی زندگی اسی طرح بدلنے جا رہی ہے۔

☆......☆......☆

ایک صبح جو افشاں کے مطابق اس کی زندگی میں خوشیوں کی کرنیں منڈلائیں گی۔ اس کی آنکھوں میں ہزاروں اُمیدوں کے چاند چمکتے نظر آئے ناصر اس کی زندگی میں خوشبو پھیلانے والا پھول بن کے آنے والا تھا۔ وہ بے چین تھی کہ اپنی زندگی کی اتنی بڑی خوشی کی خبر کس سے شیئر کرے۔ کس کو بتاؤں کہ میری زندگی نے کیسا رُخ بدلا ہے۔ جو سُن کر دھک سے رہ جائے۔ ایسے میں یکدم اسے اپنی دوست سائرہ کا خیال آیا۔'' او...... میں تو بھول ہی گئی۔ سائرہ کی تو مجھے یاد نہیں رہی۔ ابھی اس کو کال کرتی ہوں اور اسے زندگی کی سب سے بڑی خبر بتاتی ہوں۔'' وہ اٹھی اور اپنی دوست کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''ہیلو سائرہ...... السلام علیکم!'' اُس نے خوشی کا سلام سائرہ کو دیا۔

سائرہ نے پوچھا۔ ''خیر تو ہے آواز تیری بڑی مچل رہی ہے۔ مجھے تو کسی بڑی خبر کی خوشبو آ رہی ہے۔ کیا بات ہے۔''

افشاں نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہاں جی...... خیر ہے۔''

''آج کیسے یاد آئی میری۔'' سائرہ نے پوچھا۔

''بس یار آ گئی، کبھی کبھی تو یاد آنی بھی چاہیے نا۔ کیوں...... تمہارا کیا خیال ہے؟'' افشاں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔

''کیا؟'' سائرہ نے حیرانگی سے پوچھا۔

''میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ ماں بابا نے میرا رشتہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' افشاں نے شرماتے، جھجکتے لہجے میں کہا۔

''اچھا......'' سائرہ نے کہا۔ ''یہ تو خوشی کی بات ہے نا۔ مجھے تو پہلے ہی خوشبو آ گئی تھی کہ...... لیکن تُو تو کہتی تھی کہ میں شادی نہیں کروں گی۔ میں اپنی زندگی میں کچھ بڑی شخصیت بنوں گی۔ آج آخر ایسی کیا خاص وجہ ہے کہ شادی کے نام پر اتنی خوش ہو رہی ہو۔ کون سا شہزادہ مل گیا ہے میری پری کو۔'' سائرہ نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

''میری خوشی کی وجہ شادی نہیں ہے سائرہ، بلکہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میری زندگی میں مجھے کامیابی دلانے کے لیے سہارا مل رہا ہے۔'' افشاں نے اپنا جوابی مدعا بیان کیا۔

''اچھا...... آخر کون ہیں وہ لوگ؟'' سائرہ نے تجسس سے کہا۔

''اصغر نمبردار کا بیٹا ناصر، جو کچھ دن پہلے ہی انگلینڈ سے آیا ہے۔ انہوں نے بابا کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھ پر پڑھائی کے معاملے میں کوئی پابندی عائد نہیں کریں گے بلکہ وہ مجھے اپنے ساتھ انگلینڈ لے کر جائیں گے اور جتنا ہو سکے گا میری پڑھنے لکھنے میں مدد کریں گے۔ اب تم ہی بتاؤ، میں خوش نہ ہوں تو اور کیا کروں......؟'' افشاں نے چہک کر سائرہ سے سوال کیا۔

''واہ یار...... تیری تو قسمت جاگ گئی۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ یہ سب کیسے ہوا؟'' سائرہ نے حیرانی سے کہا۔

''بس اللہ کی مرضی ہے۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ مجھے میرے رب پر بہت بھروسا ہے۔ تم تو جانتی ہو سائرہ میں نے اپنے رب کی یاد کو کبھی دل و دماغ سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔'' افشاں عاجزانہ لہجے میں سائرہ کو بتا رہی تھی۔

''سائرہ......'' سائرہ کی ماں نے آواز دی۔

''افشاں امی مجھے آواز دے رہی ہیں، میں تجھ سے بعد میں بات کرتی ہوں۔'' افشاں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔'' اور یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

☆......☆......☆

نمبردار اور بابا کی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ عبداللہ نے نمبردار سے افشاں کے رشتے کی بات آگے بڑھانا شروع کر دی۔ ایک روز نمبردار نے کہا کہ ''میرے بیٹے کو واپس بھی جانا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ کام جتنا جلدی ہو سکے ہو جائے۔''

عبداللہ نے بھی کہا۔ ''کیوں نہیں...... نمبردار صاحب...... میں پوری کوشش کروں گا۔ اب رشتہ ہو گیا ہے تو جلدی ہو یا دیر، کیا فرق پڑتا ہے۔ میری طرف سے آپ کل ہی آ جائیں، بات بھی پکی کر لیں۔ رسم بھی کر لیں اور دن بھی طے کر لیتے ہیں۔''

نمبردار نے زور کا قہقہہ لگایا اور عبداللہ کو گلے سے لگا لیا۔ ''یہ ہوئی نہ بات۔ دل خوش کر دیا عبداللہ تُو نے۔ احسان مانوں گا میں تیرا۔ تو نے میرا مان رکھا۔''

''نہیں نمبردار صاحب احسان کی کیا بات ہے۔ فرض ہے جتنا جلدی ادا ہو جائے اتنا بہتر ہے۔'' عبداللہ نے کہا وہ کچھ دیر نمبردار کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا اور پھر گھر چلا آیا۔

گھر میں آتے ہی اس نے افشاں کی ماں سے بات کی کہ کل نمبردار اپنے قریبی رشتہ داروں کو لے کر آ رہا ہے افشاں کی بات پکی کرنے کے لیے۔ اس کے ساتھ ہی وہ شادی اور رخصتی کی تاریخ طے کریں گے۔

''مگر اتنی بھی جلدی کیا ہے عبداللہ؟'' افشاں کی ماں نے حیرانی سے کہا۔

وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے بیٹے کو واپس جانا ہے۔

وقت بہت کم ہے اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ یہ کام جلدی سے ہو جائے۔'' یہ سن کر وہ خاموش ہو گئی۔
ان کی بھی خواہش تھی کہ ان کی ایک ہی بیٹی ہے اور وہ کسی قسم کی رسم میں کوئی کمی نہ چھوڑیں۔ افشاں کی ماں نے کہا کہ 'ظاہری بات ہے عبداللہ' ہم اکیلے تو یہ رسم کر نہیں سکتے۔ افشاں کی پھوپو، ماموں یہی تو کچھ رشتے ہوتے ہیں جن کو شریک کرنا ضروری ہوتا ہے۔
عبداللہ نے کہا۔'' تم اس کی فکر نہ کرو وہ سب لوگ بھی آ جائیں گے۔ بس تم اپنے بھائی کو فون کر دو اور اِدھر میں بھی اطلاع کر دیتا ہوں۔ مجھے فکر ہے کہ کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔ میری بیٹی کے کسی شگن میں کوئی کمی نہ رہے۔ پورے گھر کی اچھے سے صفائی کرا دو۔ میں سارا سامان آج ہی لے آتا ہوں۔ افشاں کو بھی بتا دو۔ ٹھیک ہے نا۔'' یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ افشاں کی ماں نے اپنے بھائی کو بتایا اور شادی کی دعوت دی اور اس نے افشاں کو بھی بتایا کہ کل اس کی رسم کے لیے وہ لوگ آ رہے ہیں۔
افشاں ہچکچائی۔
''ماں اتنی جلدی۔''
''ہاں...... بیٹا ان کے بیٹے کو واپس جانا ہے۔ اس لیے ان کو جلدی ہے۔ میں نے تمہارے ماموں کو بھی بتا دیا ہے۔ ایمان اور مزمل بھی پوچھ رہے تھے تیرا بہت حیران ہو رہے تھے وہ لوگ بھی کہ اتنی جلدی کی کیا ضرورت تھی۔''
''ماں یہی تو میں بھی بول رہی تھی۔'' افشاں نے حیران کن لہجے میں کہا، لیکن ایک طرح سے افشاں خوش بھی تھی اور گھبرائی ہوئی بھی۔ وہ خود بھی بہت حیران تھی کہ یہ سب اتنی جلدی کیوں ہو رہا ہے؟

☆......☆......☆

کام کرتے ہوئے پتا نہیں چلا اور شام ہو گئی۔ سورج تھک کر مغرب کی جانب ستانے کے لیے چلا گیا۔ درختوں پر پرندوں نے بسیرا کرنا شروع کر دیا۔ دن رات کی چادر اوڑھنے کی تیاری کرنے لگی اتنے میں دروازے پر گھنٹی بجی۔
عبداللہ نے دروازہ کھولا۔ ایمان اور مزمل اندر آئے۔ سب کو سلام کیا۔
''ارے واہ افشاں، یہ کیا سرپرائز تھا۔ تم کتنی چھپی رستم نکلی ہو۔ پھوپو اتنی جلدی افشاں کی شادی کر رہی ہو۔ مجھ کو پتا چلا تو مجھ سے رہا نہیں گیا فوراً میں نے بھائی سے کہا کہ مجھے پھوپو کے گھر چھوڑ کر آؤ۔ ایمان نے آتے ہی شکوہ کیا۔
''دیکھ لو پھوپو! اس نے کتنا مجبور کیا کہ آج ہی ہم آپ کے سامنے ہیں۔'' مزمل نے کہا۔
مزمل اور ایمان افشاں کے ماموں زاد بھائی بہن تھے۔
''نہیں بیٹا۔ یہ تو میں نے ہی کہا تھا کہ ایمان اور مزمل کو بھیج دینا، کچھ کام وغیرہ میں بھی میرا ہاتھ بٹائیں گے اور افشاں کا بھی دل لگا رہے گا۔'' یہ سن کر مزمل اور ایمان مسکرائے۔
مزمل خاموش افشاں کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اتنی جلدی یہ سب کیسے ہو رہا ہے؟ ان کے باپ کی خواہش تھی کہ افشاں کی شادی مزمل سے ہو۔ افشاں کا ماموں اس سے بہت پیار کرتا تھا اور مزمل بھی افشاں کو بہت چاہتا تھا۔ ان کی آپس میں بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ لیکن مزمل کبھی بھی اپنے دل کی بات اپنی زبان پر نہ لے کر آیا تھا، شاید اسی لیے وہ آج پچھتا رہا تھا۔ آخر وہ خود ہی کو موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا کہ اس نے اظہارِ محبت میں اتنی دیر کیوں کر دی کہ وقت ہاتھوں سے نکل گیا۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہو گئی ہے کہ اگر میں کچھ کرنا بھی چاہوں تو نہیں کر سکتا کیوں کہ تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ اب صرف لکیر محبت کو وقت کی لاٹھی سے پیٹا جا سکتا ہے اور بس، اب پچھتاوے سے کیا ہوت جب......!
رات گئے وہ لوگ جاگتے رہے۔ کام بھی کافی تھا کرنے کے لیے، ہر طرف کام کا انبار لگا ہوا تھا۔
عبداللہ بہت خوش تھا اور افشاں کی ماں بھی۔ اور اس کا بھائی بھی جو اس سے عمر میں کافی چھوٹا تھا۔

☆......☆......☆

صبح ہوتے ہی گھر میں مہمانوں کی گہما گہمی شروع ہو گئی۔ کئی عزیز و اقارب شادی میں شرکت کے لیے آئے۔ سب بہت خوش تھے کہ اتنی اچھی نامور اور

باعزت جگہ پر افشاں کی شادی ہو رہی ہے۔

آخر وہ وقت بھی آ گیا۔ جس کا لوگوں کو شدت سے انتظار تھا۔ ہر طرف سلامت، مبارک کی آوازیں بلند ہوئیں۔ عجب سرشاری کا عالم تھا۔ افشاں کے ماں باپ نے ان کے آنے کے لیے بہت اہتمام کیا ہوا تھا۔ ہر طرف خوشیاں رقصاں تھیں۔ نمبردار بہت حیران ہوا تھا یہ سارا اہتمام اور خوشی دیکھ کر۔ یہ سب انہوں نے اپنی بیٹی کی عزت کے لیے کیا تھا کہ اگر کبھی بھی کسی قسم کی بات ہو تو ہماری بیٹی کو افسوس نہ رہے کہ میری شادی کی کسی رسم میں کوئی کمی تھی۔

سارے مہمانوں میں خوشی کا سماں تھا۔ لوگ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا۔

آخر لڑکے کی ماں بولی۔ ''افشاں کو لے کر آؤ، ہم اپنی رسم کریں گے۔ وقت کافی ہو گیا ہے۔''

عبداللہ نے کہا ''کیوں نہیں۔ ضرور ضرور، وہ اب آپ کی امانت ہے ہمارے پاس۔'' سب مسکرائے۔ عبداللہ نے کہا۔

''ایمان بیٹا جاؤ...... افشاں کو لے کر آؤ۔''

''جی انکل کیوں نہیں، میں ابھی ان کو لے کر آتی ہوں۔''

ایمان جب اوپر والے کمرے میں گئی تو افشاں خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ ایمان مذاق میں بولی۔ ''واہ جی واہ، تم تو ایسے شرمائی دلہن لگ رہی ہو جیسے انہوں نے آج ہی تجھ کو ساتھ لے جانا ہے۔ چلو اٹھو مہارانی جی میرے ساتھ آؤ...... میں تمہیں لینے آئی ہوں، نیچے سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

افشاں شرماتے لجاتے اٹھی۔ اس نے اپنا دوپٹا سنوارا اور سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آ گئی۔ لوگ اس کی آمد کے منتظر تھے۔ آتے ہی نیچی نگاہوں کے ساتھ سب کو سلام کیا۔

نمبردار اور اس کی بیوی یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ عبداللہ نے اتنی پیاری اور باعزت بیٹی کو سب کی نظروں سے کس طرح بچا کے رکھا ہوا تھا۔

نمبردار کی بیوی نے بڑے پیار سے اسے اپنے پاس بٹھایا اور اپنے خاندان کے مطابق رسم کرنا شروع کی۔ ماموں نے کہا۔ ''چلو بھائی مبارک ہو۔ اللہ میری بیٹی کے نصیب اچھے کرے۔ دنیا کی تمام خوشیوں سے تیرا دامن بھر جائے۔ بیٹا...... تمہارے ماموں کی دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔''

ان کی آواز میں ایک دکھ تھا۔ جو انہوں نے چھپا کے رکھا۔ دل میں آرزو تھی جو ظاہر ہی نہ ہونے دی۔ مزمل بھی سب کچھ خاموشی سے دیکھتا رہا۔ میں سوچتا رہا کہ افشاں کا جیون ساتھی کیسا ہے کس طرح ہے۔ کس عادت کا ہے۔ اس کو کبھی دیکھا تک نہیں۔ میں نے خود اس کو نہیں دیکھا۔

یہ سب کچھ سوچے بغیر پھوپو نے افشاں کے رشتے کے لیے کیسے ہاں کر دی۔ مجھے افشاں سے بات کرنی چاہیے۔ بے شک وہ میرا نصیب نہیں لیکن میں اسے اپنی رائے سے ضرور آگاہ کروں گا۔ کچھ لوگ دیکھنے میں کچھ اور حقیقت میں بہت مختلف ہوتے ہیں۔ پھر اپنے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ میں یہ سب کچھ کیوں سوچ رہا ہوں۔ سب اتنے خوش ہیں، میں خواہ مخواہ میں پریشان ہو رہا ہوں۔ تقریب کے اختتام پر عبداللہ اور افشاں کی ماں نے سب مہمانوں کو ہنسی خوشی رخصت کیا۔

افشاں بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

مزمل نے افشاں کو اس طرح اکیلے دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا۔ وہ اس کے پاس گیا اور ہچکچاتا ہوا بولا۔

''افشاں میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں کہو۔'' افشاں نے مزمل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو تمہارا حق ہے مزمل۔ تم میرے اچھے دوست ہو۔''

''اچھا تو سنو۔'' میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کیا تم اس رشتے سے خوش ہو۔'' افشاں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

''آپ کو کیا لگتا ہے مجھے دیکھ کر۔ میں بہت خوش ہوں مزمل۔ اس رشتے کی وجہ سے نہیں کہ میرا اتنے بڑے خاندان میں رشتہ ہوا ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ مجھے سہارا مل رہا ہے میری زندگی میں مجھے کچھ بننے کا۔''

مزمل بولا۔ ''بہت خوشی کی بات ہے کہ تم خوش ہو۔ کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟ کس مزاج کا ہے۔ ملک سے باہر رہتا ہے، اس کی عادات کیسی ہیں؟''

''مزمل تم کیوں پریشان ہو رہے ہو۔ اپنے لحاظ سے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مگر شاید تم یہ بھی جانتے ہو کہ کوئی کہیں بھی رہے، جس طرح بھی رہے، وہ اپنے آباؤ اجداد کے رسم و رواج اور طور طریقوں کو نہیں جھٹلا سکتا۔ اور وہ تو آخر ہمارے گاؤں کے نمبردار کا بیٹا ہے۔ وہ اس معاملے میں اور بھی زیادہ ذمے دار ہوگا۔''

''سوری افشاں میرا مطلب تم کو پریشان کرنا نہیں تھا۔''

''نہیں مزمل ایسی کوئی بات نہیں۔'' افشاں نے نرمی سے کہا۔

''اچھا میں اب چلتا ہوں۔ اللہ حافظ۔'' مزمل نے حسرت بھری نگاہوں سے افشاں کی طرف دیکھا اور چلا گیا۔ دوسری طرف نمبردار اپنے گھر پہنچا تو ڈیرے پر اس کے بیٹے نے اپنے دوستوں کے ہمراہ جشن کا اہتمام کیا ہوا تھا۔

مغربی طور طریقوں میں پلنے والا ناصر شراب و شباب و کباب کا شیدائی، کھلتی کلیوں کا رس چوس کر اڑنے والا بھنورا۔ ڈسکو میں شریک ہونے والا اپنی موج مستی میں مگن تھا۔

اپنے باپ کو دیکھا تو بولا۔ ''اوئے فادر، اپنے بیٹے کا رشتہ مبارک ہو۔'' لڑکھڑاتا ہوا باپ کے گلے لگ گیا۔ ''آخر تو نے ان لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ایک معصوم بچی کو اپنے بیٹے کی خدمت گزاری کے لیے چن لیا۔'' دونوں نے بڑا سا قہقہہ لگایا۔

دوسری جانب افشاں اپنے خواب بن رہی تھی اور اپنی کامیابیوں کے سنہرے موتی پرونے میں مصروف تھی۔ مگر اس کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ مزمل نے جو کچھ اس سے کہا تھا وہ اس کے دماغ سے نہیں جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی، کیا مزمل کی باتیں بامعنی ہیں۔ میں تو واقعی ناصر کو نہیں جانتی۔ اب مجھے تھوڑا بہت اس بات میں دلچسپی لینا چاہیے۔ مجھے اس کے بارے میں جاننا چاہیے۔'' یہ بات اس نے اپنے دماغ میں ٹھان لی۔

اس نے خود سے کہا ''مگر میں اس کے بارے میں کیسے جان سکتی ہوں۔ کیوں نہ مزمل سے ہی میں اس بارے میں بات کروں، وہ ضرور میری مدد کرے گا۔ لیکن بابا اور ماں کو پتا چل گیا تو وہ بہت ناراض ہوں گے کہ مجھے ان پر بھروسہ نہیں تھا اس لیے میں نے ایسا کیا۔ اور اگر نمبردار کو خبر ہوگئی کہ میں ان کے بارے میں معلومات حاصل کر رہی ہوں تو ایک اور مصیبت گلے پڑ جائے گی۔'' پھر افشاں نے پکا ارادہ کرلیا کہ انجام جو بھی ہو مجھے اس بارے میں پتا لگانا چاہیے۔

افشاں کے ماں باپ اس رشتے سے بہت خوش تھے۔ صبح سویرے پورا گھر ان کی مسکراہٹوں سے مہک رہا تھا۔

وہ تذبذب کا شکار تھی کہ کون سا راستہ اور کس طرح مزمل سے بات کرے۔ پھر اس نے کیا۔ یہی بہتر رہے گا کہ امی کو لے کر ماموں کے گھر جاؤں اور اس بہانے مزمل سے بھی بات کرلوں گی۔

اس نے اپنی ماں سے بات کی۔ ''ماں جی میں نے سوچا ہے کہ ماموں کے گھر چکر لگا آتے تو۔ وہ کیا ہے کہ میں ایمان سے ملنا چاہتی ہوں۔ بس کچھ کام تھا اس سے۔''

''میں بھی تیرے بابا سے یہی کہہ رہی تھی۔ کچھ سامان وغیرہ لینا ہے تو بازار سے ہو آتی ہوں۔ ہم دونوں ساتھ چلیں گی۔''

''ماں آپ مامی جی کو ساتھ لے جانا۔'' اس نے اپنے دل میں سوچا کہ موقع بہت اچھا ہے مزمل سے بات کرنے کا۔ ساتھ میں ایمان بھی ہو جائے گی۔ اس طرح سوچوں میں ڈوبی افشاں کو دیکھا تو ماں بولی۔ ''کیا بات ہے بیٹا کیا سوچ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں ماں بس ایسے ہی......''

''بیٹا میں کہہ رہی تھی تم میرے ساتھ ہی چلنا تو زیادہ بہتر ہوگا۔ مجھے جو سامان لینا ہے تمہارے لیے ہی لینا ہے۔ زیادہ بہتر ہوگا کہ تم اپنی پسند کا لو۔''

افشاں مسکرائی۔ ''ماں آج تک آپ نے جو بھی لیا میرے لیے بہت اچھا لیا اور جو بھی چنا بہت اچھا چنا...... اور اب بھی جو بھی لو گی میرے لیے بہت قابل ہوگا۔ اور مجھے پسند ہوگا۔''

ماں نے کہا۔ ''اچھا میرا بیٹا کوئی بات نہیں میں تمہاری مامی کو ساتھ لے جاؤں گی۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ جلدی سے یہ کام نپٹا کر گھر واپس لوٹ آئیں گے۔''

گاؤں سے شہر تک جانے کے لیے رکشے کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ اتفاق سے وہ بھی جلد ہی مل گیا۔

راستے بھر افشاں یہی سوچتی رہی کہ کیا وہ غلط فہمی کا شکار ہے یا پھر یہ اس کا وہم ہے۔ کیا چیز ایسی ہے آخر جو اس کو اُکسا رہی ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اور اگر اُس کا یہ وہم سچ ثابت ہوا تو وہ کیا کرے گی۔ راستہ ختم ہو گیا مگر وہ اپنے دماغ سے ان سوالوں کا جواب وصول نہیں کر پائی۔

''افشاں کہاں کھوئی ہوئی ہو، اترو بیٹا۔''

''او...... سوری ماں...... پتا ہی نہیں چلا۔'' پھر وہ دونوں گھر کی طرف چل پڑیں۔ ابھی کچھ فاصلے پر ہی گئی تھیں کہ مزمل کو جاتے ہوئے دیکھا۔

''ماں وہ دیکھو مزمل جا رہا ہے۔'' افشاں نے کہا۔

ماں نے اس کو آواز دی۔

مزمل انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور مسکرایا۔ ان کے پاس آیا...... اپنی پھوپو سے گلے ملا۔ اور افشاں کو سلام کیا۔

''ماں اور مامی جی نے بازار جانا ہے اور میں نے اور ایمان نے گھر پر رہنا ہے، اس لیے اگر آپ بھی ٹھہر جاتے تو اچھا ہوتا۔'' مزمل نے افشاں کو اس طرح اصرار کرتے دیکھا تو مان گیا۔

''السلام وعلیکم!'' افشاں نے گھر میں داخل ہوتے ہی سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!'' جواب ملا وہ ایمان سے گلے ملی۔ ایمان نے اپنی ماں کو آواز دی۔

''ماں...... دیکھو کون آیا ہے۔''

''کون ہے بیٹا؟'' یہ کہتے ہوئے وہ باہر آئی۔

''ارے واہ...... کمال ہے۔ آج کیسے ٹائم نکال لیا۔'' ایمان کی ماں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''بس دیکھ لو۔''

''کیسے آنا ہوا۔''

بس بھابی بازار جانا تھا۔ کچھ سامان خریدنا تھا۔ وقت کم ہے پتا ہی نہیں چلتا اور دن گزر جاتا ہے۔ اس لیے میں نے کہا کہ تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گی۔ سامان خریدنے میں تھوڑا آسانی ہو جائے گی۔'' افشاں کی ماں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''جی ضرور کیوں نہیں۔ اچھا کیا تم آ گئی ہو۔''

''ایمان جاؤ بیٹا اپنی پھوپو اور بہن کے لیے چائے پانی کا بندوبست کرو۔''

''نہیں بھابی...... کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ناشتا کر کے آئے ہیں۔ آپ بس جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ اور میرے ساتھ چلو۔'' افشاں کی ماں نے کہا۔

''اتنی بھی کیا جلدی ہے باجی۔''

''نہیں بھابی بس پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے۔ گھر بھی واپس جانا ہے۔''

''بچے گھر پر ہی رہیں گے اور ہم ہو آتے ہیں۔'' افشاں کی ماں نے کہا۔

''یہ ٹھیک رہے گا پھر...... میں ابھی تیار ہو کے آ جاتی ہوں۔ بس تم لوگ کچھ دیر انتظار کرو۔'' ایمان کی ماں یہ کہہ کر تیار ہونے کے لیے چلی گئی۔

کچھ دیر بعد وہ تیار ہو کر آ گئی۔ ''بیٹا ہمارے آنے تک کھانا وغیرہ تیار کر دینا۔ سارا سامان کچن میں پڑا ہوا ہے۔ اگر کچھ بازار سے منگوانا ہو گا تو بھائی سے کہہ دینا۔ اور مزمل بیٹا دروازہ لاک کر دینا اور گھر کا خیال رکھنا۔'' ماں نے ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں چلی گئیں تو...... مزمل نے دروازہ لاک کر دیا اور اندر آ گیا جہاں افشاں اور ایمان بیٹھی ہوئی تھیں۔

مزمل اپنے دل و جان سے افشاں کو چاہتا تھا مگر کبھی وہ یہ بات زبان پر نہ لایا تھا۔ بس حسرت بھری نگاہوں سے افشاں کی طرف دیکھا اور کہا۔

''ہاں جی! اب بولو...... کیوں روکا ہے مجھے تم نے، کوئی خاص کام تھا۔''

''بس ایسے ہی کچھ خاص نہیں۔ بات کرنی تھی آپ سے ایک۔'' افشاں نے کہا۔

''کیا بولو۔''

افشاں گویا ہوئی۔ ''مزمل جو کچھ تم نے مجھ کو ناصر کے بارے میں کہا میرے دل و دماغ سے وہ باتیں محو نہیں ہو رہی ہیں۔ مجھ سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ میں کیا کروں اور کیا نہیں۔''

''کیا مطلب۔'' مزمل نے حیرت سے کہا۔

''تم نے کہا تھا کہ میں جس سے شادی کرنا چاہ رہی ہوں، میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ اور یہ سچ ہے کہ میں واقعی میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اس کی اپنی برادری اتنی بڑی ہے، اتنی لڑکیاں ہیں تو انہوں نے مجھے ہی کیوں چنا۔ پلیز مزمل کچھ کرو۔ میں

بہت گھبرا رہی ہوں۔ میں بہت سوچ رہی ہوں پر مجھ کو سمجھ نہیں آ رہی میں کیا کروں۔ میں ماں بابا سے بھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مگر پھر بھی پلیز مزمل......"

ایمان یہ سب سُن کر حیران رہ گئی۔

"آج میں اسی لیے آئی ہوں کہ ہم سب بیٹھ کر بات کریں گے۔ اور اس معاملے کا کوئی حل نکالیں گے۔" افشاں نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

"تم ریلیکس ہو جاؤ۔" مزمل نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "میں خود بھی ایسا سوچ رہا تھا، کیوں کہ میں نے خود کبھی اسے نہیں دیکھا۔ یہ میرا وہم نہیں ہے، بلکہ ہمارے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے اور یہ تمہارا حق بھی ہے۔ زندگی ایک لفظ تو ہے، لیکن ایک دن کا نام نہیں اور شادی تو ایک سودا ہے۔ جب خوشیاں ہی خوشیاں ہوں تو یہ چار دن کی لگتی ہے۔ اور اگر غم میں لپٹی ہو تو ایک ایک لمحہ بھی بھاری ہوتا ہے۔ بہر حال تم پریشان نہ ہو۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔ یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ نمبردار کیسا آدمی ہے۔ وہ ہمیشہ وہاں قدم رکھتا ہے جہاں سے اس کو فائدہ حاصل ہو۔" مزمل روانی سے بولتا گیا۔

"کیا مطلب......" افشاں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"دیکھو، اس کی حویلی کے پاس کی ساری زمین انکل کے پاس ہے۔ اس نے ایک بار نہیں ہزار بار کوشش کی کہ وہ یہ خرید لے، مگر انکل نہ مانے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں استعمال کر رہے ہوں۔" مزمل نے سنجیدہ انداز میں کہا۔

"اللہ نہ کرے ایسا ہو۔" افشاں نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

"اگر ایسا ہوا تو پھر۔" مزمل نے جواب دیا۔

افشاں پریشانی میں بولی۔ "میں پہلے اس بارے میں جانچ پڑتال کرلوں۔ پھر ہی کچھ سوچتے ہیں۔"

"مگر مزمل ہم کریں گے کیا۔"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ پریشان نہ ہو۔" مزمل نے افشاں کو تسلی دی۔ اتنی باتیں جاننے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ وہ بہت گھبرا گئی تھی۔

افشاں نے کہا۔ "لازمی تو نہیں ہے کہ وہ اپنے باپ کے جیسا ہو۔ یا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے پاکستان کی لڑکی ہی پسند ہو۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ باہر کا ماحول کیسا ہے۔ اور وہ یہی چاہتا ہو کہ پاکستانی لڑکی ہو۔ جس سے وہ شادی کرے۔"

"افشاں تم اپنی جگہ پر ٹھیک کہہ رہی ہو، مگر کچھ لوگ مذہب کو چاہنے والے اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ دنیا کے جس کونے میں بھی چلے جائیں، اپنی عزت اور مذہبی امور کو نہیں بھولتے۔ اور اپنے گھر کے ماحول کو ہم خود بناتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ باہر اچھے لوگ نہیں ہیں۔ اچھے لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ میں پہلے دن سے ہی سوچ رہا تھا۔ مگر بڑوں کا فیصلہ تھا۔ اس لیے میں خاموش رہا۔" مزمل نے افشاں کی بات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر مزمل جتنی جلدی ہو سکے پتا لگاؤ۔" اس نے کہا اور چپ کر گئی۔ مزمل سے اس طرح افشاں کی پریشانی دیکھی نہ گئی۔ اس نے دل میں تہیہ کرلیا کہ میں اس بات کی کھوج لگا کر رہوں گا۔ مجھے معلوم کرنا ہوگا کہ آخر یہ قصہ کیا ہے کہ نمبردار اور اس کا بیٹا ایک غریب مزدور کی بیٹی پر اس قدر مہربانی کیوں کر رہے ہیں۔

مزمل افشاں کی بات سُن کر کافی پریشان تھا۔ اگلی صبح وہ وقت سے پہلے ہی آفس کے لیے نکل گیا۔ پھر وہ وقت نکال کر اپنے دوست سے ملنے گیا جو کہ پیشے کے اعتبار سے ایک ڈاکٹر تھا۔ اس کے آگے اُس نے افشاں کا سارا معاملہ پیش کیا اور کہا کہ وہ اس کی اس سلسلے میں مدد کرے۔ اس کا نام غفران تھا۔ وہ بہت ذہین اور سمجھ دار تھا۔ اس نے کہا کہ ہم اگر ان کے بارے میں وہاں جا کر کچھ پوچھیں گے تو ہمیں کچھ نہیں حاصل ہوگا، الٹا شک پیدا ہوگا بلکہ اتنی جلدی ہم کچھ نہیں معلوم کر سکیں گے، بہتر یہی ہوگا کہ ہم ان سے خود ملیں اور اپنے طور پر معلومات حاصل کریں۔

یہ سُن کر مزمل بولا۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو ہمارے لیے مسئلہ کھڑا کردے گا، نمبردار ہے وہ۔"

"میں جاؤں گا تو وہ لوگ پہچانتے ہیں مجھے...... پھر کیسے ہوگا یہ سب؟"

"ارے نہیں یار تم نہیں جاؤ گے۔ وہاں میں جاؤں گا باہر جانے کے سلسلے میں، پہلے اس کے بیٹے سے اچھے تعلقات بنانے ہوں گے پھر ہی کچھ سوچیں گے۔ وہ اتنی

آسانی سے قابو نہیں آئے گا۔ بڑے پاپڑ بیلنے پڑیں گے اور پیسا بھی خرچ کرنا پڑے گا۔ وہ بگڑا ہوا نواب ہے۔'' غفران نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ مزمل نے غفران کو احتیاط برتنے کو کہا۔

غفران نے مزمل سے کہا۔ ''تم اس سلسلے میں کوئی ٹینشن نہ لو۔ بلکہ بے کر ہو جاؤ۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوگی تو میں تمہیں جلد انفارم کروں گا۔ تم بے فکر ہو کر آفس جاؤ۔'' مزمل نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور چلا گیا۔

☆......☆......☆

غفران ہاسپٹل سے ڈیوٹی آف کرنے کے بعد نمبردار کے گھر پہنچ گیا۔ نمبردار کافی خوش اسلوبی سے اس کے ساتھ پیش آیا کیونکہ وہ شہر کے بڑے ہاسپٹل کا ڈاکٹر تھا۔

''اس نے کہا۔'' میں انگلینڈ جانا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں ناصر سے ملنے آیا ہوں۔'' نمبردار نے اپنے بیٹے ناصر کو باہر بلایا۔ غفران اس سے ملا، کافی دیر بات چیت چلتی رہی۔ غفران نے اتنا کھل کر کچھ نہیں کہا کہ جس سے وہ کسی شک میں پڑ جائے۔ ابھی ان کی بات جاری تھی کہ اچانک ناصر کے سیل پر ایک کال آئی اور وہ اُٹھ کر چلا گیا۔

غفران بھی یہ کہہ کر وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا کہ میں دوبارہ چکر لگاؤں گا۔ ابھی وہ راستے میں ہی تھا کہ مزمل نے اس سے رابطہ کیا اور دریافت کیا کہ ''کیا بنا۔'' غفران نے اس کو بتایا۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے جو میں آپ سے شیئر کروں۔ میرے تعلقات ان سے بہتر رہے ہیں۔ میں دوبارہ ان سے ملوں گا اور اگر بات ہوگی تو کسی نہ کسی طرح ضرور سامنے آئے گی۔'' یہ سُن کر مزمل خاموش ہو گیا اور کہا کہ وہ ان سے دوبارہ ملے اور کوشش کرے۔ غفران کی بھی پوری کوشش تھی کہ وہ اگر کوئی بات ہے تو ضرور معلومات لے۔ آہستہ آہستہ دن گزرتے گئے۔ شادی کی تیاریاں بھی عروج پر آ گئیں۔

☆......☆......☆

غفران بار بار ان سے رابطہ کرتا رہا مگر کوئی سراغ سامنے نہ آیا۔ اس کے تعلقات ناصر کے ساتھ کافی اچھے ہو گئے۔ اس نے اپنی شادی پر غفران کو مدعو بھی کر لیا اور اس سے شادی میں شرکت کی خاص طور پر درخواست بھی کی۔ اس تمام عرصے میں غفران جب کوئی معلومات نہ لے سکا تو اس نے مزمل سے کہا۔

''میں نے بہت کوشش کی مگر مجھے نہیں لگتا کہ ایسی کوئی بات ہے جو تم سوچ رہے ہو۔ میرے خیال میں تم خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ میں نے بہت قریب سے ناصر کو دیکھ لیا ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

مزمل یہ سن کر خوش ہوا اور دل میں کہا۔ چلو اچھی بات ہے۔ میں افشاں کو بھی ابھی بتا دیتا ہوں کہ وہ بے فکر ہو جائے سب ٹھیک ہے۔ پرسوں اس کی مہندی ہے۔ لیکن اس نے بہت ٹینشن لی ہوئی ہے اس معاملے میں۔'' اس بات کا ذکر اس نے غفران سے بھی کیا۔ تو اس نے کہا۔

''ہاں جی...... ضرور...... کیوں نہیں ضرور بتاؤ۔'' پھر اس نے غفران کا شکریہ ادا کیا اور اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

پھر اس نے افشاں سے رابطہ کیا اور کہا کہ وہ اس معاملے میں کوئی ٹینشن نہ لے اور ہنسی خوشی ہر رسم نبھائے۔ ایسی کوئی بات نہیں جس کو لے کر ہم پریشان ہو رہے تھے۔'' افشاں سن کر بہت خوش ہوئی کہ چلو سب ٹھیک ہے۔'' پھر اس نے مزمل سے کہا۔

''اگر سب ٹھیک نہ ہوتا اور کچھ بھی غلط ہوتا تو ماں بابا کبھی برداشت نہ کر پاتے۔ پھر اس نے مزمل کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی وجہ سے اسے پریشانی اٹھانی پڑی۔

''نہیں افشاں ایسی کوئی بات نہیں بلکہ مجھے تو سوری کرنا چاہیے کہ اتنا آپ کو فضول میں پریشان کیا۔''

'' اچھا پلیز اب تم ٹائم سے آ جانا، پاپا اور بھائی اکیلے ہیں اور اتنا کام ہے۔'' اس نے مزمل کو یاد دلایا۔

'' ٹھیک ہے میں آ جاؤں گا، تم اپنا خیال رکھنا اور پریشان نہ ہونا۔'' یہ کہہ کر مزمل نے کال آف کر دی۔

کاشف کو اچانک ہاسپٹل جانا پڑا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مجبوری کے تحت چلا گیا۔

☆......☆......☆

دعوت نامے ہر طرف بٹ چکے تھے۔ مہندی سے ایک دن پہلے ہی افشاں کی سہیلیاں اور مہمانوں کی گہما گہمی شروع ہو گئی تھی۔ ہر طرف روشنیاں پھیل گئی تھیں۔ سارا گھر جگمگ کر رہا تھا۔ سہیلیوں کی چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق نے گھر میں رونق کو اور دوبالا کر دیا تھا۔ ہر طرف

قہقہے بکھرے ہوئے تھے۔
افشاں بھی بہت خوش تھی۔ اور ماں باپ اس سے زیادہ خوش تھے۔
مہندی کی شروعات بھی بہت دھوم دھام سے کی گئی تھی۔ نمبردار نے بھی شادی کی تیاریوں میں کوئی کمی نہ چھوڑی تھی۔ اس کے یہاں بھی میلہ لگا ہوا تھا۔ ہر طرف خوشیوں کا راج تھا۔
مہندی کی صبح نمبردار نے عبداللہ کو اپنے گھر بلایا۔ اور اس سے کہا کہ میں بہت خوش ہوں کہ تم اپنی بیٹی کی شادی میں کسی کمی کو سامنے نہیں آنے دے رہے۔ تم جانتے ہو میری برادری میں کچھ لوگ جو بھی چاہتے تھے کہ ان کا رشتہ میرے بیٹے سے جڑ جائے مگر میں نے تمہاری بیٹی کو چنا، کیونکہ وہ بہت معصوم اور باعزت لڑکی ہے اور جس انداز سے تم نے اس کی تربیت کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ جو کچھ میرے بیٹے کا ہے سب تمہاری بیٹی کا ہے۔ مگر میری برادری کے کچھ لوگ یہ سوال اٹھا رہے تھے کہ ہم زمین جائیداد والے لوگ ہیں اور آپ اس چیز سے اپنی اولاد کو محروم رکھتے ہیں۔'' میں نے ان سے کہا۔
''نہیں میری بہو کے نام کافی زمین ہے اور وہ مجھ سے بھی قابل لوگ ہیں۔'' عبداللہ یہ سن کر بولا۔
''میری بیٹی کے لیے آپ اتنا کچھ کر رہے ہو تو کیا میں اپنی اولاد کو اس خوشی سے محروم رکھوں گا۔ میں تو پہلے ہی اپنی زمین اپنے بچوں کے نام کر چکا ہوں۔ اور کاغذ بھی شام تک میں آپ کو دے دوں گا۔''
نمبردار بولا۔ ''اس کی ضرورت نہیں۔'' اس نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔
''میں تو صرف اس لیے کہہ رہا تھا کہ میری بہو کو کوئی بھی اس بات کو لے کر طنز نہ کرے۔ میں خود سے کچھ کرنا چاہتا تھا۔''
عبداللہ نے کہا۔ ''نہیں...... یہ ذمہ داری میری ہے اور میرے پاس سب کچھ ہے جو میں اپنی اولاد کی خوشی کے لیے قربان کر سکوں۔''
نمبردار اپنی پہلی سازش میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے شام تک عبداللہ سے زمین کے کاغذ وصول کر لیے، جس کی خواہش اس کے دل میں برسوں سے چھپی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

مہندی کی شام ہر طرف جشن کا سماں تھا۔ غفران بھی اس کی مہندی میں شریک ہوا۔ وہ ناصر کو دیکھتے ہی دیکھتے حیران ہوتا گیا۔ اس نے ناچ گانا عام کر رکھا تھا۔ کوٹھوں پر ناچنے والی عورتیں نصف برہنہ جسم لیے ان کے بیچ تھرک رہی تھیں۔ ناصر کے دوستوں نے ایک ہاتھ میں شراب کی بوتل اور دوسرے میں ناچنے والیوں کے برہنہ جسموں کو تھاما ہوا تھا۔ عجیب سا ماحول تھا جو کسی آدمی کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ تیز میوزک پر لہراتے جسموں نے جنگل میں منگل کا سماں باندھ دیا تھا۔ درجنوں لڑکیاں اور عورتوں نے تیز دھنوں پر اپنے آپ کو ناگن بنایا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کچھ ہی دیر میں یہ سب ایک دوسرے کو ڈسنے والے ہیں۔ ہر ایک شراب و شباب میں بدمست تھا۔ غفران نے یہ سب دیکھ کر ایسا محسوس کیا جیسے وہ ناصر سے بہت گہرے تعلقات رکھنے والے لوگ ہوں۔ ناصر بار بار ڈرنک کرتا رہا۔ اس نے اتنی ڈرنک کر لی کہ اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ غفران نے اسے اپنے کندھے سے لگایا اور کمرے کے اندر لے گیا۔ اس نے اس سے پوچھا۔
''تم نے اتنی ڈرنک کیوں کی۔'' وہ لڑکھڑاتا ہوا بولا۔
''ارے بھائی یہ تو میرا روز کا کام ہے۔'' غفران یہ سن کر اور بھی حیران ہو گیا۔ اس نے پھر پوچھا۔
''تم نے انگلینڈ شادی کیوں نہیں کی، حالانکہ تم وہاں بڑھے، وہاں تمہاری پرورش ہوئی تو تم یہاں کیوں شادی کر رہے ہو؟'' یہ سنتے ہی اس نے زور کا قہقہہ لگایا اور بولا۔
''مجھے وہاں ایک خدمت گزار چاہیے تھی اور بابا کو اس کی جائیداد، میرا وہاں ہوٹل ہے۔ وہ میرے گیسٹ ڈیل کرے گی۔ میں اس کو اس لیے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ مجھے بیوی کی نہیں ایک ملازمہ اور لڑکی کی ضرورت ہے۔ مجھے اس سے شادی کی کوئی خواہش نہیں ہے۔''
یہ سنتے ہی...... غفران کے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ اسے اپنے دوست کی بات یاد آئی۔ جس نے افشاں کو ان لوگوں سے بچانے کے لیے سہارے کی امید رکھی ہوئی تھی۔ غفران نے اسے وہیں چھوڑا اور مزمل سے ملنے کے

لیے نکل پڑا۔ وہ بار بار مزمل کے نمبر پر ٹرائی کرتا رہا۔ مگر ہر دفعہ پاور آف مل آرہا تھا۔

وہ پہلے اس کے گھر گیا اور تالا لگا ہوا دیکھ کر افشاں کے گھر گیا، مگر وہاں پر بھی مزمل سے نہ مل سکا۔ مزمل ایبٹ آباد سے کاشف کو لینے گیا تھا کہ وہ اپنی بہن کی رخصتی کی رسم میں شریک ہو سکے۔ مزمل کو کچھ بھی خبر نہ تھی کہ ایسا کچھ ہوا ہے وہ تو بے فکر تھا کیونکہ غفران اسے او کے کا سگنل پہلے ہی دے چکا تھا۔ غفران جب مزمل سے مل نہ پایا تو تھک ہار کر اپنے گھر چلا گیا۔

مزمل اور کاشف بارات سے کچھ دیر پہلے لوٹے...... بارات کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ اس نے افشاں کو اسٹیج پر ناصر کے ساتھ دیکھا تو خوش ہوا۔

مگر اپنے دل پر کنٹرول نہ کر سکا۔ اس کی نم آنکھیں اور سرخ ناک، اس کے دل کے تاثرات کا پتا دے رہی تھیں۔ وہ بے قابو ہو کر اندر چلا گیا۔ وہ خود کو سمجھاتا رہا کہ شاید وہ افشاں کے لائق نہیں تھا۔ وہ اس کو اتنی خوشی نہ دے پاتا جو اس کو ناصر سے ملنی ہے۔

عبداللہ اپنی بیٹی کو اس روپ میں دیکھ کر مسکراتا رہا۔ افشاں کے ماں بھی بہت خوش تھی۔ آخر رخصتی کا وقت بھی آ گیا۔ عبداللہ خود کو کنٹرول نہ کر پایا اور بیٹی کو سینے سے لگا کر بہت رویا اور پھر پورے ارمانوں کے ساتھ اس کو وداع کیا۔

وہ لوگ خوش بھی تھے اور دکھی بھی...... مزمل افشاں کی جدائی میں اس قدر کھو گیا کہ سے یاد ہی نہ رہا کہ میرا فون بند ہے یا...... اس نے ضروری نہیں سمجھا کہ اسے چارج کرے۔ سب لوگ خوشی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

☆......☆......☆

آج نمبردار بھی بہت خوش تھا۔ اس کے من کی مراد بر آئی تھی۔ افشاں کو گھر میں ہر رسم کے ساتھ داخل کیا گیا۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھی کہ مجھے اتنا پیار کرنے والا سسرال ملا ہے۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ افشاں کی ساس اس کو اس کے کمرے میں لے گئی۔ کمرے کو اچھی طرح سجایا گیا تھا۔ ہر طرف برقی قمقمے روشن تھے۔ ناصر ابھی باہر تھا۔ وہ مسہری پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرتی رہی۔ کافی دیر بعد جب وہ اندر آیا تو اسے دیکھ کر افشاں گھبرا گئی۔ اس نے اتنی ڈرنک کی تھی کہ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اس نے افشاں کے قریب آنے کی کوشش کی مگر اس نے خود کو بچانے کی کوشش کی۔

اس کی حرکتیں دیکھ کر وہ بہت ڈر گئی، اسے خوف آنے لگا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ صحیح انسان نہیں ہے۔ وہ گھبرا کر کمرے سے نکل کر باہر کی طرف چلی گئی۔ مگر ہر طرف پہرے داری تھی۔ اس نے چلانا شروع کر دیا۔ اس کی چیخنے کی آواز پر نمبردار اپنے کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے افشاں کو ایسے دیکھا تو سمجھ گیا کہ کوئی بات ہوئی ہے۔ وہ بہت پیار سے اسے سمجھاتا رہا۔ وہ پھر بھی چلاتی رہی اور اس سے مدد کی بھیک مانگتی رہی کہ مجھے جانے دو۔"

نمبردار نے یہ سب دیکھا تو اسے کہا کہ وہ صبح ہوتے ہی خود اس کو لے کر جائے گا۔" نمبردار کے اتنے اصرار پر وہ اس شرط پر مانی کہ اسے علیحدہ کمرے میں رکھا جائے۔ نمبردار اس کی بات مان گیا۔ پھر جب اس کو علیحدہ کمرے میں لے کر گئے تو اس کے اندر جاتے ہی نمبردار نے باہر سے دروازہ لاک کر دیا۔

افشاں کو اس کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ تو گھبراہٹ میں گھری ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد جب اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی اسے پتا چلا کہ دروازہ تو باہر سے لاک ہے۔ اب تو اسے یقین ہو گیا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ بہت چلائی مگر اس کی آہ و پکار سننے والا کوئی نہ تھا۔

نمبردار نے اپنے کارندوں سے کہا۔

"جتنی جلدی ہو سکے اس کو ختم کیا جائے۔ یہ لڑکی آرام سے سمجھنے والی نہیں۔ اس کو ابھی ہی کہیں ٹھکانے لگانا پڑے گا۔" اس نے راتوں رات ہی زبردستی افشاں کو اپنے بیٹے کے ساتھ شہر کے ایک ہوٹل میں شفٹ کر دیا۔

صبح نمبردار نے عبداللہ کو بلایا اور کہا کہ "میں معافی چاہتا ہوں رات کو آپ لوگوں کو تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ افشاں اور ناصر کی فلائٹ کی خبر رات کو اس طرح اچانک سے آ گئی کہ انہیں مجبوراً جانا پڑا۔"

یہ سن کر ان کو بہت دکھ ہوا کہ ان کی بیٹی ان سے ملے بغیر، ولیمے کی رسم کیے بغیر اس طرح پردیس چلی گئی۔ انہیں غمگین دیکھ کر نمبردار نے کہا۔

"وہ وہاں پہنچتے ہی فون کریں گے۔ آپ کا رابطہ جلد ان سے ہو جائے گا۔" عبداللہ اس میں اپنی بیٹی کی خوشی سمجھ کر خاموش ہو گیا۔ اور صبر کر لیا کہ کوئی بات نہیں

ہم سے نہیں ملی تو کیا ہوا۔ وہ خوش رہے اتنا ہی بہت ہے۔" وہ اٹھ کر خاموشی سے اپنے گھر آ گیا۔ لیکن دل پر ایک بوجھ سا رکھا محسوس کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

صبح ہوتے ہی غفران مزمل کے گھر پہنچ گیا اور سب کچھ اس کو بتایا۔ جو اس نے اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مزمل یہ سن کر اتنا گھبرا گیا کہ اُسے ہوش تک نہ رہا۔ اور بے خودی میں وہ کہتا رہا۔

"نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" مگر غفران نے کہا۔

"نہیں یہ سچ ہے۔ ہم اسے نہیں بچا پائے۔"

"نہیں غفران ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ آج آئے گی تو میں اس سے بات کروں گا۔ بلکہ میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے افشاں کا نمبر ملایا مگر اُس کا موبائل پاور آف تھا، پھر اس نے اپنی پھوپو سے بات کی تو اسے معلوم ہوا کہ ناصر اور افشاں رات کی فلائٹ سے جا چکے ہیں۔ یہ سن کر وہ اور پریشان ہوگیا۔ مگر اُس نے اپنی پھوپو سے کوئی بات نہ کی۔ پھر اس نے کہا۔

"غفران کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ چاہے مجھے ملک سے باہر ہی کیوں نہ جانا پڑے۔" مجھے کوئی بہت بڑی گڑبڑ لگ رہی ہے۔"

"مگر ہم نہیں جانتے کہ وہ باہر کس جگہ پر رہتا ہے۔ اس کا کوئی پتا بھی ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہم اس کو کیسے تلاش کریں گے۔" غفران نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں نمبردار کے پاس جاؤں گا اور پتا معلوم کروں گا مجھے یقین ہے وہ ضرور بتا دے گا۔" مزمل نے جذبات میں کہا۔

"مگر پلیز تم خود کو جتنا ہوسکے کنٹرول میں رکھو، گھر میں اور باہر کسی کو اس بات کی خبر نہ ہونے دی جائے تا کہ کوئی بات نہ نکلے اور نمبردار شک میں نہ پڑ جائے۔" غفران نے مزمل سے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

یہ سب کچھ چھپانا مزمل کے لیے بہت مشکل تھا۔ وہ غم میں ٹوٹ رہا تھا۔ افشاں کے ماں باپ بھی پریشان تھے، لیکن وہ لوگ حقیقت سے غافل تھے، اسی لیے شاید صبر کیے ہوئے تھے۔

☆......☆......☆

کچھ دن ایسے ہی گزر گئے۔ یہ ان کے لیے بہت مشکل وقت تھا۔ افشاں کو کئی طرح کی دھمکیوں سے خاموش کرا دیا گیا تھا۔ وہ انگلینڈ پہنچ چکے تھے۔ پرائے دیس میں خود کو محفوظ رکھنا افشاں کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بار بار چلاتی...... پکارتی...... کہ کوئی مجھ کو بچا لے...... مگر اس کی آواز قید کی وادیوں سے ٹکرا کر لوٹ آتی۔

مزمل نے دن رات ایک کر دیا۔ ارجنٹ ویزا لگوانے میں، مگر پھر بھی کچھ دن لگ گئے۔ نمبردار کی آنکھوں میں دھول جھونک کر غفران نے ناصر کا پتا حاصل کر ہی لیا اور اس کو خبر بھی نہ ہونے دی کہ میں اس ایڈریس کے ذریعے کیا کرنے والا ہوں۔

☆......☆......☆

مزمل نے اپنے ماں باپ سے بہانا کیا کہ وہ آفس کے ایک ضروری کام کے سلسلے میں باہر جانا چاہتا ہے۔ اس کی وہاں ارجنٹ میٹنگ ہے۔ گھر والے بھی مان گئے کہ یہ بھی نوکری کا حصہ ہے۔ لیکن مزمل نے ساری حقیقت ایمان سے بیان کر دی اور اسے خاموش رہنے کے لیے کہا اور تاکید کی کہ جب تک کہ وہ واپس نہ آ جائے وہ اس راز کو راز ہی رکھے۔

ناصر کے تشدد کا نشانہ بننے والی افشاں بے بس ہو چکی تھی۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری تھی۔ وہ بار بار مزمل کو پکارتی کہ" اس نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جس ملک میں ہوگی، اس کا ساتھ ہمیشہ اس کے سنگ رہے گا۔ اسے اپنے رب پر بھروسا تھا، لیکن انجان ملک اور انجان لوگ اور افشاں کو روز بروز دی جانے والی دھمکیاں اس کے لیے ناقابل برداشت تھیں، جو اس کا حوصلہ پست کر دیتی تھیں۔ جس لڑکی کو کبھی آنچ تک نہ آئی تھی، آج وہ تشدد کا نشانہ بنتی رہی تھی۔ ناصر زبردستی اس کو ڈرا دھمکا کر ماں باپ سے بات کراتا اور خوش رہنے کا ناٹک کرنے پر مجبور کرتا تھا۔

اس کے ہوٹل میں بے شمار لوگ آتے اور وہ وہاں اس کو محفل سجانے پر مجبور کرتا۔ نیم برہنہ رقص، شراب کے پیالے پیش کرنا، گاہک بھی اس کے اِدھر ہاتھ مارتے کبھی اُدھر، چٹکی لیتے، غرض یہ کہ ناصر نے اسے صحبت گری کے لیے رکھا ہوا تھا۔

آخر ایک دن غفران اور مزمل بھی ایک فضائی کمپنی کے ذریعے لندن پہنچ گئے۔ نئے دیس کی رونقیں دیکھ کر ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر اترتے ہی انہیں کسی اور ہی دنیا میں آنے کا احساس ہوا۔ برہنہ پنڈلیوں والی میمیں اونچی ہیل کی سینڈلیں پہنے کھٹ کھٹ ادھر سے اُدھر کولہے مٹکاتی، کمر لچکاتی آتی جاتی نظر آئیں۔ ایئرپورٹ سے باہر آئے ان کی نظریں خیرہ ہوگئیں۔ ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے نیم برہنہ گوری گوری لڑکیاں دیکھ دیکھ کر انہیں پسینہ آتا رہا۔ ہوٹل کے کمرے میں بھی بڑی خوب صورت میم ان کی میزبان تھی، لیکن اس وقت ان کا ذہن صرف افشاں کی طرف تھا جو ایک باحیا لڑکی تھی اور جس کی عزت بچانے کے لیے وہ یہاں آئے تھے، ورنہ یہاں کے ماحول میں تو عزت نام کی کوئی چیز نہ تھی۔

غفران نے مزمل سے کہا کہ جب تک میں نہ کہوں تم ناصر کے سامنے مت آنا اور جب آنا بھی تو بھیس بدل کر آنا، تاکہ ناصر تمہیں نا پہچان سکے۔''

مزمل نے کہا۔ ''مگر یہ سب کیسے ہوسکتا ہے۔''

''تم پریشان نہ ہو میں اس کے لیے بھی کچھ سوچتا ہوں۔ مجھے پہلے معلوم کرنا ہوگا کہ افشاں ہے کدھر۔ میں اس کے گھر جاؤں گا اور پوری معلومات لوں گا۔'' غفران نے مزمل کو سمجھایا۔

''یار پلیز جلدی کرو جو کرنا ہے۔ مجھ سے اب صبر نہیں ہو رہا۔'' مزمل نے کہا۔

''پلیز مزمل یہ وقت جلد بازی کا نہیں ہے، ہمیں بہت احتیاط برتنی ہوگی، حوصلہ رکھو...... میں افشاں سے ملنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

غفران نے ناصر سے فون پر رابطہ کیا۔ ناصر یہ سُن کر بہت خوش ہوا کہ اس کا دوست ملنے آیا ہے۔ وہ اسے اپنا قریبی دوست تصور کرتا تھا۔ ناصر اسے اپنے گھر لے گیا۔ غفران نے پوری کوشش کی کہ افشاں کو دیکھ سکے مگر یہ ممکن نہ ہوسکا۔

غفران نے کہا۔ ''ارے یار ناصر بھابی کدھر ہے۔'' اس نے کہا۔ ''وہ گاؤں میں ہے۔ کچھ دن بعد اس کو بھی لے آؤں گا۔'' یہ سُن کر غفران اور پریشان ہوگیا مگر خاموش رہا۔

غفران رات کو ناصر کے ساتھ اس کے ہوٹل میں گیا۔ وہاں اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کے لیے حیرانی سے زیادہ پریشانی کا سبب بنا۔

نیم برہنہ لباس میں اس نے افشاں کو ناچتے دیکھا تو بے پناہ صدمہ اس کے دل پر گزرا۔

وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ناصر اتنا گرا ہوا آدمی ہوگا۔ اس نے جھوٹ بولا کہ افشاں گاؤں میں ہے۔ پھر یہ کہ اس نے ایک لڑکی کو رقاصہ بنادیا۔ اس نے تو بیوی بنایا تھا۔ پھر یہ سب کیا ہے؟ غفران کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے واش روم کا راستہ لیا اور جلدی سے مزمل کا نمبر ملا کر اسے کہا کہ جتنی جلد ممکن ہو وہ انگلینڈ کے کسی امیرزادے کا بھیس بدل کر ہوٹل کے اندر آجائے۔'' مزمل نے ایسا ہی کیا۔

ناصر نے جب دیکھا تو حیران ہوگیا کہ شخص میرے ہوٹل میں کس طرح آگیا۔ اِدھر جب مزمل نے افشاں کو اس حال میں دیکھا تو اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اس کی معصومیت اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ غفران مزمل سے دور ہی رہا۔ مگر اشارہ کیا کہ حوصلہ رکھو اور ریلیکس ہوکر جیسا میں نے کہا ویسا ہی کرو۔

ناصر نے امیرزادے سے کہا۔ ''تم میرے مہمان ہو بتاؤ میں تمہارے لیے کیا پیش کروں۔''

مزمل کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ''میں ایک دو دن یہاں مہمان رہوں گا اور مجھے دونوں رات خدمت کے لیے یہ خوب صورت لڑکی چاہیے۔ اس کے بدلے میں تمہیں دنیا کی قیمتی ترین چیز دوں گا۔''

وہ لالچ میں آگیا اور مان گیا۔ ناصر بہت خوش ہوا۔ اس کا تو کاروبار چمک گیا۔ رات ہوتے ہی اس نے افشاں کو ڈرا دھمکا کر مزمل کے کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی، مگر کچھ بول بھی نہیں رہی تھی۔ وہ ڈر سے کانپ رہی تھی۔ ناصر نے اسے اندر دھکیل کر باہر سے لاک کردیا۔ افشاں اور گھبرا گئی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اب اس کی عزت تار تار ہونے والی ہے اور وہ جیتے جی مرجائے گی۔

مزمل کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جب اس نے افشاں کو اس طرح پریشان دیکھا۔ پھر اس نے اپنا بھیس

اتارا اور کہا۔ ''افشاں۔''

افشاں نے جھٹ سے اس کی طرف دیکھا تو حیران ہوگئی۔ اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس کی ہچکیاں مزمل کے دل کو چھید رہی تھیں۔ مزمل نے اس کو بہت پیار کیا اور تسلی دی اور سمجھایا کہ وہ ناصر کو محسوس نہ ہونے دے۔ دو تین دن جتنا ہو سکے صبر کرے اور ہر رات اسی طرح مجھ سے ملتی رہے۔''

وہ ساری رات اس کے سینے سے لگ کر روتی رہی۔ مزمل نے سب کچھ اس کو بتایا کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچا۔ افشاں بار بار مزمل سے یہی کہتی رہی کہ رات ختم نہ ہو، نہ صبح ہو کہ میں تجھ سے دور ہوں اور نہ اس درندے کی شکل دیکھوں۔''

مزمل کی کوشش تھی کہ جلد سے جلد اس کو یہاں سے لے جاؤں۔ غفران نے بہت ساتھ دیا مزمل کا۔ ساری کوششیں اسی کی تھی۔ سارا پلان اس کا تھا۔ مزمل تو غم کے عالم میں خود کو بھی بھول گیا تھا۔

دوسرے دن غفران مزمل سے ملا اور اس سے کہا۔ ''آج دوسری رات ہے، آج جس طرح بھی ممکن ہو، افشاں کو لے کر یہاں سے نکلے۔''

''مگر یہ کیسے ہوگا۔'' مزمل سے حیرانگی سے پوچھا۔

''ناصر جب شراب کے نشے میں بے خود ہو جائے گا تم یہاں سے اس کو لے کر نکل جانا۔''

مزمل یہ پلان سن کر بہت خوش ہوا۔ افشاں کو زندہ سلامت دیکھ کر وہ بہت مضبوط ہو گیا تھا اور اس کا بھی حوصلہ بڑھ گیا تھا۔

رات ہوتے ہی افشاں کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

مزمل نے افشاں سے کہا۔ ''بس...... جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ ناصر کا کھیل ختم ہو گیا۔ کچھ گھنٹے اور انتظار کرو۔ میں تمہیں یہاں سے ہمیشہ کے لیے لے جاؤں گا۔ غم کا یہ عالم تھا کہ ایک گھڑی کے لیے بھی افشاں کے آنسو خشک نہ ہو پاتے۔ لیکن مزمل نے آکر اسے نئی زندگی دی تھی۔

غفران نے عقل مندی سے کام لیا۔ اس نے ناصر کو خوب شراب پلائی۔

ناصر جب شراب کے نشے میں ڈوب گیا تو اسے نیند کے انجکشن لگا دیے اور جب وہ مکمل بے ہوش ہو گیا تو خود ان کے پاس پہنچا اور ان کو وہاں سے نکالنے میں مدد کی۔ اور ارجنٹ فلائٹ کے ذریعے ان کو پاکستان روانہ کر دیا۔

ناصر کے ہوش میں آنے تک غفران بھی وہاں سے جا چکا تھا۔ یہاں آکر غفران نے افشاں کے اغواء کرنے اور تشدد کا نشانہ بنانے پر پولیس میں F.I.R کٹوا دی اور تمام ثبوت پیش کیے۔

مزمل پورے سفر میں افشاں سے اپنی باتیں کرتا آیا اور وہ ہر بات کی جو وہ نہیں کہہ پایا تھا۔ اس نے برسوں کی اپنے دل میں چھپی محبت بھی افشاں کر دی تھی۔

افشاں کو بچانا اتنا آسان نہیں تھا...... مگر قدرت نے اس کو تحفظ دیا اور اس کی زندگی بچائی ناصر سلاخوں کے پیچھے چلا گیا۔ نمبردار کو خبر ہوئی تو وہ حیران رہ گیا کہ کون تھا اتنے دم کا مالک کہ افشاں کو بھی بچا لیا اور اس کے بیٹے کو بھی سلاخوں کے پیچھے کر دیا۔ اب اسے اپنی جان کی فکر ہوئی۔ مزمل افشاں کو گھر لے آیا۔ ایک دکھ کا ایسا عالم تھا کہ سب کے لیے برداشت کرنا ناممکن تھا۔ جب ساری حقیقت سامنے آئی تو عبداللہ سنتے ہی دل کے اٹیک کا شکار ہو گیا۔ ماں اپنی بیٹی کو سینے سے لگا کے اسے ہٹانے سے ڈرتی رہی کہ کہیں پھر نہ ایسا ہو جائے۔ کاشف کا جوش مارتا خون یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا اور اس نے نمبردار کو گولیوں سے چھلنی کر دیا اور خود پولیس میں پیش ہو گیا۔ واقعہ ہی ایسا تھا تمام گواہ اور ثبوت کے بعد اس کو کچھ مہینوں کی سزا ہوئی۔ مزمل نے بھی ان تھک محنت سے اپنی کھوئی افشاں پالی مگر بہت وقت کی ضرورت تھی۔ جوان تمام کے زخموں کے لیے مرہم ثابت ہوتا۔

عبداللہ کو کیا ملا...... اپنی بیٹی کی خوشیاں تلاش کرتے کرتے اندھے غم میں کھو گیا۔ کاش وہ صبر کرتا اور فرق جان کر اپنی بیٹی کے لیے دیکھ بھال کر ہم سفر چنتا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ہمیشہ اپنے جیسا، اپنا ہم پلہ، اپنے جوڑ کا ہم سفر چنو۔ شادی بیاہ کے فیصلے زندگی بھر کا بندھن ہے۔

افشاں نے شدید دکھوں کے بعد خوشی کا ابدی گھر پا لیا ہے۔ مزمل اس کی خوشیوں کا محور اور زندگی کا راستہ ہے۔ دونوں بہت خوش ہیں اور چین کی زندگی جی رہے ہیں۔ غفران اب بھی کبھی کبھی ان سے ملنے آتا ہے، کیوں کہ اب وہ بھی ایک زر فشاں کی بانہوں میں قید ہو گیا ہے۔

☆☆......☆☆

آٹھویں سچ بیانی

ہوا کا رُخ بدلنا چاہتی ہوں

منعم اصغر

رحیم یار خان سے، اُس دوشیزہ کی کتھا، جس نے مردوں کے اس معاشرے میں اپنی بہادری کا سکہ منوالیا

ویسے تو صائمہ ایک پڑھے لکھے اور کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کے پاس کسی بھی چیز کی کمی نہیں تھی۔ وہ نا تو بہت ہی زیادہ امیر تھے۔ نا وہ بہت زیادہ غریب تھے۔ بس اچھی ہی گزر بسر ہو جاتی تھی۔ صائمہ کی دو بہنیں اور ایک ہی بھائی تھا۔ اس کے ابو ایک سرکاری ملازم تھے۔ اس لیے ان کی تنخواہ بھی معقول تھی اور ان کے بچے بھی فضول خرچی نہیں کرتے تھے۔ آج بھی صائمہ ان کی لاڈلی تھی اور اب اس کا وہ رشتہ ڈھونڈ رہے تھے۔ صائمہ تمام بہنوں سے بڑی تھی اس لیے اس کی عمر بھی شادی کی ہو رہی تھی اور اب سکینہ اس کے لیے پریشان رہنے لگی تھی اور اب تو صائمہ کی تعلیم بھی مکمل ہو گئی تھی۔ اس نے قریبی اسکول میں نوکری کر لی تھی۔ جب اس نے اجازت لینے کے لیے ابو سے بات کی تو وہ بھڑک گئے۔

''ابو جی میں نے آپ سے ایک بات کرنی تھی۔'' صائمہ باپ کے پاس گئی جہاں وہ چولھے کے پاس بیٹھ کر حقہ پی رہے تھے۔ اور صائمہ نے انگلیاں مروڑتے ہوئے ابو سے کہا تو وہ مسکرا کر کہنے لگی۔

''ہاں بول صائمہ کیا چاہیے تجھے؟'' ابو نے میٹھے لہجے میں پوچھا تو صائمہ کو کچھ اور ہمت ملی ابو ایسے ہی تھے۔ فوراً پوچھ لیتے تھے۔ کہ کس چیز کی ضرورت ہے اور جب بھی کسی چیز کا نام وہ زبان پر لاتی تب چاہے وہ چیز کتنی بھی مہنگی کیوں نا ہوتی وہ ضرور خواہش پوری کرتے تھے۔

پھر صائمہ نے کہا۔ ''ابو جی جو گھر کے نزدیک ایک اسکول کھلا ہے۔ اس میں مجھے نوکری کی آفر ملی ہے اور تنخواہ بھی اچھی ہے......'' وہ ابھی بتا رہی تھی کہ ابو نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔''

تو اس کا مطلب تو وہاں جا کے نوکری کرے گی؟ ہاں بول میں نے تجھے اس لیے پڑھایا ہے کہ تم ایک دن میرے لیے پیسے کماؤ گی؟ کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کہیں بھی جانے کی۔ ابھی میں زندہ ہوں اور مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ میں تم لوگوں کو پال سکوں۔'' ابو ایک دم بھڑک اٹھے اور صائمہ کی ساری ہوا نکل گئی۔ پھر وہ وہاں سے چلی گئی۔

اس کے کچھ دنوں بعد ہی ابو نے خود اجازت دے دی اور وہ بھی خوش ہو گئی۔ اس طرح وہ اسکول جانے لگی تھی۔ البتہ تنخواہ اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن اتنی ضرور تھی کہ وہ اپنے ابو کا کچھ بوجھ بانٹ لے۔

پھر نوکری کو سال ہو گیا اور پھر وہاں کا پرنسپل بھی اسکول کا چینج ہو گیا۔ وہ پرنسپل صائمہ کو بہت بری نظروں سے گھورتا تھا لیکن یہ بات اس نے کسی کو نہیں بتائی تھی۔

☆......☆......☆

امی جی یہ لیں اس ماہ کی پے۔'' صائمہ نے مسکراتے ہوئے تنخواہ کے پیسے امی کو دینے لگی تو اس نے نوٹ کیا کہ اُس کی امی جی خوش ہو گئی تھیں۔ اس لیے وہ فوراً چونک گئی کیوں کہ تنخواہ لیتے وقت امی سو باتیں سناتی تھیں۔ تب جا کر وہ پیسے لیتی تھیں لیکن آج کوئی بات ضرور تھی۔

امی کیا بات ہے۔ آج آپ بہت خوش نظر آ رہی ہیں؟'' صائمہ نے معنی خیز نگاہوں سے ماں کو دیکھ کر پوچھا تو وہ اور بھی مسکرا دی۔

''ہاں بھئی خوش کیوں نا ہوں۔ آخر کو میری خواہش پوری ہونے والی ہے۔ امی بھی اسی انداز میں بولیں تاہم صائمہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، جب ہی امی پھر سے بولیں۔

''ارے پگلی میں کس لیے خوش ہوں تم سمجھ نہیں سکو گی۔ چلو میں ہی بتا دیتی ہوں۔ تمہارے لیے رشتہ آیا ہے۔'' امی نے خوش ہو کر بتایا تو صائمہ ایک دم چیخ پڑی۔

نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔'' وہ اس طرح زور سے بولی کہ امی گھبرا گئیں۔ ارے ''صائمہ کیا ہوا؟'' وہ گھبرا کر اٹھ گئی۔

''میں شادی نہیں کروں گی۔'' وہ کہہ کر چلی گئی اور سکینہ مائی نے اپنے سر پیٹ لیا۔

اب میں بھی اسے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے تو اس نے ڈرا ہی دیا تھا۔ خیر رشتہ تو بہت اچھا ہے۔ اللہ کرے بات بن جائے۔'' سکینہ مائی خوش ہوتے ہوئے کچن میں صائمہ کے لیے کھانا نکالنے چلی گئی۔

☆......☆......☆

اگلی صبح صائمہ سکول جانے کے لیے تیار ہونے لگی تیار ہو کر ناشتا کرنے کچن میں آ گئی، جہاں امی گرما گرم پراٹھے بنائے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی ناشتا کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی ساتھ ہی ماں کو خواہش بھی ظاہر کر دی۔

"امی آج دوپہر کے کھانے میں کھچڑی بنالیں" صائمہ نے مسکراتے ہوئے بات مکمل کی۔ اور اماں نے بھی ہاں کہہ دی۔

☆......☆......☆

صائمہ راستے میں چلتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ کتنے دن ہوگئے تھے۔ کہ وہ اپنے دونوں بہنوں سے نہیں ملی تھی۔ دراصل عظمیٰ اور شاہینہ نے اپنی پسند سے شادی کی تھی۔ جس پہ امی ابو بہت خفا تھے۔ یہ نہیں تھا کہ ان دونوں نے بھاگ کر شادی کی تھی نہیں بلکہ شادی تو گھر میں ہی ہوئی تھی اور وہ بھی پورے رسم و رواج کے ساتھ لیکن پھر بھی امی ابو خفا تھے۔ کہ دونوں نے اپنی پسند سے شادی کی تھی۔

اگر میں نے کسی کو پسند کرلیا تو......؟ نہیں نہیں میں کیوں کسی کو پسند کروں گی اس نے فوراً ہی یہ خیال اپنے دماغ سے نکال دیا۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھی جب پیچھے سے ہارن کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر دیکھا تو پیچھے پرنسپل اظہر ہی تھے۔ وہ گاڑی سے باہر نکلے اور صائمہ کے پاس آگئے۔

"چلیے میں اسکول جارہا ہوں۔ آپ بھی اس میں بیٹھ جائیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے تو صائمہ غصے سے سرخ ہوگئی۔

"نو سر میں چلی جاؤں گی۔" اس نے کہا اور تیز تیز چلتے ہوئے اسکول پہنچ گئی۔

اسکول آتے ہی اس نے سکون کی سانس لی اور پھر اس دن تو پرنسپل نے حد ہی کردی تھی۔

وہ دفتر سے حاضری رجسٹر لینے گئی۔ تو پرنسپل نے اُسے اچانک چھوا تھا وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی تھی اور بھاگ کر کلاس روم میں چلی گئی اور وہاں آکر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ ساری کلاس پریشان ہوگئی تھی۔ ایک ٹیچر نے اسے روتا ہوا دیکھا تو اسے اسٹاف روم میں لے آئی جہاں باقی ٹیچر بھی موجود تھیں۔

"کیا ہوا صائمہ آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟" ایک ٹیچر نے آگے بڑھ کر پوچھا اور وہ زور زور سے رونے لگی۔ اور پھر اس نے سب کچھ بتادیا جسے سن کر سب شاکڈ میں رہ گئیں۔

"یہ جھوٹ ہے۔ تم سر اظہر کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔" سب ہی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تو وہ ہکا بکا سب کو دیکھنے لگی۔

"تم لوگ سمجھ کیوں نہیں رہیں میں سچ کہہ رہی ہوں۔" صائمہ نے ہاتھ باندھ کر کہا تھا لیکن کسی نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا تھا اور سب باہر نکل گئی تھیں اور وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ پیچھے کھڑا پرنسپل اظہر مسکرا رہا تھا۔

☆......☆......☆

پھر گھر تک بھی کھچڑی نہ کھائی نہ کچھ بس وہ بہت شرمندہ تھی۔ سب سے نظریں چرا رہی تھی۔ جیسے غلطی ہی اسی کی ہے پھر سال ختم ہونے پر پرنسپل نے تمام اساتذہ کو ایک ہوٹل میں پارٹی دی تھی۔ صائمہ وہاں جانا نہیں چاہتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ وہاں جائے پھر اس کے ذہن میں کچھ کلک ہوا اور وہ دل ہی دل میں مسکرا دی۔

☆......☆......☆

جنوری کو پارٹی تھی اور وہ وہاں چلی گئی، وہ جانتی تھی کہ وہاں کچھ نہ کچھ ہوگا اور ہوا بھی۔

وہ کولڈ ڈرنک پی رہی تھی جب پرنسپل نے پیچھے سے اسے ایک نظر دیکھا اور وہ سمجھ گئی کہ وہ اسے ہی دیکھ رہے ہیں۔ اس نے جان بوجھ کر اپنے فراک پر جوس گرایا۔

"او مائی گاڈ! ایم سوری فرحانہ! آپ کے اوپر تو نہیں آیا۔" صائمہ نے ساتھ بیٹھی ٹیچر سے پوچھا تو وہ فوراً بولی۔

"نو نو اٹس اوکے بٹ آپ کے کپڑے؟" اس نے اشارہ صائمہ کے کپڑوں کی طرف کیا ڈونٹ وری واش روم سے صاف کرکے آتی ہوں ویٹر واش روم کہاں ہے؟" اس نے ویٹر سے پوچھا اور واش روم چلی گئی اور اس کے پیچھے پرنسپل اظہر بھی واش روم کی طرف چل دیے۔ جسے تمام اسٹاف نے نوٹ کیا تھا۔

☆......☆......☆

صائمہ واش بیسن کی ٹونٹی کھولے اس پر جھکی ہوئی تھی جب پرنسپل اظہر اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کردیا۔ صائمہ نے چونک کر پیچھے دیکھا سر آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" صائمہ نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

اُو صائمہ! تم تو جانتی ہو کہ میں آپ پر کتنا فدا ہوں۔ پھر بھی آپ اتنی غافل کیوں رہتی ہیں؟" وہ بات کرتے ہوئے صائمہ کی طرف آیا اور اسے بانہوں میں بھر لیا تو

صائمہ کو ہزار والٹ کا جھٹکا لگا۔

"سر چھوڑیں مجھے پلیز خدا کے لیے چھوڑ دیں۔" وہ التجا کرنے لگی لیکن وہ اُسے اور مضبوطی سے پکڑنے لگا اور صائمہ کو لگا کہ آج اسے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔ اس نے اس بارے میں تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اگر وہ واش روم سے باہر نہ نکل سکی تو پھر کیا ہوگا؟ وہ اس وقت ہاتھ پاؤں سلامت ہوتے ہوئے بھی خود کو معذور اور بے بس محسوس کر رہی تھی۔ پھر اس کا ذہن تیز تیز کام کرنے لگا اس نے ہاتھ پیچھے کر کے نل توڑنے کی ایک ناکام کوشش کی لیکن کچھ نہیں ہوا۔ پھر اس نے دیکھا کہ واش بیسن پر ایک صابن رکھا ہوا تھا اور وہ بھی گیلا...... اب کے پرنسپل اسے چومنے لگا تھا اس کے پورے جسم پر چونٹیاں ہی تو رینگنے لگی تھیں۔ ایک لڑکی کے پاس اس کی صرف عزت ہی ہوتی ہے اگر وہ بھی چلی جائے تو معاشرہ اسے سر اٹھانے نہیں دیتا۔ جینے نہیں دیتا۔ صائمہ نے ٹونٹی کھولی اور صابن کو اس میں بھگونے لگی اور کچھ سیکنڈ میں ہی وہ بالکل آٹے کی طرح ہوگیا تھا اور اس نے صابن زور سے مٹھی میں دبایا تو وہ بھربھرا ہو کر اس کی مٹھی میں بھر گیا اور اب اس نے بنا دیر کیے وہ سارا کچرا اُس کے منہ پر مل دیا۔

"یہ لو وہ زور سے چیخی اور پورا زور لگا کر اس نے اسے دھکا دیا اور باہر کی طرف بھاگی۔ وہ اپنی ٹیبل پر پہنچ کر زور زور سے رونے لگی تو پورا اسٹاف گھبرا گیا اور ہوٹل میں موجود لوگ اس کی طرف آگئے۔

کیا ہوا صائمہ کچھ ہوا ہے کیا؟ فرحانہ اٹھ کر پوچھنے لگی تو اس نے اونچی آواز میں سب بتا دیا جسے سن کر سب لوگ شاک میں آگئے۔ پھر پرنسپل اظہر نے آ کے بتایا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے تو سب لوگ جیسے یقین کرنے لگے۔

نہیں یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ صائمہ نے چیخ کر کہا تو ایک عورت بولی۔

"آپ کے پاس کیا پروف ہے؟ کہ اس نے آپ کے ساتھ زیادتی کی کوشش کی ہے؟" عورت نے پوچھا تو صائمہ نے اپنے آنسو صاف کیے اور بولی میں جانتی تھی کہ آپ لوگ میری بات کا یقین نہیں کریں گے خیر میرے پاس ثبوت ہے؟" پرنسپل کی زبان ایک بار پھر لڑکھڑائی۔

منیجر صاحب ...... کہاں ہیں؟ منیجر صاحب؟ صائمہ نے روتے ہوئے پوچھا تو ایک مرد بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا۔

"جی میڈم؟" اس نے پوچھا تھا ہاں بھیا وہ ریکارڈنگ کہاں ہے؟ صائمہ نے گھبراہٹ میں جلدی جلدی پوچھا تھا۔

"جی میڈم یہ لیں۔" مینیجر نے وہ ریکارڈنگ صائمہ کی طرف بڑھائی اور اس نے وہ ویڈیو کھول کر سب کے سامنے کیا۔

"یہ دیکھیے۔" اس نے کہا اور سب شاک میں چلے گئے۔ سب سے زیادہ تو پرنسپل شاک میں تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسا کرے گی میں نے اس کی سچائی سب کے سامنے لانے کے لیے باتھ روم میں ایک کیمرہ سیٹ کروایا تھا تا کہ سب کو پرنسپل کی سچائی کے بارے میں پتا چلے کیوں کہ میں جانتی تھی کہ یہ کوئی نہ کوئی حرکت ضرور کریں گے۔ تو میں فائدہ اٹھاؤں گی۔ صائمہ نے مضبوط لہجے میں کہا تو سب کی نظریں شرم سے جھکی ہوئیں تھیں۔ جیسے سب شرمسار تھے۔

ہمیں معاف کر دو صائمہ! ہم نے آپ کو غلط سمجھا تھا۔ ہمیں آپ کی بات سمجھنی چاہیے تھی۔" ایک ٹیچر نے کہا تو صائمہ مسکرا دی۔

"کوئی بات نہیں یہ تو ہمیشہ سے ہی چلتا آیا ہے کہ قصوروار لڑکی ہی ہوگی۔"

"صائمہ میں آپ کو اس جاب سے نکالتا ہوں۔" پرنسپل نے کہا تو صائمہ نے گھوم کر ایک زوردار تھپڑ پرنسپل کے منہ پر مارا۔

تھوکتی ہوں میں اس جاب پر جہاں پر عزت ہی محفوظ نہ ہو۔ آپ جیسے لوگوں کی وجہ سے آج لوگوں کا سچے اور صاف لوگوں پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے اور کیا آپ سمجھتے ہیں میں آپ کو جانے دوں گی؟ پولیس آتی ہی ہوگی۔" صائمہ بولی تھی۔

☆......☆......☆

وہ گھر آئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سارے گھر والے پریشان ہوگئے۔ ابو اور امی نے آگے بڑھ کر پوچھا تو اس نے سب بتا دیا۔ جسے سن کر سب ساکت ہوگئے۔

''میں نے تو پہلے ہی تمہیں سمجھایا تھا کہ شادی کرلو یہ ظالم سماج تمہیں جینے نہیں دے گا لیکن تم سنتی کب ہو!'' ابو نے روتے ہوئے کہا تھا۔

ہاں صائمہ بیٹی ابھی بھی ایک رشتہ ہے۔ بہت اچھا ہے۔ گھر میں صرف ماں ہے اور ایک بہن وہاں شادی کے لیے راضی ہو جاؤ۔'' امی بڑی آس سے بولی تھیں تو صائمہ نے بھی ہاں کردی۔

اور یہاں سے شروع ہوئی صائمہ کی نئی شروعات۔ یہاں اس کی زندگی نے نیا رخ لیا تھا۔ اس کی شادی عارف سے ہوگئی تھی۔ اس کی صرف ایک نند اور ایک ساس تھی۔ وہ بھی اس سے بہت پیار کرتی تھیں لیکن یہاں بھی شاید قسمت مہربان نہیں تھی۔ عارف اس سے اچھا برتاؤ نہیں کرتا تھا۔ اس کی شادی کو ایک سال ہوگیا تھا لیکن عارف نے کبھی اس سے پیار کے دو بول نہیں بولے تھے۔ اس دوران اس کی نند کی شادی ہوگئی تھی اور اس کی گود میں ایک بچہ بھی آ گیا وہ نہال ہوگئی۔ اس کے بیٹے طارق نے ان کی فیملی ہی مکمل کردی تھی لیکن عارف اسے خاص رُخ نہیں دیتا تھا۔ اور ہر بات پر ہی لڑنا شروع کر دیتا اسے ساتھ کھانے نہیں دیتا تھا۔ ایک دن اس نے کہا تھا عارف ساتھ کھانے سے تو پیار بڑھتا ہے اس لیے میں آپ کے ساتھ کھاؤں گی۔'' وہ مسکرا کر بولی تو عارف بھڑک اٹھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' ہاں کیا مطلب ہے؟ میں اب تمہارے ساتھ کھانا کھاؤں گا؟ اور کیا پیار دیار لگا رکھا ہے؟ کوئی پیار دیار نہیں ہوتا۔ یہ سب فلمی باتیں ہوتی ہیں اور وہیں اچھی لگتی ہیں اصل میں یہ سب نہیں ہوتا، صرف سمجھوتا ہوتا ہے، سمجھیں آپ؟'' عارف اونچی آواز میں بولا تو صائمہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور وہ طارق کو کمرے میں چھوڑ کر واش روم میں چلی گئی اور وہاں بہت دیر تک روتی رہی پھر منہ دھو کر باہر نکلی تو اس کی ساس نے آگے بڑھ کر اسے چوم لیا۔

نہیں صائمہ روتے نہیں ہیں۔ تم دیکھنا تمہاری محبت ایک دن اس کا دل جیت لے گی۔ تم ہمت مت ہارنا۔'' ساس نے سمجھایا تو صائمہ کو کچھ ہمت ملی اور پھر سب اپنی سرگرمیوں میں کھو گئے۔

مصروفیات کی وجہ سے صائمہ اپنے میکے چکر نہیں لگا پاتی تھی۔ خیر وہ صرف اتنا چاہتی تھی کہ گھر میں سکون ہو اسے اور کیا چاہیے۔

ایک دن عارف بیٹھا ناشتا کر رہا تھا جب صائمہ نے عارف سے کہا۔

''سنیے! مجھے دو ہزار روپے چاہیے تھے۔'' صائمہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ تو عارف نے جھٹکا کھا کر صائمہ کو دیکھا جیسے اس نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

''دو ہزار۔'' عارف نے پوچھا۔

''جی۔'' صائمہ نے فوراً جواب دیا۔ کیوں دو ہزار کیوں چاہییں؟ عارف نے صائمہ سے پوچھا۔

''وہ مجھے طارق کے لیے کچھ گرم کپڑے خریدنے تھے۔ اس کے پاس کوئی گرم سوٹ نہیں ہے۔''

''کوئی ضرورت نہیں نئے کپڑے وغیرہ خریدنے کی۔ میرا بیٹا ہے کچھ نہیں ہوگا اسے۔'' عارف کچھ کہنے ہی والا تھا کہ صائمہ نے چیخ کر اسے کچھ کہنے سے روک دیا۔

''آپ کی ہمت کیسے ہوئی میرے بیٹے کے لیے یہ لفظ استعمال کرنے کی۔'' صائمہ نے ایک دم اونچی آواز میں کہا تو عارف کو حیرت سے جھٹکا لگا یہ کس انداز میں بات کر رہی ہو تم مجھ سے۔ عارف نے پوچھا۔ عورت ہو عورت بن کر رہو سمجھی آپ۔ عارف نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں عورت ہوں لیکن کمزور نہیں۔ آپ نہیں جانتے اگر ایک عورت اپنی پر آ جائے تو سامنے والا چاہے جتنا بھی طاقتور کیوں نا ہو۔ اس کے سامنے ٹک نہیں پاتا۔ صائمہ نے بھی لفظ چبا چبا کے کہے تو عارف طیش میں آ گیا اور آگے بڑھ کر صائمہ کو مارنے لگا اور صائمہ تڑپ تڑپ کر رونے لگی، لیکن وہ بولی کچھ نہیں اور آنسو بھی صاف کر لیے۔ جب وہ تھک گیا تو پیچھے ہٹ گیا۔

اب آئے ہوں گے تمہارے ہوش ٹھکانے۔ اگر اب تم نے دوبارہ زبان چلائی تو اس سے بھی زیادہ سزا ملے گی سمجھیں تم؟'' عارف غصے سے سرخ ہوتے ہوئے بولا تو صائمہ سیدھی کھڑی ہوگئی اور آنسو صاف کیے۔

''آپ نے تو اپنی بات کہہ دی اب میری باری ہے۔ اگر آپ نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو میں چپ رہی اور مار کھاتی رہی۔ اگر میں چاہتی تو آپ کو بھی مار سکتی تھی کیوں کہ جتنا آپ کا حق مجھ پر ہے اتنا میرا بھی ہے اور میں شور

مچا کر پورا محلہ بھی اکٹھا کر سکتی تھی لیکن میں نے ایسا نہیں کیا صائمہ کچھ دیر چپ ہو گئی تو عارف نے مسکرا کر کہا۔

''اس لیے کہ تم ڈرتی ہو کہ ہم کہیں تمہیں چھوڑ نا دیں؟''

''میری بات پوری نہیں ہوئی۔ صائمہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کروایا اس لیے نہیں کیا کیوں کہ آپ ہمیں چھوڑ نہ دیں بلکہ اس لیے کے آپ کا مجھ پر حق ہے۔ لیکن بغیر غلطی کے مجھ پر ہاتھ اٹھانا۔ یہ آپ کی غلطی ہے اور آپ کا کوئی حق بھی نہیں ہے۔ اس لیے میں آپ کو معاف کر رہی ہوں صرف اور صرف آخری بار۔ اگر آپ نے پھر وہ غلطی دوبارہ کی تو میں آپ کے خلاف پولیس میں رپورٹ لکھوا دوں گی۔'' وہ خطرناک انداز میں بولی لیکن عارف اسی طرح مسکراتا رہا۔ آپ کی اتنی ہمت؟ عارف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وقت آنے پر پتا چلے گا کیوں کہ میں وہ صائمہ ہوں جو کچھ عرصے پہلے شیر کے منہ سے اپنی عزت چھین کے لائی تھی۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولتی ہوئی باہر نکل گئی اور عارف اس کی آخری بات سمجھ نہیں سکا تھا۔

☆......☆......☆

اور پھر جیسے زندگی معمول پر آ گئی۔ صائمہ طارق سے مصروف ہو گئی۔ وہ عارف کا بھی خیال رکھتی تھی لیکن اب دونوں میں میاں بیوی والا رشتہ نہیں رہا تھا۔ وہ دونوں الگ رہ رہے تھے۔ اور اس کی ساس بیچاری کیا کہہ سکتی تھی۔

ایک دن صائمہ ماں کے گھر آ گئی اور اماں تو جیسے نہال ہو گئیں۔ پھر وہ شام تک وہیں رہی۔ اماں نے اس سے کھانے کا پوچھا تو اس نے وہی جواب دیا۔

''اماں آج کھانے میں کھچڑی پکا لو۔ طارق بھی کھا لے گا۔'' اس کی فرمائش پر اماں بھی مسکرا دی۔ پھر اس نے ماں سے کہا۔

اماں میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں نوکری کروں گی۔ صائمہ نے کہا تو اماں نے چونک کر سر اٹھایا۔

یہ تو کیا کہہ رہی ہے ماں نے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تھا اور صائمہ نے اسے عارف کے بارے میں بتایا۔

جسے سن کر ماں کے آنسو نکل آئے۔

کہاں نوکری کرے گی۔ اماں نے بے بسی سے پوچھا تھا۔

''اماں اسکول میں اپلائی کیا ہے۔ انشاء اللہ کوئی نا کوئی حل نکل آئے گا۔'' صائمہ نے کہا تو اماں پریشان ہو گئی۔

''دیکھ صائمہ تو سوچ لے۔ پچھلی بار......'' اماں کو خدشہ ہوا تو فوراً ٹوک دیا۔ نہیں اماں ہم ایک مرد کی وجہ سے سارے معاشرے کو غلط نہیں سمجھ سکتے اور صرف یہ ہی ایک نوکری ہے۔ جس میں ثواب بھی ہے اور عزت بھی محفوظ ہوتی ہے۔ اگر وہ پرنسپل خراب تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ سارے زمانے کے پرنسپل ہی ایسے ہوں گے۔ آپ فکر نہ کرو۔ وہ ماں کو تسلی دیتے ہوئے بولی تھی اور پھر کچھ دیر رکنے کے بعد وہ گھر چلی آئی تھی۔

☆......☆......☆

اور پھر ایک رات عارف نے اس سے معذرت بھی کر لی تھی۔ وہ خوش ہو گئی تھی اور اب ان کے درمیان سب کچھ آہستہ آہستہ ٹھیک ہونے لگا تھا جب ایک رات......

''صائمہ ایک کپ چائے پلاؤ'' عارف نے صائمہ کو پکار کر کہا تھا اور صائمہ نے دودھ، چینی، پتی سب کچھ ساتھ مکس کر کے چولہے پر رکھ دیا اور طارق کو دودھ پلانے لگی۔ اس نے دیکھا کہ آج عارف کا موڈ ٹھیک نہیں تھا اور وہ ڈر گئی۔

اس نے سوچا کہ چائے چکھ لوں ٹھیک تو بنی ہے نا؟ اس نے کپ میں تھوڑی سی چائے ڈالی اور ٹیسٹ کیا تو چائے اچھی بنی تھی لیکن اس نے وہ کپ نہیں دھویا تھا وہ ایسے ہی لے گئی۔ وہ تھرماس میں چائے لے گئی اور کپ اس کے سامنے رکھ دیا اور کہنے لگی۔

''وہ میں نے جاب کے لیے اپلائی کیا تھا اور مجھے جاب بھی مل گئی ہے۔ صائمہ نے اتنا ہی کہا تھا اس نے کپ دیکھا اور چائے کو ٹھوکر مار دی۔ تھرماس کا ڈھکن کھلا اور چائے صائمہ بے چاری پر جا گری اور وہ اسے بے دردی سے مارتا رہا اور وہ تڑپتی رہی۔ ساری رات تڑپتی رہی۔

☆......☆......☆

صبح جب عارف اٹھا تو اس نے محسوس کیا کہ گھر میں سناٹا ہے۔ اس نے چیک کیا تو طارق اور صائمہ گھر میں نہیں تھے۔ وہ گھبرا سا گیا تب ہی دروازہ بجا اس نے دروازہ کھولا تو وہ دنگ رہ گیا۔ باہر پولیس کھڑی تھی اور وہ اسے گرفتار کر کے لے گئی۔

''آپ کی بیوی صائمہ نے آپ کے خلاف رپورٹ

درج کروائی ہے۔" انسپکٹر نے کہا تو وہ ساکت ہوگیا۔ وہ تو صائمہ کو ایک کمزور اور بے بس لڑکی سمجھتا تھا لیکن وہ تو بہادر نکلی تھی۔ اسے جیل میں ڈال دیا گیا اور صائمہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"میں نے آپ کو کہا تھا لیکن آپ نے پھر بھی وہی غلطی کی۔ خیر اب میں آپ کا گھر چھوڑ آئی ہوں اور آپ کی شکایات بھی واپس لیتی ہوں اگر......" صائمہ چپ ہوگئی۔ "اگر کیا؟" عارف نے پوچھا۔

اگر آپ مجھے طلاق دے تو۔ صائمہ نے کہا تو عارف جیسے تڑپ اٹھا۔ وہ اس سے دور جانا چاہتی تھی لیکن عارف کا دل راضی نہیں تھا اسے چھوڑنے کے لیے۔ اپنا بچہ چھوڑنے کے لیے۔ میں جا رہی ہوں۔ طلاق کے پیپر بھجوا دیجیے گا۔ صائمہ نے کہا اور باہر نکل گئی کچھ دیر بعد وہ بھی جیل سے نکل کر گھر آ گیا۔

☆......☆......☆

گھر آ کر اسے رونا آ رہا تھا۔ یہ اس نے کیا کر دیا ہے۔ اس نے اپنی پیار کرنے والی بیوی کی قدر نہیں کی۔ اپنے معصوم بیٹے کو چھوڑ دیا تھا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی ایک بوڑھی اور لاچار ماں بھی تھی۔ جسے دیکھ کر وہ اور بھی زیادہ رونے لگا۔ گھر میں کھانا بنانے کے لیے کوئی نہیں رہا تھا اور نہ ہی گھر میں کوئی رونق تھی۔ صائمہ اور طارق کی وجہ سے گھر میں رونق ہوتی تھی۔ وہ ان کے جانے کے بعد یک دم سناٹے میں بدل گئی تھی اور اب عارف کے پاس تنہائیوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا اور اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر فیصلہ کر لیا۔

☆......☆......☆

"ہاں اماں میں نے سوچ لیا ہے کہ میں طارق سے طلاق لوں گی۔" صائمہ ماں سے کہتے ہوئے رونے لگی۔

"سوچ لے میری بچی اپنے ہاتھوں سے اپنا گھر جلانا آسان کام نہیں ہے۔" اماں نے بھی روتے ہوئے کہا تھا۔

"تو آپ بتائیں میں کیا کروں؟ ظلم سہتی رہوں؟ کیوں میں ظلم سہتی رہوں۔ ظلم آخر عورت ہی کیوں سہے؟ وہ ایک بار بھی مجھ سے ملنے آئے؟ نہیں نا۔ صائمہ نے روتے ہوئے کہا پھر تھوڑی دیر بعد دروازے کی بیل بجنے کی آواز آئی۔

اماں نے دروازہ کھولا تو سامنے عارف کھڑا تھا۔ اماں اسے دیکھ کر خوش ہوگئیں اور اندر لے آئی صائمہ بھی اسے دیکھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور پھر کچھ دیر عارف بھی اندر آ گیا اور آ کر خاموشی سے صائمہ کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ گیا۔ کچھ لمحے دبے پاؤں سرک گئے۔ پھر عارف نے آہستہ سے کہا۔

"صائمہ مجھے معاف کر دو۔" "میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا ہے۔ مجھے تمہارے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں اپنی غلطی پر بہت نادم ہوں۔"، عارف نے نرمی سے صائمہ کا ہاتھ پکڑا۔

"اب کوئی فائدہ نہیں۔" صائمہ نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑوا لیا تھا۔

"کیوں کوئی فائدہ نہیں۔ دیکھو صائمہ تم مجھے چھوڑ نہیں سکتی۔ ہمارا ایک بچہ بھی ہے اور میں خود بھی تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔ چلو گھر چلو، تمہارے بغیر گھر بالکل سونا ہوگیا ہے۔ عارف نے روتے ہوئے کہا۔ تو صائمہ نے بھی اپنے آنسو بہہ جانے دیے۔

"میں نے تمہاری قدر نہیں کی مجھے معاف کر دو لیکن میرا یقین کرو آئی لو یو میں تم سے بہت پیار کرنے لگا ہوں۔ اب تمہیں جاب بھی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ بلیومی!" عارف کے لہجے میں التجا تھی اور صائمہ عارف کے گلے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆......☆......☆

ہر تیسرے گھر میں یقیناً ایسا ہوتا ہے۔ جیسا صائمہ کے ساتھ ہوا لیکن ہر لڑکی صائمہ جتنی بہادر نہیں ہوتی۔ اس لیے ہر عورت کو بہادر بننا چاہیے اور میری تحریر بھی خاص ان خواتین کے لیے میسج ہے جو چپکے سے ظلم سہتی ہیں اور ظلم کا نشانہ بنتی چلی جاتی ہیں۔

ان کا قصور کیا ہوتا ہے؟ ان کا قصور یہی ہوتا ہے کہ وہ عورتیں ہیں؟ نہیں آخر ظلم عورت ہی کیوں سہے؟ عورت کا کیا قصور؟ میں ایک مرد ہوں اور میری یہی سوچ ہے آپ بھی اس بارے میں ضرور سوچیے گا ضرور! کیوں کہ ابھی نہیں تو پھر کبھی نہیں......

☆☆......☆☆

نویں سچ بیانی

کہانی میں محبت مرگئی ہے

کاشف عبید

بٹ گرام سے ایک دوشیزہ کی زخم زخم داستانِ الم

جب میں ٹی وی پر زلزلے کی خبر سنتا ہوں تو مجھے اپنے وطن میں برپا قیامت یاد آجاتی ہے، جب 8 اکتوبر 2005ء کی لرزہ خیز صبح نمودار ہوئی تھی۔ بٹگرام، سوات، باغ، راولاکوٹ، مظفر آباد، آزاد کشمیر، بالا کوٹ اور نہ جانے کتنے شہر اور گاؤں میں آباد خوش وخرم لوگ پہاڑوں کے اندر گم ہوگئے تھے اور جو بچ گئے تھے ان کی حالت اور بھی زیادہ خستہ حال اور ناقابلِ بیان تھی۔

نیلم بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔ جب میں نے اُس کو اچانک بازار میں دیکھا تو میں گم صم رہ گیا۔ کیوں کہ اتنی حسین لڑکی کس قدر اجڑی ہوئی دکھ رہی تھی۔ تبھی میرے دوست نے کندھا ہلا کر کہا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟''

''وہ کتنی پیاری اور معصوم سی لڑکی ہے مگر اس کے چہرے پر کیسی اداسی کھنڈی ہوئی ہے۔ جیسے اس پر قیامت گزر چکی ہو۔'' میرے دوست نے اس لڑکی کی طرف دیکھا تو چونک گئے۔

''ارے یہ تو نیلم ہے!؟ کیا تم اس کو جانتے ہو؟'' ہاں جانتا ہوں۔ وہ بدقسمت دن...... آہ...... وہ بدقسمت دن تو میں کبھی بھول ہی نہیں سکتا۔'' میرے دوست شہزاد نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر میں ہم دونوں بھی گاڑی میں بیٹھ کر گھر پہنچ گئے لیکن مجھے کرید لگی رہی کہ آخر نیلم کون تھی، اور میرا دوست اس کو کیسے جانتا تھا؟ بار بار سوال کرنے پر شہزاد پریشان ہو جاتا تھا لہٰذا میں نے چاہتے ہوئے بھی اس سے دوبارہ سوال نہیں کیا۔ تاہم یہ ضرور محسوس کر رہا تھا کہ جب سے اس کو دیکھا تھا شہزاد کھویا کھویا سا تھا اور یہی چیز مجھ کو بے چین کر رہی تھی۔

کئی دنوں تک اس نے مجھ سے نیلم کے بارے میں بات نہ کی اور جب کوئی دوسری بات کہہ دیتا تو بے دلی سے جواب دیتا۔ حسب معمول میں اپنے کاموں میں معروف رہتا مگر دھیان شہزاد کی طرف تھا۔ آخر کیا معاملہ ہے۔

اور پھر یہی تشویش مجھے اس کے گھر تک لے گئی ذرا سی محنت کے بعد وہ بتانے پر تیار ہوگیا۔

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب میری شادی فریال سے نہ ہوئی تھی اور میں چند اوباش قسم کے دوستوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ ہم چار دوست من موجی اور دل کو بہلانے والے بن گئے تھے۔ میں ملازمت کے سلسلے میں اسلام آباد میں تھا اور فراغت کے دنوں میں اکثر

قریبی شہر چلا جاتا تھا۔ ایک روز اپنے دوستوں کے ہمراہ کسی سڑک سے گزر رہا تھا۔ دن ڈھل رہا تھا اور شام کے دھندلکے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

''اب ہمیں واپس جانا چاہیے'' میرے ایک دوست فیصل نے کہا۔

''چلتے ہیں اتنی جلدی بھی کیا ہے۔'' یہ کہہ کر اظہر آگے چلنے لگا۔ اچانک اس کی نظر ایک گیراج پر رک گئی۔

''کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟'' ''کیوں نہیں'' دکان کے اندر بیٹھے شخص نے مسکرا کر ہمارا استقبال کیا پھر وہ اظہر سے بغل گیر ہو کر بولا۔

''کہاں گم ہو یار؟ دوبارہ نہیں آئے؟''

''بس جی کہیں نہیں ہم ہیں اور ہمارا اکیلا پن اور اس اکیلے پن کو دور کرنے ہی تو آپ کے شہر آتے ہیں۔'' اظہر نے کہا میں اس کو حیرت سے تکتا رہا۔

''تو چلو گیسٹ ہاؤس؟'' ہم دوستوں نے حیرت زدہ ہو کر سوال کیا۔

ہاں ...... ہاں ......''شاہد بولا'' تیرے دوست فیض کا گیسٹ ہاؤس ہے۔ جہاں چند کمرے خالی ہیں تمہارے جیسے دوستوں کے لیے۔ شام کو کبھی کبھار دوست آتے ہیں اور دل بہلا بہلا کر چلے جاتے ہیں۔

اس کے معنی خیز لہجے سے میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے تب ہم اس کے ہمراہ گیسٹ ہاؤس چلنے پر آمادہ ہو گئے۔

''فیصل اور نوید کا تو مجھے نہیں پتا تھا مگر میں اپنے بارے میں یہی کہتا ہوں کہ مجھے تجسس وہاں لے جا رہا تھا کہ وہاں آخر ایسا کیا ہے؟

☆......☆......☆

گیسٹ ہاؤس نہایت خوشنما تھا۔ اس کی سیڑھیاں چڑھ کر ہم ایک ہال میں آ گئے۔ ایک طرف کاؤنٹر تھا جہاں ایک لمبے قد کا مستعد نوجوان تھا جو کھڑا تھا فوراً وہ ہماری طرف آیا۔

''آپ کچھ پئیں گے؟'' ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ شاہد نے اپنے سیل پر کوئی نمبر دبایا اور ہمیں کہا تھوڑا سا انتظار کیجیے ابھی آدھے گھنٹے کے اندر ایک سفید شاندار گاڑی آ گئی جس میں ہوٹل کا مالک اور شاید اس کا دوست فیض آیا تھا۔ اس نے آتے ہی شاہد سے ہاتھ ملایا پھر شاہد نے اس سے ہمارا تعارف کرایا اور کہا کہ ''آج ان کی زبردست میزبانی کرنی ہے۔''

''ہاں...... رات کو موسیقی کا پروگرام ہے۔ آپ کچھ ہلکا پھلکا کھا پی لیں۔'' یہ کہہ کر اس نے بیرے کو کچھ سینڈوچیز لانے کو کہا اور کولڈ ڈرنک بھی پھر وہ موبائل پر کسی سے بات کرنے لگا۔ تھوڑی دیر ہم لوگ گپ میں مصروف رہے پھر شاہد اٹھ کر چلا گیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ لوٹا اور میرے تینوں دوستوں کو ساتھ لے گیا اور ان کو ان کے کمروں میں پہنچا کر آیا تو مجھ سے کہا۔

''آپ نئے مہمان ہیں۔ آپ کے لیے بالکل نئی میزبانی ہوگی لہٰذا آپ تھوڑا سا انتظار کریں۔''

آدھا گھنٹہ میں نے انتظار کیا۔ اب میں بور ہو چکا تھا کہ سامنے سے شاہد آتا دکھائی دیا۔

''آیئے'' وہ بولا۔

میں اس کے پیچھے پیچھے چلا راہداری سے گزر کر ایک کمرے کے سامنے وہ ٹھہر گیا اس نے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔

جونہی میں کمرے میں داخل ہوا میرے قدم جم کر رہ گئے اور آنکھیں حیرت زدہ رہ گئیں کیوں کہ سامنے ایک نہایت خوبصورت لڑکی کھڑی تھی، جس نے جسم پر سرخ چادر لپیٹی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کو دیکھ کر پتا چل رہا تھا کہ اسکے سنگ مرمر جیسے جسم پر سوائے اس سرخ چادر کے کچھ بھی نہیں۔ جسم کے خط بری طرح عیاں ہو کر دعوت گناہ دے رہے تھے۔ مگر اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی میں کانپ سا گیا اس کے چہرے پر حیا اور حوروں جیسا نور تھا۔ لگتا تھا کہ وہ میری نظر پڑتے ہی میلی ہو جائے گی۔ اس کی حجاب آلودہ نگاہ جب مجھ پر پڑی تو میں شرم سے پانی پانی ہو گیا اور نظریں جھکا گیں۔ میں نے آج سے پہلے اتنی خوبصورت لڑکی نہیں دیکھی تھی اور وہ بھی اس حال میں...... اس فتنہ پرور نے مجھے گنگ کر دیا تھا بالآخر میں نے جیسے ہمت کر کے اس سے کہا۔ کیا میں آپ کے پاس بیٹھ جاؤں؟

جب ہی میں پلنگ پر بیٹھا وہ بیڈ کی دوسری جانب کھڑی ہو گئی۔ میں نے التجاء کی ''بیٹھ جاو...... کہتی ہو تو میں کمرے سے چلا جاتا ہوں۔'' میری شرافت سے متاثر ہو کر وہ بیٹھ گئی لیکن بمشکل اس نے کانپتے ہوئے وجود کو سنبھال رکھا تھا۔

اچانک ہی اس کے مرمریں جسم سے سرخ چادر پھیلی اور لمرے میں چاند روشن ہو گیا میں نے اس کی ملکوتی حسن پر بھرپور نظر ڈالی اور اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہوتے پوچھا ''آخر تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟'' تبھی اس نے درشتی سے کہا۔

''آپ کو اس سے کیا آپ اپنا مقصد پورا کریں اور جائیں۔'' اس کی آواز میں بے بسی کے ساتھ ساتھ غصہ بھی تھا۔ پھر اچانک ساری باتیں زبان سے ہو کر دل پر اثر کرتی ہوئی اس کی آنکھوں سے بہہ گئیں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر میں نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''

''سیماب۔''

'اصل نام بتاؤ؟'' اصل نام سے آپ کو کیا؟''

''اچھا مت بتاؤ، یہ تو بتا دو یہ چاند کہاں سے طلوع ہوا ہے؟ اس نے جگہ کا نام بتایا۔

''اور یہاں کیسے آئی ہو؟'' میں نے کہا ماحول پر

سکوت طاری رہا لڑکی کے چہرے پرسکون نہیں تھا۔ وہ سوچ کے گہرے ساگر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔

''جب آزاد کشمیر میں زلزلہ آیا تھا اور ساری وادی لرز گئی تھی، تو ہمارا گھر بھی زلزلہ سے متاثر ہوگیا تھا۔ اس وقت میں گھر سے باہر تھی اور اپنے ہوسٹل سے ہم لڑکیاں کالج گئی تھیں۔

جب رات کو ہم سوئے تو کسی کو خبر نہ تھی کہ کل کی صبح اتنی بھیانک ہوگی لیکن 8 اکتوبر کو سورج طلوع ہوتے ہی کشمیر اور شمالی علاقہ جات میں ہر جانب موت کا رقص شروع کرگیا اس زلزلہ سے جہاں بے شمار لوگ اپنے پیاروں سے جدا ہوئے وہاں زندہ بچ جانے والے ایک اذیت ناک زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگئے۔

ان لوگوں کو میں خوش نصیب کہوں گی جو زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اس دنیا سے چلے گئے۔ وہ غموں کی قید سے نجات پا گئے، جو زندہ بچ گئے ان کی اکثریت زخمی ہونے کے سبب معذور ہوگئی، مگر ان کا نصیب سب سے زیادہ برا ہوا جو اس قیامت میں بھی اغوا کر لیے گئے، ان میں بچے اور بد نصیب لڑکیاں زیادہ تھیں۔

آزاد کشمیر کے مختلف اضلاع سے لڑکیاں تحصیل علم کے لیے یونیورسٹی ہاسٹل میں رہائش پذیر تھیں اور ان کے والدین نے ہوسٹل (انتظامیہ) کی ضمانت پر اپنی بیٹیوں کو مظفر آباد یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے بھیجا تھا۔

آہ یہ کیا ہوگیا...... پھر اس کے بعد؟

زلزلے کے بعد مانسہرہ اور لاہور کے بدنام زمانہ بازار سے درندہ صفت لوگ زلزلہ زدہ علاقوں میں لوٹ مار کرنے کے علاوہ بچوں اور لڑکیوں کو بھی اغواء کرکے لے گئے۔

یہ لوگ پریشان حال اور مصیبت زدہ لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر یا پھر نشہ آور دوا کھلا کر اغوا کرتے تھے اور اپنے ساتھ ایک اندھیرے راستے کی طرف لے جاتے تھے۔ میرے ساتھ نایاب بھی تھی۔ ایسی لڑکی جو پردہ کرتی تھی۔ اس کا سارا بدن ہمیشہ برقع سے ڈھکا

رہتا تھا۔ اس کا تعلق راولا کوٹ سے تھا۔ زلزلے کے بعد اس کے والدین اپنی بیٹی کی تلاش میں جب مظفر آباد کے ہوسٹل آئے تو یہاں پڑی لاشوں میں نایاب کی لاش نہیں ملی...... اور نایاب کی والدہ رو رو کر یہ کہہ رہی تھی کہ کاش مجھے اپنی بیٹی کی لاش مل جاتی تو سکون آ جاتا۔

وقت صورتحال ایسی تھی کہ ہر انسان پر سکتہ طاری تھا اور غم کی اس کی حالت میں جو بھی انسان پاس آتا تھا۔ ہم مصیبت زدہ اس پر بھروسا کر لیتے۔ یہ ایسا عالم تھا کہ اس وقت پہ اگر شیطان بھی انسان کے پاس آ کر ہمدردی جتلاتا تو آدمی اس کو اپنا ہمدرد سمجھ کر بھروسا کر لیتا۔

ہم تو لڑکیاں تھیں۔ بہت بڑی آفت میں مبتلا تھیں۔ ہم تو جو زندہ بچ گئی تھیں سکتے میں تھیں لہٰذا ہم کو باتوں میں الجھا کر دھوکے سے اغواء کرنا بہت آسان تھا اور ان درندوں نے معصومیت کا فائدہ اٹھایا۔ خدا جانے کتنے شریف خاندانوں کی باعزت بیٹیاں یوں اس دلدل میں پھنس گئی ہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ رونے لگی۔

زلزلے کے بعد کچھ لوگ ہمارے پاس آئے تھے۔ ان کے ہمراہ ایک عورت بھی تھی۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ مانسہرہ کے راستے راولا کوٹ پہنچا دیں گے اور اسی وقت میرے پاس اعتبار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن ان لوگوں کی نیت اور تھی۔ انہوں نے ہمیں اغواء کر لیا جیسے انھوں نے دوسری لڑکیوں کو کیا تھا۔

نایاب کے والدین بھی میرے والدین کی طرح عمر بھر کے لیے ایک دماغی اذیت میں مبتلا ہو گئے ہوں گے کہ خدا جانے ہماری بیٹی کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ ان کو کیا خبر ہم اغواء ہو جانے والی لڑکیاں کس دلدل میں پھینک دی جاتی ہیں اور کتنی مرتبہ لٹ چکی ہیں۔ اور ہم کب تک لٹتی رہیں گی کچھ معلوم نہیں!۔

میری طرح اور بھی معصوم بچیاں اور لڑکیاں...... ممکن ہے کہ انسانی اسمگلروں کے ہاتھوں ملک میں اور بیرون ممالک دبئی، سعودیہ، افریقہ یا پھر دوسری خلیجی ریاستوں میں فروخت ہوتی ہوں۔'' وہ بولے جا رہی تھی کیوں کہ آج کو سننے والا مل گیا تھا۔

''ہم ایسی ہزار لڑکیاں جو عفت مآب تھیں۔ اس زلزلے کے بعد صاحب اقتدار لوگوں نے ہم کو بچانے کے لیے کوئی قابل ذکر قدم نہیں اٹھایا۔''

وہ تمام رات میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ صبح ہوتے ہی میں ایسے کمرے سے نکلا جیسے میں ایک بے روح مٹی کا پتلا تھا۔ میرا دل اور دماغ گیسٹ ہاؤس کے بے جان کمروں میں گم اپنی ڈیوٹی پوری کر رہے تھے۔

جاتے ہوئے وہ مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور میرے دل میں خیال آ رہا تھا کہ میں یہاں تفریح نفس کے لیے آیا تھا مگر اب اس کی طرف دیکھتے ہوئے بھی شرم آ رہی تھی۔ ایسی مظلوم بچی کی طرف دیکھنا بھی پاپ لگ رہا تھا۔

''میں نے کہنا چاہا کہ تم اپنی زندگی میرے نام کرنا چاہو گی؟'' ماحول پر ایسی خاموشی طاری تھی جیسے کوئی مر گیا ہو۔ اور میں اس کے جواب کا منتظر تھا۔

''آپ مجھے اپنا کر زمانے کی باتیں سہہ لیں گے؟''

میں میڈم زری سے بات کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں باہر نکلا تھا مگر میرے دل کا کوئی گوشہ اداس تھا اور کہہ رہا تھا کہ یقیناً وہ مجھ سے بچھڑ جائے گی۔ اسی لیے تو میرا وہاں سے آنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس دن میں نے میڈم زری سے بہت اصرار کیا مگر وہ نہ مانی اور اس کو اپنے ہمراہ لے گئی۔

اور پھر میں نے اسے اس دلدل سے نکالنے کی کوئی خاطر خواہ کوشش نہ کی اور پھر میں نے ضمیر کو سلا دیا۔

پر اس دن میں اسے بازار میں دیکھ کر ایک بار پھر اپنی نظروں میں گر گیا۔ محض دنیاداری کی خاطر اس کے قریب جا کر حال بھی معلوم نہ کر سکا جانے لوگ اس سے مخاطب ہونے پر کیا محسوس کریں۔ میں سماج اور انائیت کو تسکین دیتے ہوئے اپنے ضمیر سے ہمیشہ کے لیے گر گیا۔

آج مجھے احساس ہوا ہم نصیحت اور حکایتیں دوسروں کے لیے گھر چھوڑ دیتے ہیں اور اپنا وقت پڑے تو آنکھیں موند لیتے ہیں شاید اسے لیے کہ ہم دنیاوی عذاب کے کرب سے لمحہ بہ لمحہ گزرتے ہیں۔

☆☆......☆☆☆

دسویں سچ بیانی

ٹشو پیپر پہ لکھے دُکھ

مومینہ بتول

غزہ کے دکھ میں لپٹی اس تحریر میں کیا گیا سوال آج بھی اہلِ دنیا سے جواب کا منتظر ہے

غزہ کی پٹی پر بنے قطار در قطار کیبن نما گھروں کے تباہ حال دروازے پر تازہ وحشیانہ بم باری کے نتیجے میں تباہ حال دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک، گھر کی واحد خاتون سربراہ 35 سالہ صباح کو

اندر تک ہلا گئی تھی۔

اُس کے پہلو میں کھڑا سات سالہ متوحش سا بچہ ابراہیم اور رو رو کر بھوک سے لڑتی، تین سالہ معصوم بنات...... جو کچی نیند کے خمار میں ڈوب چکی تھی۔

حالیہ پے در پے ہونے والے بلاسٹ، جنگ کی تباہ کاری، بھوک، پریشانی سے نیم جاں صباح نے کھلے دروازے سے آنے والی غیر ملکی خاتون کو دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں ہمدردی، ہونٹوں پر دوستانہ سی مسکراہٹ تھی، اور اس کے برابر کھڑے، ایک اور غیر ملکی مرد کے ہاتھوں میں گرم گرم بھاپ اڑاتا پیزا، وہ دوست دشمن کی پہچان رکھتی تھی لہٰذا آنے والوں کو خیر مقدم کہہ رہی تھی۔

''ہم امریکہ سے آئے ہیں اور اک ہیومن رائٹس کی ذیلی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارا دس رُکنی بیج اسرائیل کی جارحیت کی بھرپور مذمت کرتا ہے۔ ہمیں انسانوں سے پیار اور انسانیت سے محبت ہے۔ ہمارا منشور بے بس فلسطینی عوام کی دادرسی اور اسرائیل کی جارحیت کے خلاف کھلم کھلا بغاوت ہے۔ ہم بھی صاحب اولاد ہیں، اک ماں کا درد محسوس کرتے ہیں۔ باپ کی پدری شفقت، ہمارے لہو کو بھی گرماتی ہے۔ ہم اپنی بساط بھر کوشش سے آپ جیسے مظلوم عوام کو چند سکون بھرے لمحات پہنچانا چاہتے ہیں۔ آپ لوگوں کے غم میں شریک ہو کر انسان دوست ہونے کا ثبوت دینا چاہتے ہیں۔ آپ کی مدد، آپ کا حق، دلانا چاہتے ہیں اور بس یہ ہی ہمارا منشور ہے۔''

آنے والی نے نہایت صاف اور پختہ لہجے میں اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔ اور جانے کیا جادو تھا اُس ہمدردی بھری زبان میں کہ صباح اپنے چہرے کو ہاتھوں میں ڈھانپ کر رو پڑی تھی۔

مسلسل تین روز، خوفناک بم باری، بھوک، تباہ کاری، خوف، توپوں کی گھن گرج، راشن پانی ختم، معصوم بچی کا دودھ کے لیے بلکنا کہ اب تو بہلاوے بھی ختم ہو چکے تھے اور پرسوں اچانک بم باری کے نتیجے میں شدید زخمی ہونے والا اُس کا شوہر، جسے تڑپتے، بلکتے، لہولہو ہوتے دیکھ کر بھی وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکی تھی کہ بلا کی بم باری ہو رہی تھی۔ راکٹوں کی بارش، گولیوں کی تڑتڑاہٹ، زمین بوس ہوتے گھر، جن کے منہدم ہونے والے خوفناک دھماکے اور جب وقفہ کے دوران جاں بلب، زخمی مرتضٰی کو اسپتال لے جایا گیا تھا تو اچانک بالکل اچانک ہونے والی بلاسٹنگ نے مریض، ڈاکٹر، نرس، تیماردار، حتیٰ کہ پورے اسپتال کی عمارت کو زمین بوس کر ڈالا۔ بلکتے، کراہتے، لوگ لمحے بھر میں خاموش ہو گئے۔ پیوند خاک بن گئے۔

صرف قیامت کا شور مچاتی آہیں گونجتی رہیں۔ روتے سسکتے بین، دلوں کو چیرتی المدد، المدد کا ورد کرتی زبانیں باقی بچی تھیں۔

اقوام متحدہ کی تنبیہ کے باوجود اسرائیلی خون آشام درندے، مسلسل گولہ باری کرتے رہے۔ بے بس انسان، سسکتی انسانیت کو تہس نہس کرتے رہے، اس اطلاع کے باوجود کہ اسکولوں میں شہری آبادی پناہ گزین ہے۔''

توپ کے گولے برسا کر، ماں باپ کے پہلو میں سوئے معصوم ہنستے، بے زبان بچوں تک کو ابدی نیند سلا دیا۔ اس طرح کہ ہر طرف خوف، خون، گوشت کے لوتھڑے تھے۔ بھیانک چیخیں تھیں۔ کوئی بھی نہیں تھا جو اِن درندوں کو روکتا۔

صباح نے دل کے تمام دُکھ روتے الفاظ میں اُس ہمدرد، غیر ملکی خاتون کی جھولی میں ڈال دیے اور اب وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ سہما، سہما سا ابراہیم، ماں کا دامن تھامے، خشک آنکھوں سے، اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس کے خشک حلق سے سرسراتی آواز برآمد ہوئی۔

''آپ کے پاس میری چھوٹی بہن کے لیے کچھ دودھ ہوگا؟'' پوری ٹیم نے تڑپ کر اس معصوم بچے کو دیکھا۔ اُس کے معصوم سوال نے ایک زوردار طمانچے کی طرح ان کے چہروں کو سرخ کر دیا تھا۔

انسانیت کی اس سے بڑی تذلیل اور کیا ہوگی کہ معصوم بچے اپنا بچپن کھو چکے تھے؟ جارج نے آگے

بڑھ کر اس بچے کو گود میں اٹھالیا اور پھر نہایت شرمندگی سے اُسے بوسہ دیا اور کچھ دیر بعد ہی وہ پوری ٹیم گھیرا بنائے ابراہیم کو پیار کررہی تھی۔ البرٹو نے اپنے ہاتھوں سے گرم گرم پیزا، اُس کے منہ میں ڈالا تھا اور صباح اُس ٹیم کی دیگر ورکر خواتین کے ساتھ کیمپ کے باقی ماندہ لوگوں تک راشن پہنچانے جاچکی تھی، اس ہدایت کے ساتھ کہ چھوٹی بہن کو اُٹھنے پر دودھ دینا۔

باہر وقفے وقفے سے جاری اسرائیلی، جارحیت بھی اُس کا اور اُس ٹیم کے ارکان کا حوصلہ پست نہ کرسکی تھی۔

اُس دن کی شام ہونے سے پہلے، لوٹنے، سُلگتے گھروں میں بارود کی بارش تھمنے کے بعد رخصت ہونے سے پہلے، کینی اور اُس کی دیگر ساتھیوں نے، مزید کھل کر اپنی تنظیم اور اپنے مقاصد سے آگاہ کیا تھا۔

بقول اُن کے یہ اُن کا اور اُن کی کمیٹی کا خاص الخاص انسانی ہمدردی مشن ہے۔''

انہیں علم ہے کہ اُن کا ملک اور حکمران، درپردہ اسرائیلیوں کی مدد کررہے ہیں اور راگ الاپ رہے ہیں اپنی بے بسی کا۔ اقوام متحدہ کا سربراہ 'نیوی پلے' بذات خود اقرار کررہا ہے کہ اسرائیل بین الاقوامی اصولوں کی خلاف ورزی کررہا ہے۔'' اقوام متحدہ نے اسرائیل کو اسکولوں، گھروں، اسپتالوں پر حملہ کرنے پر جنگی جرائم کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے، اور امریکا کو اس بات پر بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ وہ غزہ میں جاری جارحیت کو رکوانے میں ناکام رہا ہے۔ انہوں نے ناروے کے ہیرو ڈاکٹر گلبرٹ کا خصوصی ذکر کیا کہ ایک عام انسان ہونے کے ناتے، غزہ میں ایک اسپتال میں بطور ڈاکٹر، اپنے فرائض انجام دینے کے ناتے، اُس دردمند دل رکھنے والے، بے بس انسان نے کس طرح، امریکی صدر بارک اوباما کو خط لکھا جس کا عنوان ہے۔

''کیا آپ کے سینے میں بھی دل ہے۔''

وہ کہتے ہیں کہ اوباما مسٹر صدر امریکہ، جناب صدر، صرف ایک رات! صرف ایک رات آپ غزہ کے الشفاء اسپتال میں ہمارے ساتھ گزاریں۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اس سے تاریخ بدل جائے گی۔''

کاش اے، کاش، ناروے کے اُس ہیرو ڈاکٹر گلبرٹ کا یہ خط من وعن دنیا کے ہر ملک کی، ہر زبان میں شائع ہو۔ مزید یہ کہ...... کل صبح ہماری ٹیم واپس جائے گی۔ اور ایک دوسری تازہ دم ٹیم پھر آپ لوگوں کے پاس آئے گی اور یہ ہمارا آپ سے اپنے آپ سے وعدہ ہے کہ اس ظلم و بربریت کی خون آشام تصویریں، زندہ بلکتے انسانوں کی تکلیفیں جس قدر ممکن ہو دنیا کے ممالک کے لوگوں کے گوش گزار کریں گے۔

شاید! ہماری یہ کوشش رنگ لے آئے؟ اس گلوبل ویلج کا کوئی ایک ملک، کوئی ایک صدر، کوئی ایک حاکم، کوئی ایک عام شہری اس درد اور تکلیف کو محسوس کرلے جو آپ لوگوں کا مقدر بنادی گئی ہے۔ کوئی تو ہو، کوئی ایک انسان، کوئی ایک مسلمان، کوئی مسلم حاکم، پوری دنیا میں بکھرے تسبیح کے دانوں کی طرح...... مسلمان، باہم ایک ہوجائیں۔

انہوں نے یہ بھی اعتراف کیا کہ اس مرتبہ بھی ایک لیڈی، ایک مسلمان لیڈی، پاکستان نژاد ایشیائی لیڈی سعیدہ وارثی، تمام گونگے، بہرے، اندھے بنے حاکموں پر سبقت لے گئی ہے۔ سعیدہ وارثی نے وزیراعظم برطانیہ 'ڈیوڈ کیمرون' کو لکھا کہ '' مجھے برطانوی پالیسی پر بہت دکھ اور افسوس ہے، یہ اخلاقی لحاظ سے قابل دفاع نہیں۔ وہ چونکہ حکومت کی 'غزہ پالیسی' کی حمایت نہیں کرسکتیں، لہٰذا وہ وزارت سے استعفیٰ دے رہی ہیں۔''

کاش! اس دردمند دل رکھنے والی لیڈی کے کرارے الفاظ طمانچے کی صورت، کسی مسلم بادشاہ، کسی انصاف پسند حکمران، کسی غاصب صدر کو غفلت سے جگادیں، کاش عرب حکمران، اس غلط سوچ سے باہر آجائیں کہ 'حماس' اُن کی دشمن ہے۔ جی ہاں یہ تلخ مگر دل ہلادینے والی سچائی ایک خبر کی صورت، اخبار کی زینت بن چکی ہے کہ...... '' عرب لیڈرز حماس کو اسرائیل سے بھی بڑا خطرہ سمجھتے ہیں۔'' اس خبر پر دنیا بھر کے مسلمان حیران تھے، پریشان تھے مگر، اس خبر پر

عرب حکمرانوں کی مسلسل خاموشی، اس بات کو سچ ثابت کرتی ہے کہ محض ایک انسان اور انصاف پسند انسان ہونے کے ناتے ایک دردمند دل اور انسانیت سے پیار کرنے والی تنظیم کے مخبر کے ناتے آپ کی طرح ہماری بھی خواہش ہے کہ اسرائیل جنگ ہار جائے۔

''انشاء اللہ'' خاموش بیٹھی خواتین یک زبان بولیں۔

''یقیناً اسرائیل یہ جنگ ہار چکا ہے۔ آنے والے وقت میں ہمارے خون کا اک اک قطرہ حساب لے گا۔ دنیا دیکھے گی کہ اسرائیل یہ جنگ ہار چکا ہے اور معصوم ہنستے مظلوم فلسطینیوں کی، عام سی تنظیم 'حماس' جیت چکی ہے۔'' صباح نے مستحکم لہجے میں کہا اور تمام لوگوں نے ''آمین'' کہا۔

تب اچانک ماں کی گود میں سر رکھا ابراہیم یک بیک اُٹھ بیٹھا۔

''کیا آپ یہ سب پوری دنیا کو بتائیں گے کہ ہم...... مظلوم ہنستے...... بچوں کے ساتھ کیسا ظلم ہوا ہے؟''

اور کیٹی نے اُسے اپنے گلے لگا کر کہا۔ ''مائی سن! میرے بچے! میں اور میری ٹیم، اسرائیل کا مکروہ چہرہ، ان اذیت ناک تصویروں کے ذریعے، ابلاغ کے ذریعے، ضرور منظر عام پر لائیں گے۔ ان یہودیوں کے بدبودار نجس کردار کو، دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔ چاہے اس کوشش میں، ہماری جان ہی چلی جائے۔''

''لیکن...... ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ لوگوں کو اس ظلم کا علم ہو گیا ہے؟'' معصوم ذہن کے معصوم سے وسوسے کے ساتھ ابراہیم نے پھر پوچھا۔ ''ہماری طرح کئی اور تنظیمیں، تصویروں کی صورت اسرائیلی درندگی کو تواتر سے چھاپ رہے ہیں، میڈیا پر رپورٹس دکھائی جا رہی ہیں، یہ اور بات کہ مسلم حکمران، عرب لیڈران اپنے مفاد کی خاطر اب تک خاموش ہیں، اور ان کو جگانے میں ہماری ٹیم کی ہر ممکن کوشش شامل ہوگی۔''

اور پھر صبح کی سفیدی پھیلنے سے پہلے ہی یہ دس

موت

میں جتنا بھی طاقتور بن جاؤں لیکن ہر رات میری زندگی کا ایک دن کم کر دیتی ہے اور میں چاہ کر بھی اسے روک نہیں سکتا اور اللہ اتنا رحیم ہے کہ مجھے پھر سے نئی صبح دے کر توبہ کرنے کا موقع دیتا ہے کہ میرا بندہ اب سنبھل جائے۔

مرسلہ: یاسر وکی۔ دیپال پور

رُکنی ٹیم رخصت ہوگئی۔ اور تادم تحریر ابھی کسی کو بھی جگانے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے تب ہی تو دھواں دھار فضائی حملے، اُسی طرح شہریوں کی جان لے رہے ہیں اور اُس دن کے بعد سے جس علاقے میں بجلی کی موجودگی کا احساس پایا جاتا ہے، ننھا ابراہیم، ماں سے چھپ کر، اُس جگہ پہنچ جاتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اُن کی بے بسی کی خبریں سُن کر کسی مسلم حکمران نے مسلم ہونے کا حق ادا کیا ہے؟ اُن کی دادرسی کے لیے۔ اور گلی میں اُڑنے والا کوئی بھی تراشہ لا کر ماں کے آگے رکھ دیتا ہے کہ شاید کیٹی کی ولولہ انگیز تقریر سے کسی ایک اہل دل، اہل نظر، اہل مسلمان، جاگ اٹھا ہے۔ ان کی مدد کو لبیک کہنے کے لیے، اس بات سے بے خبر کہ بربریت کی تشویشناک تصویروں والے اخبار، عام لوگوں تک پہنچتے ضرور ہیں مگر محض ایک نئے دن کی روداد لے کر، پڑھ لینے کے بعد ردی کی صورت اختیار کر جانے والے، اخبار یا پھر...... ناشتے، کھانے سے پیٹ بھر سیر ہو کر کھانے کے بعد، برتنوں کے نیچے بچھے اخبار، بطور دستر خوان بنے اخباری تراشے، جو کھانے کے بعد ہاتھ صاف کرنے والے ٹشو پیپر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں...... کب تک یہ ہوتا رہے گا؟ کب تک یہ جان لیوا کھیل جاری رہے گا، کچھ خبر نہیں...... کب تک ہمارے دکھ ٹشو پیپر کی طرح صرف آہ بھر کر پیروں تلے روندے جاتے رہیں گے۔

☆☆......☆☆

گیارہویں سچ بیانی

میں بھلا کون ہوں؟

سائرہ فاطمہ

لاہور سے، اپنوں کے درمیان، اپنی ذات کو کھوجتی ایک حرماں نصیب دوشیزہ کی داستان

میرا نام سائرہ فاطمہ ہے اور میرا تعلق لاہور کینٹ سے ہے۔ میں تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ جن میں میرا دوسرا نمبر ہے۔ میں آپ کو ایسی کہانی سنانے جا رہی ہوں جو نا تو من گھڑت ہے نا فرضی کہانی ہے، بلکہ

اس کا ایک ایک لفظ حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ کہانی کسی اور کی نہیں بلکہ مجھ ناچیز کی آپ بیتی ہے۔

میری کہانی زندگی کے دکھوں اور مصائب و آلام سے شروع ہو کر وہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ میری زندگی کو دکھوں کی جانب دھکیلنے میں میرے باپ نے جو کردار ادا کیا ہے وہ کوئی دشمن بھی ادا نہیں کر سکتا۔

میرا باپ ایک ظالم و جابر اور سخت گیر انسان تھا۔ جس نے ہمیں اور ہماری ماں کو اپنے بہنوں اور بھائیوں کی خوشی کی خاطر ساری زندگی کے لیے ان کے پاؤں میں روند ڈالا۔ اور میری ماں جو ہر طرح سے ہمارے باپ کے رحم و کرم پر تھیں۔ کیوں کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی تھیں، لہٰذا میرے نانا جان نے بیٹی کی شادی کرنے کے اور بیٹی اور داماد کو اپنے پاس رکھنا مناسب سمجھا اور میرے باپ کو گھر داماد کے طور پر قبول کر لیا۔

نانا جان کے پاس خدا کا دیا ہوا سب کچھ تھا۔ اگر کمی تھی تو صرف اولادِ نرینہ کی۔ میری امی کے پیدا ہونے پر انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس کی رضا مندی پر راضی رہے اور کبھی دوسری شادی کی طرف دھیان نہ دیا کہ چلو خدا نے اولاد کی نعمت سے تو سرفراز کیا، چاہے اس نے بیٹی ہی دی۔ یہ بھی اس کی نعمت ہے۔

میرے والد نے جب میرے نانا جان کے گھر پر رہنا شروع کیا تو وہ جلد ہی سمجھ گئے کہ اس گھر کے مکینوں کو اپنے قابو میں کر کے محکوم بنانا کوئی مشکل نہیں ہے۔ جلد ہی انہوں نے اپنے پر پُرزے نکالنا شروع کر دیے اور آئے دن وہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے نظر آتے اور ان مظلوموں پر ظلم کرتے پھرتے جنہوں نے انہیں اپنے گھر میں پناہ دی تھی، ان کو عزت دی اور اپنا بیٹا بنایا، مگر وہ تو کسی اور ہی منصوبے سے اس گھر میں داخل ہوئے تھے۔ بہت حد تک وہ اپنے منصوبے میں کامیاب بھی ہو چکے تھے۔ ان کے آئے دن کے جھگڑے فسادات اور گالم گلوچ نے نانی اماں کی حالت بگاڑ کے رکھ دی۔ انہوں نے گھر کی بگڑتی ہوئی صورت حال اور اپنی بیٹی کی زندگی برباد ہونے کا ایسا روگ لگایا کہ وہ دل کی مریضہ بن گئیں۔

نانی اماں بیماری کے دنوں میں میرے بڑے بھائی کی پیدائش ہوئی۔ بڑا بھائی مشکل سے ابھی ایک برس کا تھا کہ نانی اماں اس دنیا سے چلی گئیں۔ امی بتاتی ہیں کہ نانی اماں کے بعد نانا جان کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ بالکل اکیلے رہ گئے تھے۔ بوڑھے بھی بہت ہو چکے تھے اس لیے وہ اکیلے میرے باپ کا مقابلہ قطعاً نہیں کر سکتے تھے۔

وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا۔ آخر تین سال کا عرصہ بیت گیا۔ میرے باپ نے اپنے معمولات میں ذرہ برابر بھی فرق آنے نہیں دیا اب تو وہ اور بھی جوبن پر رہنے لگے تھے، کیوں کہ میدان تو بالکل صاف تھا اور ان کے کھیل میں ایک ضعیف شخص بھلا کیسے رکاوٹ پیدا کر سکتا تھا۔ جو کھیل وہ اپنے بہن بھائیوں کے کہنے پر میری ماں اور میرے نانا جان کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھے۔

نانی اماں کی وفات کے تین سال بعد میں اس دنیا میں آئی۔ نانی اماں کے جانے کے بعد امی کو میرے اس دنیا میں آنے سے کچھ سہارا مل گیا تھا۔ امی میری پیدائش پر بہت خوش تھیں۔ نانا اپنی بیٹی اور ان کی اولاد کو دیکھ کر کڑھتے رہتے تھے کہ میرے بعد ان کا کیا بنے گا۔ وہ گھر جس گھر میں ہم سب رہتے تھے میرے نانا جان کا ہی تو تھا۔ مگر وہ اپنا گھر ہونے کے باوجود گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ میرے باپ کے رویے سے تنگ آ کر وہ کئی کئی مہینے اپنے بہن بھائیوں کے پاس رہتے اور گھر نہ آتے۔ اس دوران میرے باپ کے مظالم میں اور بھی شدت آ جاتی اور وہ معصوموں پر بھی ظلم کرنے سے باز نہ آتے۔ آخر یہ سلسلہ کب تک چلتا نانا جان بہت تھک چکے تھے اور اب وہ آرام کرنا چاہتے تھے کیوں کہ ان کی صحت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ ایک دن نانا جان اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے کہ میرے والد نے امی کے ساتھ پھر لڑنا شروع کر دیا۔ امی ان کی منتیں کرتی رہیں کہ میرے باپ کی حالت پر رحم کھاؤ۔ لیکن انہوں نے تو رحم کرنا سیکھا ہی نہیں تھا، تو وہ کیسے کرتے۔ نانا جان یہ سب کچھ برداشت نہ کر پائے اور ایک دن اپنے دو جوڑے بیگ میں ڈال کر خاموشی سے گھر سے چلے گئے ابھی نانا جان کو گھر سے گئے ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے ایک دن اچانک دروازے پر بیل ہوئی۔ جب دروازہ

کھولا تو سامنے ایمبولینس کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے بھائی کو بتایا کہ ہم آپ کا مریض لے کر آئے ہیں جسے آپ اندر گھر میں لے جائیں۔"

نانا جان ایمبولینس میں اسٹریچر پر لیٹے ہوئے تھے۔ انہیں اسٹریچر پر ہی اندر لایا گیا کہ ان میں چلنے کی سکت بھی نہ تھی۔ ہم سب بہن بھائی اس وقت بہت چھوٹے ہوتے تھے اور کچھ بھی کرنے سے قاصر تھے۔ ہمارے گھر کے قریب کوئی کلینک بھی نہیں تھا کہ ہم نانا جان کو وہاں لے کر جاتے یا وہاں سے کسی ڈاکٹر کو بلا لاتے۔ میری امی ایک باپردہ خاتون تھیں اور گھر سے بھی باہر نہیں نکلتی تھیں۔ جبکہ میرے والد صاحب اپنی آوارہ گردی کے سلسلے میں گھر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کا معمول تھا یہ وہ اپنا زیادہ تر وقت باہر گزارتے تھے۔ وہاں ان کی کیا مصروفیات تھیں؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی بھی پوچھنے یا جاننے کی ہمت کی۔ بس یہی تو ایک دم تھا کہ وہ گھر سے دور رہتے تھے اور ہم لوگ ان کے سائے سے بچے ہوتے تھے۔

موبائل فون اس وقت ہوتے نہیں تھے اور پی ٹی سی ایل ہمارے گھر میں نہیں تھا کہ ہم اپنے والد صاحب کو فون کرتے۔ اگر کرتے بھی تو کہاں پر کرتے ہمیں ان کا کوئی اتا پتا معلوم نہیں تھا۔ ہمارے پاس کوئی ایسی جمع پونجی بھی نہیں تھی کہ ہم نانا جان کا علاج کرواتے کیوں کہ میرے والد فوج میں چند سال گزارنے کے بعد ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کا تمام تر انحصار میرے نانا پر ہی تھا۔ جو تھوڑی بہت پنشن ملتی تھی وہ خود ہی رکھتے تھے۔ اس کے بارے میں بھی علم نہیں تھا۔ آخر کار نانا جان تین دن زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے لیکن ہم مجبور و بے بس تھے۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

وہ رمضان المبارک کے دن تھے۔ نانا جان کو گھر آئے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ امی سحری کے بعد نہیں سوئی تھیں کیوں کہ اس دن نانا جان کی طبیعت صبح سے ہی خراب تھی۔ صبح نو بجے کے قریب ان کی حالت بگڑنا شروع ہوگئی۔ ہم سب ان کے گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے اچانک کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیا۔ میرے نانا بہت نیک اور اللہ والے آدمی تھے۔ اللہ نے انہیں جوانی میں بیت اللہ کا حج بھی نصیب فرمایا تھا۔

اب ان کی آواز بھی آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہوگئی۔ ان کا بدن نڈھال اور بے جان ہونے لگا تھا۔ آخر کار ان کی روح اس فانی دنیا کے مصائب و رنج والم سے چھٹکارا پا کر قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اور ہم ان کے بے جان جسم کو دیکھتے رہ گئے۔

نانا جان بہت عظیم انسان تھے۔ انہوں نے اس دنیا میں رہ کر بہت تکلیفیں اٹھائیں اور بہت دُکھ برداشت کیے۔ اس سے بڑا دُکھ اور کیا ہوگا کہ انہیں اپنی واحد اور اکلوتی اولاد کو ظالم دنیا میں چھوڑ کر جانا پڑا۔ میری نانی اور نانا جان دونوں اس دنیا سے دکھی دل کے ساتھ گئے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کی مغفرت فرمائے اور ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین!

نانا جان کی وفات کے بعد میرے باپ نے نانا کا گھر بیچ دیا اور رقم دبا کر بیٹھ گئے اور ہمیں اپنے ایک آبائی گھر کے کچے سے کمرے میں لا کر پھینک دیا۔ اور خود لاہور آ کر اپنی بہن کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گئے۔

ہم سب بہن بھائی اس وقت کافی چھوٹے تھے۔ اور اپنے باپ کے ان رویوں کو سمجھنے سے قاصر بھی، ہم دیوانہ وار اپنے باپ کی راہ تکتے تھے مگر ان کو کبھی کسی پر رحم نہیں آیا، نہ بڑوں پر اور نہ ہی چھوٹوں پر۔ ہماری نظریں سارا سارا دن ان کو تلاش کرتیں مگر وہ کہیں نظر نہیں آتے۔ آخر تھک ہار کر ہم سب بہن بھائی اپنی ماں کے گرد جمع ہو جاتے۔ ہمارا باپ ہر چھ ماہ بعد آ کر پانچ ہزار ہمیں چارے کی صورت میں ڈال دیتا۔ اور پھر ان ہی قدموں واپس چلا جاتا۔ اسے ہمارے ساتھ کچھ وقت گزارنا بھی گوارہ نہ تھا۔ کسی بھی ذریعہ آمدن کے بغیر باقی کے چھ ماہ کس طرح گزارتے، یہ ہمارا خدا ہی جانتا تھا۔

ہمارے باپ نے ہمیں گاؤں کے پسماندہ ماحول میں بے آسرا چھوڑ دیا۔ جہاں پر ترقی کے کوئی مواقع نہیں تھے۔ اس ماحول میں ہماری صلاحیتوں کو زنگ لگ رہا تھا۔ تعلیم صحت ذرائع آمد و رفت کی کوئی سہولت نہ تھی۔ ہم یہاں بالکل بے آسرا پڑے ہوئے تھے۔ اس جگہ کی مٹی اور دیمک ہماری زندگی کے بیش قیمت سال نگل گئیں۔

نانا جان کی وفات کے بعد ہماری زندگیوں کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ ابھی ہم سب بہن بھائی اس ظالم دنیا

میں زندگی بسر کرنے کے گر سیکھ ہی رہے تھے کہ ہمارے باپ نے ہمیں ایک اور زوردار دھچکا پہنچایا۔ ہمیں اس بے رحم دنیا کی موجوں کے حوالے کر کے ہم سے ہمیشہ کے لیے بے دخل ہو گئے۔ بے دخل تو وہ ہم سے پہلے بھی تھے مگر اس وقت اتنا تو تھا کہ وہ سال بھر گاؤں میں ایک آدھ چکر لگا لیا کرتے تھے اور سال میں ایک بار پانچ یا دس ہزار کی خیرات بھی ہمیں دے جایا کرتے تھے۔ مگر پھر وہ اور بھی سمجھ دار ہو گئے اور ہم سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پا کر لاہور میں ہی سکونت پذیر ہو گئے۔

وقت گزرتا رہا کئی سال اور بیت گئے۔ ہمارے بہت سے رشتے دار اسی گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ سب بہت خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ ان سب کے گھروں میں اپنی گاڑیاں موجود تھیں۔ جس کی وجہ سے ان کے بچے سرگودھا شہر کے اچھے اسکولز اور کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

وہ لوگ گاؤں میں رہتے ہوئے بھی شہروں جیسی زندگی بسر کر رہے تھے۔ کیوں کہ ان کی زمینداری کا سلسلہ قائم تھا اور ذرائع آمدن محدود نہیں وسیع تھے۔ وہ ہر لحاظ سے مضبوط تھے، لیکن ہمارا ان سے کوئی واسطہ تعلق نہیں تھا۔ انہیں اپنی دولت پر بڑا ناز تھا جب کہ ہم لوگ بھی اسی شاہینوں کے خوبصورت ہرے بھرے کھیتوں سے سیراب پنج آب کی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اب ایک ہی گاؤں میں ہونے کے باوجود انتہائی غربت و افلاس کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ وقت ہم نے کس طرح گزارہ یہ ہم ہی جانتے ہیں۔

ہماری ماں نے ہمارے لیے بہت محنت کی۔ اس نے انتہائی برے حالات میں بھی ہمیں اپنی سلیقہ شعاری اور سمجھداری سے پالا بھی اور اپنی حیثیت کے مطابق تعلیم بھی دلوائی۔ بڑے بھائی کو پرائیویٹ بی اے کروایا، جب کہ مجھے اور مجھ سے چھوٹے بھائی کو ایف اے کروایا۔ اور سب سے چھوٹا بھائی میٹرک کر رہا ہے۔ بڑا بھائی بی اے کر کے لاہور آ گیا اور پرائیویٹ فرم میں ملازمت کرنے لگا جس کے بعد انہوں نے ہمیں بھی اپنے پاس بلا لیا۔

میں اپنی زندگی میں کچھ ایسا بننا چاہتی تھی۔ جس سے ہماری تمام تکلیفوں کا ازالہ ہو سکے، ہماری کھوئی ہوئی عزت و وقار دوبارہ بحال ہو سکے۔ مجھے بچپن سے ہی آرمی میں ڈاکٹر بننے کا شوق تھا، شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے والد بھی آرمی میں تھے اور اس وقت میرے دل میں پاکستان آرمی کی محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔ وہ ہمیں پاکستان آرمی کے نظم وضبط، ان کے مثالی طرز زندگی گزارنے کے طریقے اور ان کی محنت و مشقت اور جنگی کارناموں کے حوالے سے واقعات بتاتے اور سناتے تھے۔ جس سے میرا جذبہ جنون اور بھی راحت پاتا تھا اور میں بحیثیت لیڈی ڈاکٹر پاک فوج کے میڈیکل کور کا حصہ بننا چاہتی تھی، لیکن میں نے زندگی میں جو بھی خواہش کی اسے پورا ہونے سے پہلے ہی کچل دیا گیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے باپ نے ہمیں زندگی میں ویسا نہ بننے دیا جیسا کہ ہماری ماں اور ہم سب بہن بھائی چاہتے تھے۔

میں آج بھی یہی سوچتی ہوں کہ ہمارا باپ پاک فوج میں رہنے کے باوجود اتنا سخت اور سنگدل کیوں تھا، جبکہ پاکستان آرمی کا مطلب تو محبت اور وفا ہے۔ جو ہر وقت اور ہر پاکستانی کے لیے اپنی محبتوں اور وفاؤں کا دامن پھیلائے رکھتی ہے۔ وہ تو دشمن کے ساتھ بھی کوئی غیر انسانی و غیر اخلاقی سلوک نہیں کرتی اسی لیے مجھے آج بھی پاکستان آرمی سے شدید محبت، عقیدت اور دلی وابستگی ہے۔ میں اگر آج پاکستانی فوج کا حصہ نہیں بن سکی تو پاکستان آرمی کی محبت کو کوئی میرے دل سے نکال بھی نہیں سکا۔

یہ شاید ہماری قسمت ہی کی خرابی تھی کہ ہماری اپنے باپ کے ساتھ کچھ اچھی یادیں وابستہ نہیں ہیں۔ خیر اب تو ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ آئے دن کے جھگڑوں اور فسادات سے جان چھوٹ گئی۔ کیوں کہ ہمارا باپ ایک نفسیاتی مریض تھا اور اُسے ہمیں اذیت دے کر خوشی محسوس ہوتی تھی۔

انہوں نے مجھے اپنے ظلم کا نشانہ بنایا، کیوں کہ میں لڑکی تھی اور جب کہ بیٹے تو بیٹے ہوتے ہیں۔ اور ان کے ہر طرح سے ہی لاڈ اٹھائے جاتے ہیں اور لڑکیوں کو چکی میں پیس کر رکھا جاتا ہے، ایسا کیوں ہے؟ یہ بات میں آخر سمجھ نہ سکی۔ ویسے تو میرے باپ کو اولاد کی ضرورت ہی نہیں تھی، لیکن اگر کبھی ان کے دل میں پدری شفقت موجزن ہوتی بھی تو وہ بھائیوں کو ہی مجھ پر فوقیت دیتے

اور مجھے کوئی اہمیت نہ دی جاتی۔ خیر میری تو کسی کے پاس بھی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ امی جو بظاہر مظلوم اور میرے باپ کے مظالم کا شکار نظر آنے والی بے بس عورت تھیں۔ مگر وہی عورت میرے لیے ایک جابر اور سخت گیر ماں تھی۔ میں نے ان کے ساتھ زندگی کے ہر لمحے میں وفا کی، مگر ان کے رویے میں کبھی بھی میرے لیے لچک پیدا نہ ہو سکی۔

میں نے ان کے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی پر آواز اٹھائی اور ان کا ساتھ دیتی رہی۔ مگر وہ مجھ سے ابا کی طرف سے کی گئی زیادتیوں کا بدلہ لیتی رہیں۔ اور مجھے ہمیشہ دھتکارتی رہیں۔ مگر میں انہیں سمجھ ہی نہ سکی اور ہمیشہ ان کے رویے کو ان کی سختی سمجھتی رہی کہ جس طرح ایک ماں اپنے بچوں پر سختی کرتی ہے مگر ان کے رویے کی سختی مجھے کچھ اور ہی بتاتی ہے، جبکہ بھائیوں کا رویہ بھی امی کو دیکھ کر بدلتا جا رہا ہے۔ وہ سب مجھے بوجھ سمجھتے ہیں اور اکثر کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ باپ تو اس کو چھوڑ ہی گیا اور یہ مصیبت ہمارے گلے میں ڈال دی گئی۔

سب سے بڑا المیہ تو یہ ہے کہ میرا سگا باپ بھی مجھے اپنی اولاد تسلیم کرنے سے گریزاں ہے۔ اس کے دل میں نجانے یہ گرہ کیسے بندھ گئی کہ میں ان کی اولاد نہیں اور حیرت کی بات تو یہ کہ اس کے بعد کھل کر کوئی یہ نہیں بتاتا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آئی ہوں؟ حالانکہ میں نے ان ہی کو آنکھیں کھولے ماں باپ پایا ہے۔

اب جب میں اپنے گزرے ہوئے وقت اور موجودہ وقت کو دیکھتی ہوں تو مجھے دونوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا، کیوں کہ میرا ماضی میرے حال جیسا تھا، وہ تو تھا لیکن میں اب سوچتی ہوں نجانے میرا مستقبل کیسا ہوگا، یہ خدا ہی جانتا ہے۔

میں نہیں جانتی کہ میرے والدین اور میرے بھائیوں کو کس بات نے مجھ سے دور کیا اور وہ سب کیوں مجھ سے نفرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ بھی میرا خدا جانتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی رشتے دار کی محبت اور خلوص کو نہیں پایا، مجھے دکھی کرنے میں ہر شخص نے انفرادی طور پر اپنا حصہ ڈالا ہے۔ اگر میں رو رو کر اپنے دل کا غبار کم کرنا چاہوں تو نہیں کر سکتی، کیوں میں جس گھر اور ماحول میں رہتی ہوں وہاں پر ہنسنے اور رونے کی ممانعت ہے۔

قارئین! اس کہانی کو پڑھ کر اگر کسی کو پتا چل جائے کہ میں کون ہوں تو ضرور بتائیے گا۔ کیوں کہ میں آج بھی اپنا آپ تلاش کر رہی ہوں۔ اللہ ہم سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

☆☆......☆☆

استاد کی عظمت

سکندر اعظم اپنے اتالیقوں اور اساتذہ کا بے حد احترام کرتا تھا۔ خاص کر اسے ارسطو سے انتہائی عقیدت تھی۔ اس عقیدت کے مختلف عملی مظاہرے ملتے ہیں۔ نیز سکندر اعظم کا مشہور قول ہے کہ:

"میرا حقیقی باپ مجھے آسمان سے زمین پر لایا تھا، لیکن میرے رسمی باپ یعنی استاد نے مجھے زمین سے بلند کر کے آسمان تک پہنچا دیا۔"

اسی طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار سکندر اعظم ایک تیز و تند ندی پر پہنچا۔ ارسطو بھی ساتھ تھا۔ سکندر نے فوراً قدم بڑھائے اور ندی عبور کر گیا۔ جب اس سے اس طرز عمل کے بارے میں پوچھا گیا کہ اس نے استاد سے پہلے کیوں قدم بڑھایا تو اس نے ایک ایسا جواب دیا جو آج تک تاریخ کے اوراق میں محفوظ اور استاد شاگرد کے محترم رشتے اور عظمت استاد کا گواہ ہے۔ اس نے کہا:

"اگر سکندر اسی ندی میں ڈوب کر مر جاتا تو ارسطو ہزاروں نئے سکندر پیدا کر سکتا تھا، لیکن اگر ارسطو اسی ندی کی طغیانی کی نذر ہو جاتا تو ہزاروں سکندر مل کر بھی ایک ارسطو کو جنم نہ دے سکتے تھے۔"

سکندر ایک عظیم انسان تھا اور ارسطو کے لیے بھی شاید کسی اور کو سکندر بنانا ممکن نہ ہوتا، لیکن سکندر اعظم نے یہاں اپنے استاد کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اسے نہایت عمدہ انداز میں خراج تحسین پیش کیا جو استادوں کے لیے شاگردوں کی طرف سے قابل فخر خراج تحسین ٹھہرا۔" ماخوذ، سکندر اعظم"

مرسلہ: صفیہ فہیم بٹ۔ کراچی

محمد یوسف لغاری

لیہ سے، آج کے دور کی وہ تصویر، جسے دیکھ کر شاید کوئی فلاح پا جائے

"اُف توبہ اتنی گرمی، آج تو سورج ایسے گرمی برسا رہا ہے گویا دنیا ہی جہنم ہے۔" ماہم نے موسم پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں یہ جہنم نہیں ہے۔ اگر یہ جہنم ہوتی تو یہاں حوریں نہ ہوتیں کیونکہ حوریں تو جنت میں ہوتی ہیں، جبکہ اس وقت میرے سامنے ایک حور موجود ہے تو یہ دنیا جہنم تو نہ ہوتی۔" ارحام نے صنف نازک کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے اس کو مکھن لگا کر اپنے جال میں پھنساتے ہوئے کہا۔

"واہ ارحام صاحب، میں اور حور، اتنا بھی مکھن نہ لگاؤ، یہ تو ثابت ہے کہ جب تم کسی کی تعریف کرتے ہو تو اس میں تمہارا کوئی ثانی نہیں ہوتا۔" ماہم نے کہا۔

"ارے نہیں یار سچی کہہ رہا ہوں۔ تم بہت ہی حسین ہو کہ حور تو کچھ بھی نہیں۔" ارحام نے انتہائی ڈھٹائی اور لاعلمی سے ایک عام بنتِ آدم کی شان میں قصیدہ پڑھ کر ایک گناہ کرتے ہوئے کہا، حالانکہ جنت کی حوریں کہاں اور یہ عام سی لڑکی کہاں۔

ماہم اور ارحام یونیورسٹی کے کلاس فیلو تھے اور اس وقت چھٹی کے بعد دونوں ڈرنک کارنر میں موجود تھے۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ آج جب تم دیر سے گھر جاؤ گی تو کوئی تفتیش تو نہیں ہوگی کہ دیر سے کیوں آئی ہو۔" ارحام نے پوچھا۔

"ارے نہیں، میں اپنی سہیلی ایشل کا بہانہ بنا دوں گی کہ اس کے پاس تھی اور جب ایشل پر کوئی مشکل وقت آتا ہے تو وہ میرا بہانہ بناتی ہے اور پھر اس وقت ابو بزنس میں، امی این جی او میں، بھائی کسی اپنے چکر میں ہوں گے، آدھے گھنٹے پہلے جب اس کا نمبر ملایا تھا تو اس کا نمبر بزی تھا اور اب بھی ہوگا اور پھر اوپر سے وہ سموسوں کا بہت رسیا ہے، تم مجھے اس کے لیے سموسے لے دینا بس، میں اس کو دے دوں گی۔ وہ چپ ہو جائے گا۔" اس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک چھوٹا بچہ ملک شیک کے دو گلاس لے کر اندر داخل ہوا۔

"سلام صاحب، کیسے ہو اور آج تھری جی والے ہو گئے ہو۔" اس نے جوس کا گلاس میز پر رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے چھوٹو ابھی تھری جی ٹیکنالوجی نہیں لی اور تو چل نکل، یہاں سے چل بھاگ۔" ارحام نے اس کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ لگتا تھا کہ وہ بچہ اور ارحام ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

''کون تھا یہ؟'' بچے کے جانے کے بعد ماہم نے اس سے پوچھا۔

''ارے کوئی نہیں، بات یہ ہے کہ میں اس دکان پر جوس پینے آتا رہتا ہوں، اس دکان کا مالک میرا بہت اچھا دوست بھی ہے اور اس کے بھائی کا موبائل کا بزنس ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ مجھے اچھے سے دو تھری جی ٹیکنالوجی والے موبائل دینا جن میں ایک موبائل میرا اور ایک میری ماہم کا ہوگا۔ تو یہ بچہ اس کا ہی پوچھ رہا تھا۔ بس اتنی سی بات ہے۔'' اس نے جوس پی کر خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''واہ واہ، تو اس نے کیا کہا؟'' ماہم نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ قیمتی موبائل ملنے کا سن کر اس کی آنکھیں بھی چمک اٹھی تھیں۔

''بس جیسے ہی کوئی اچھے موبائل آئے پھر تم اور میں اور راتوں کو ہوں گی لمبی باتیں۔'' ارحام نے موبائل کے نام پر بنت آدم کو ٹریپ کرتے ہوئے کہا اور وہ بے چاری موبائل کے لالچ میں 'نہ' بھی نہ کر سکی۔

''اچھا میں جوس کے پیسے دے کر آتا ہوں۔''
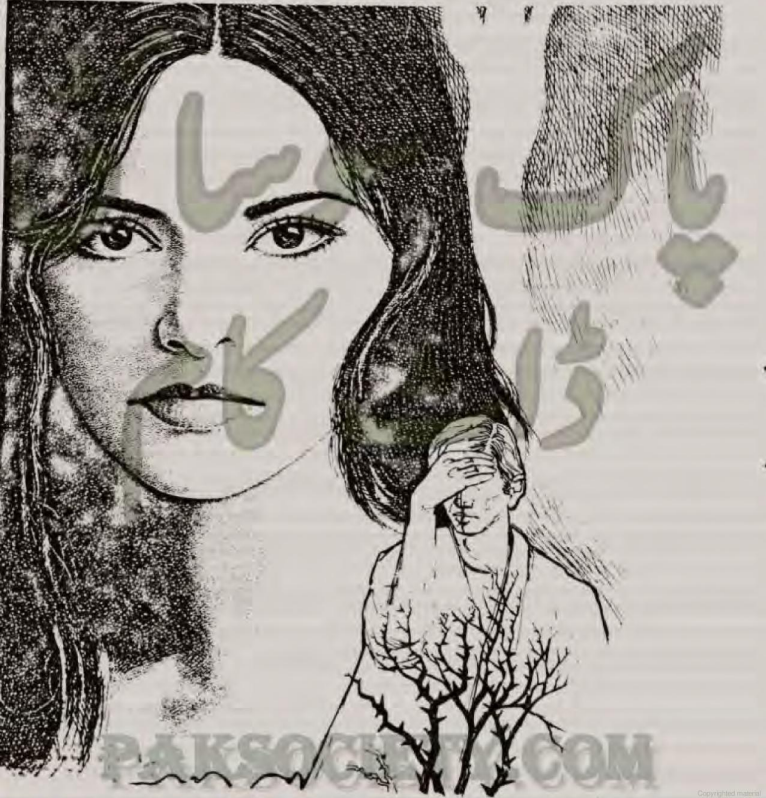
ارحام نے اٹھتے ہوئے کہا۔
''اور وہ تین سموسے بھی پیک کرواتے آنا۔'' ماہم نے یاددہانی کروائی۔
''اوئے چھوٹو ادھر آنا، اندر کیا اول فول بک رہا تھا۔'' ارحام نے باہر آ کر بوڑھے دکان مالک سے شکایت لگائی۔
''کیا کہا؟'' دکان مالک نے پوچھا۔
''اس نے پوچھا کہ صاحب تھری جی والے ہوگئے ہو۔ اگر اس سے جلدی میں منہ سے یہ نکل جاتا کہ صاحب تھری گرل فرینڈ والے ہوگئے ہو تو میرا کیا ہوتا۔ چلو یہ تو ہمارا کوڈ ہے کہ تھری جی مگر اس کو وہاں کیا ضرورت تھی پوچھنے کی۔'' ارحام نے غصہ ور لہجے میں کہا۔
''اوئے چھوٹے انسان بنا کر، یہ ہمارے پرانے گاہک ہیں اور انہوں نے ون اور ٹو جی کی ابتداء یہی سے کی تھی۔'' مالک نے بچے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔
''اچھا کتنے پیسے ہوئے۔'' ارحام نے بات کو سمیٹتے ہوئے کہا۔
''جی سو روپے ہوئے۔'' مالک نے ارحام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
ارحام نے جیب سے پرس نکالا اور ایک نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
''یہ پانچ سو روپے رکھ لے، بقایا مت دینا۔ تین سموسے بھی ساتھ منگوا دے اور بات سُن، میں نے تیرے بارے میں کہا ہے کہ تیرا موبائل کا بزنس بھی ہے اور تُو نے مجھے دو اچھے موبائل دینے ہیں، ٹھیک ہے نا۔ یہ بات تُو اچھی طرح یاد رکھنا جو میں تجھ سے کہہ رہا ہوں۔
''اچھا یار ویسے کبھی ون جی ہمیں بھی بنا دے، تُو تو تھری جی بن چکا ہے۔'' دکان مالک نے ہنستے ہوئے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔
''ارے باؤ جی انسان بن، تیری عمر اللہ کرنے کی ہے ون جی کی نہیں۔ ویسے بھی یہ موج مستی کی عمر صرف نوجوانوں کی ہوتی ہے۔'' ارحام نے ہنستے ہوئے دکان مالک کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ماہم ارحام کے ساتھ کار میں بیٹھ کر خود کو ہواؤں میں اُڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ ''بس اس موڑ گاڑی روک دو، آگے میں چلی جاؤں گی۔'' اس نے ارحام سے کہا تو اس نے کار روک دی۔
''ایک بات پوچھوں۔'' ماہم نے ارحام سے پوچھا۔
''ہاں ہاں بولو، تم کیا کہنا چاہتی ہو۔''
''تمہاری زندگی میں میرے سوا کوئی اور لڑکی تو نہیں ہے۔'' ماہم نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔
''اوہ نو، ماہم تم ایسے سوچ بھی کیسے سکتی ہو۔ میری زندگی اور میرے دل میں صرف تم ہی ہو۔ تمہارے سوا کوئی نہیں ہے۔ جس دن کسی اور کی گنجائش بنی، میں خود ہی اس دن اپنے آپ کو مار ڈالوں گا۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' ارحام نے گلوگیر ہو کر کہا۔
''اوہ سوری ارحام، میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ میں تو بس ایسے ہی مذاق کر رہی تھی......''
ابھی وہ بات کر ہی رہی تھی کہ ارحام کے دوسرے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔
''اوہ بابا کی کال ہے، تم جلدی سے جاؤ کل یونیورسٹی میں ملتے ہیں اور ہاں سنو میں ناراض نہیں ہوں اللہ حافظ۔''
''ٹھیک ہے اللہ حافظ۔'' ماہم نے کار سے اُتر کر کار کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔
جیسے ہی ماہم نظروں سے دور ہوئی، اس نے کال بیک کی اور فون کانوں سے لگالیا۔
''ہیلو کیسی ہو زینی......سوری یار میں وعدے کے مطابق تمہیں جلدی فون نہیں کر سکا۔''
''کیوں کیا مسئلہ تھا؟'' دوسری طرف سے کہا گیا۔
''بس...... اصل میں ابو کی طبیعت خراب ہو گئی تھی، اُن کو اسپتال لے گیا تھا۔ ابھی فارغ ہوا ہوں۔''
''اوہ مائی گاڈ! اب انکل کی طبیعت کیسی ہے۔''
اس نے سارے جہاں کا درد اپنے لہجے میں سموتے ہوئے کہا۔
''اب کافی بہتر ہے مگر اب میں بہتر نہیں ہوں،

کیونکہ صبح سے کچھ نہیں کھایا اور شدید بھوک لگی ہوئی ہے۔ خیال تمہاری طرف ہے کیونکہ تم جانتی ہو کہ میری زندگی اور میرے دل میں صرف تم ہی ہو، تمہارے سوا کوئی نہیں ہے، جس دن کسی اور کی گنجائش بنی میں خود ہی اس دن اپنے آپ کو مار ڈالوں گا۔'' ارحام نے بہت ہی خوب صورتی سے ماہم والا ڈائیلاگ زینی کے ساتھ بولتے ہوئے کہا جو وہ ہر روز کئی لڑکیوں سے بولتا تھا۔

''جناب بھوک میں ڈائیلاگ بازی مت کرو، میرے پاس آجاؤ میں کھانا کھلاتی ہوں تمہیں۔'' پتا نہیں ہم اس حدیث پر عمل کیوں نہیں کرتے کہ جو جھوٹ بولتا ہے اس کی بدبو سے فرشتہ ایک میل دور چلا جاتا ہے۔

☆......☆......☆

''دیکھو پلیز، اس حوالے سے تم مجھ سے بات مت کرو۔'' وہ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

''افہام پلیز! تم بات کو کیوں نہیں سمجھتے۔ ایک ٹیکنالوجی کتنی اچھی ہوئی ہے اور تم لوگ اس کا نام تھری جی سے تھری گرل فرینڈ بنالیتے ہو اور فور جی سے فور گرل فرینڈ۔ ارے تم بھی ایک بہن کے بھائی ہو اور خود یہ گھٹیا کام کرتے ہو۔''

''مولوی! میری بہن کا نام مت لو سمجھے تم۔'' افہام نے غصے سے کہا۔

''اچھا...... واہ اتنا غصہ، کاش یہ اچھے کاموں پر آتا، لیکن بہر حال وقت ہے سدھر جاؤ۔'' یہ کہہ کر دوسری طرف سے کال کاٹ دی گئی۔

''توبہ...... مولوی بھی کھاتا ہے۔'' اس نے موبائل کو پرے پھینکتے ہوئے کہا۔

افہام کسی حیاء مشرق کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا کہ اچانک ارسل عرف مولوی کی کال آگئی تھی جس نے اس کے موڈ کو خاصا بگاڑ دیا تھا، اب وہ بڑبڑا رہا تھا کہ اچانک بیل ڈور بجی تو افہام چونک اٹھا۔

''اس ٹائم کون آیا ہوگا امی یا ابو؟'' وہ سوچتا ہوا گیٹ کی جانب بڑھا۔ گیٹ کھولا تو وہاں اس کی بہن ماہم کھڑی تھی۔ جس کے ہاتھ میں کتابیں اور سموسے والا شاپر تھا۔

''تم کہاں تھی؟'' افہام نے غصے سے پوچھا۔

''میرے ہاتھ میں کتابیں دیکھ کر تمہیں کیا لگتا ہے؟'' ماہم نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

''میرا مطلب ہے اتنی دیر کیوں لگادی۔'' ارسل نے لہجہ نرم رکھتے ہوئے کہا۔

''پہلے یہ سموسے پکڑو، مجھے جب چھٹی ہوئی تو اپنی سہیلی ایشل کے گھر چلی گئی۔ میں نے نوٹس بنانے تھے مگر پہلے تمہارا نمبر ملایا کہ تم مجھے لے جاؤ، وہ بھی پورے آدھے گھنٹے تک ٹرائی کرتی رہی مگر پتا نہیں جناب کا نمبر کہاں مصروف تھا، آنے دو بابا کو بتاتی ہوں میں اُن کو تمہارا۔'' ماہم اُلٹا بھائی پر چڑھ دوڑی تھی۔

''او کے بابا...... سوری اور ابو کو کچھ مت بتانا۔'' افہام نے نرم لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے تم سموسوں کو انجوائے کرو۔'' یہ کہہ کر ماہم اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ مزید کوئی بات کسی نے ایک دوسرے سے نہ کی، کیونکہ دونوں کے دل میں چور تھا، اس لیے دونوں ہی خاموش ہوگئے تھے۔

☆......☆......☆

زینی، اطہر، بطال، افہام اور اس کا کزن ارسل، جس کو سب کو اس کی شرافت اور نمازی عادی کی وجہ سے مولوی کہتے تھے۔ یہ سب ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ افہام، اطہر اور بطال ان تین دوستوں کو یونیورسٹی میں تھری جی اور فور جی کی تعداد یعنی تھری گرل فرینڈ بڑھانے کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔ سونے پر سہاگہ بات یہ تھی کہ افہام اور اس کے دوستوں نے جو کام یونیورسٹی میں کیا ہوا تھا، اسی ڈر کے پیش نظر وہ اپنی بہن ماہم کو اپنی یونیورسٹی میں داخل نہیں کروانا چاہتا تھا، مگر بہن کی ضد کے آگے ہارنا پڑا تو اس نے ماہم کا داخلہ بھی دوسری یونیورسٹی میں کروادیا تھا مگر یہ بھول گیا تھا یہ اگر شکاری ہم ہیں تو شکاری وہاں بھی اور جو فصل بوئی جاتی ہے۔ وہی کاٹی جاتی ہے اور اب واقعی ایسا ہی تھا۔ وہاں وہ اچھے تھری جی ٹیکنالوجی موبائل کے چکر میں ایک ارحام نامی شکاری کے ہاتھوں شکار ہو چکی تھی، یعنی ارحام، ماہم کو اپنے دام میں بھرپور

طریقے سے شکار کر چکا تھا۔ اس پر بھی مزے کی بات یہ تھی کہ زینی جہاں ارحام سے بات کرتی تھی، وہاں وہ انہام سے بھی کرتی تھی، مطلب یہ کہ یہ لڑکیاں بھی کسی سے کم نہیں تھیں۔ انہوں نے بھی دو، دو فرینڈ بنا رکھے تھے۔ گویا یہ بھی ٹو جی کھیل رہی تھیں۔

☆......☆......☆

نیفگا موبائل کمپنی کا آفس شاہانہ انداز سے سجا ہوا تھا۔ یہ ایک غیر ملکی موبائل کمپنی تھی۔ اس کا مالک راون اپنی جہازی سائز کرسی پر براجمان ایک فائل کے مطالعے میں مصروف تھا کہ اچانک اس کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے موبائل کو دیکھا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی کیونکہ فون اس کے اسسٹنٹ رابرٹ کا تھا۔

''ہیلو! مائی بوائے کیسے ہو اور کب پہنچے۔'' راون نے موبائل کانوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''سر آئی ایم فائن، میں ابھی ایئر پورٹ پر اُترا ہوں اور وعدے کے مطابق سب سے پہلے آپ کو کال کی ہے۔'' دوسری طرف سے رابرٹ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''گڈ مائی بوائے، مجھے یہی تمہاری عادت اچھی لگتی ہے بلکہ دنیا میں وہی لوگ کام یاب ہوتے ہیں جنہوں نے اصولوں کو اپنایا ہے۔ اچھا اب تو بتا دو کہ کس ملک کی سیر کر کے آ رہے ہو۔''

''اوہ نو باس! میں نے کہا تھا کہ میں واپس آؤں گا اور آپ میرے گھر آئیں گے۔ کافی پئیں گے، پھر میں راز افشاں کروں گا کہ میں کس ملک کی سیر کرنے گیا تھا۔'' رابرٹ نے کہا۔

''ٹھیک ہے بوائے پھر شام کو ملتے ہیں۔'' یہ کہہ کر فون کٹ کر دیا۔

شام کو وہ رابرٹ کے گھر موجود تھا۔

''ہیلو کیسے ہو رابرٹ۔'' راون نے آتے ہی کہا۔

''سر میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ ہماری کمپنی کیسی رہی۔'' رابرٹ مسکراتے ہوئے کہا۔

''باقی سب ٹھیک رہا، بس کمپنی کو تمہاری کمی رہی۔'' راون نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''او کے سر...... اب میں آ گیا ہوں تو اب کمی نہیں ہونے دوں گا۔'' رابرٹ نے بھی جواب دیتے ہوئے کہا۔

''او کے، مگر باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ مجھے اشتیاق ہے کہ تم دس دن کہاں غائب رہے، کس ملک گئے تھے اس کے متعلق بتاؤ۔'' باس راون نے کہا۔

''سر اگر میں نے سچ کہا تو آپ بالکل حیرت زدہ ہو جاؤ گے اور یقین نہیں کرو گے کہ میں زندہ سلامت کیسے واپس آ گیا ہوں۔''

''اوہ، اچھا! کیا تم پاکستان گئے تھے؟'' راون نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''جی سر، میں پاکستان گیا تھا۔'' رابرٹ نے جواب دیا۔ کمرے میں ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔

''کیا پاکستان؟ کیا کرنے گئے تھے تم وہاں، مگر تم زندہ اور صحیح سلامت کیسے واپس آ گئے ہو وہاں سے۔'' اس نے انتہائی حیرت سے کہا۔

''سر اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ پاکستان میں حالات تو خراب ہیں مگر اتنے بھی نہیں کہ جس قدر چرچا کیا جا رہا ہے۔ اصل میں یہ سب کچھ پاکستان کو عالمی طور پر تنہا کرنے کی سازش کے طور پر کیا جا رہا ہے۔ اس بات کا اندازہ میں نے خود وہاں رہ کر اپنی آنکھوں سے لگایا ہے۔ پاکستان میں غیر ملکی ایجنسیاں خاص طور پر بھارتی خفیہ ایجنسی 'را'، امریکی خفیہ ایجنسی 'سی آئی سی' اسرائیلی خفیہ ایجنسی 'موساد' اور ان کا خفیہ ایجنسی 'خاد' نے ایک اتحاد بنایا ہوا ہے۔ امریکہ اور اسرائیل نے بھارت کی پشت پناہی کرتے ہوئے 'را' کو پاکستان کے ذریعے معاشی، سیاسی و سماجی اور معاشرتی طور پر غیر مستحکم کرنے کی ذمے داری دے رکھی ہے اور پاکستان میں امن و سلامتی کے عدم استحکام کے لیے اربوں ڈالر بطور امداد بھی دی جاتی ہے۔

رابرٹ نے بڑی تفصیل سے اپنے باس کو آگاہی دی۔ اس نے بتایا کہ امریکی صدر اوباما کا تین ماہ کے درمیان دو مرتبہ بھارت کا دورہ بھی اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ آخر ایک سپر پاور ملک کے سربراہ کو ایک

پس ماندہ ملک کا دو بار دورہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور پھر بھارت کو عالمی ایٹمی توانائی گروپ میں حیثیت دینا کس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اصل میں امریکا بھارت کو ایشیا کا ٹھیکہ دار بنا کر پاکستان، چین، افغانستان اور ایران کو اپنا محتاج بنانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان اور افغانستان میں 'سی آئی اے' اور 'را' دہشت گردی، ٹارگٹ کلنگ اور بم دھماکوں کے ذریعے ملک کو عدم استحکام کی جانب لے جا رہی ہیں۔

''مگر تم وہاں کس لیے گئے تھے؟'' ان کی بے چینی ابھی تک برقرار تھی۔

''سر! جیسا کہ آپ جانتے تھے کہ میں موبائل انجینئر کے ساتھ ساتھ ایک اخبار کے لیے اپنی مرضی کے طور پر فری لانس کام کرتا ہوں اور گاہے بگاہے کسی نہ کسی ملک جاتا رہتا ہوں۔ جب میں نے مشاہدہ کیا تو ایک بات میری سمجھ میں آئی کہ ناانصافی صرف مسلم ممالک پر ہو رہی ہے، پھر اسی اثناء کے دوران میں ان کے مذہب اسلام کی جانب متوجہ ہوا، وہ بھی صرف مطالعے کی حد تک، پھر میں آپ کی طرف آ گیا اور میرا تھوڑا بہت صحافت کا کام بھی جاری رہا۔ اب میں نے ایک دوست کی وساطت سے پاکستان سفر کیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو ہمارے خیالات کچھ حد تک غلط نکلے۔ وہاں اتنے حالات خراب نہیں ہیں۔ لوگوں نے میرے ساتھ انتہائی محبت کا برتاؤ کیا۔ مجھے اپنے گھر کھانے کی دعوتیں دی، وہ اپنے ستر سالہ بزرگ کے ساتھ احترام کرتے ہیں اور کئی تہمیں بھی کرتے۔ میں چونکہ مذہب اسلام کا مسلسل مطالعہ کر رہا تھا اور مسلسل مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ دنیا کا اسلام ہی سچا دین ہے۔ جہاں انسان انسانیت اور انسان سے محبت سکھائی جاتی ہے حتیٰ کہ جانوروں کے حقوق بھی بتائے جاتے ہیں۔''

رابرٹ سانس لینے کے لیے رُکا تو اس نے ان کے چہرے پر انتہائی حیرت دیکھی۔

''کیا کہہ رہے ہو تم رابرٹ کہ اسلام سچا دین ہے، یہ کیا مذاق ہے۔'' راون نے کہا۔

''سر، ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اسلام کسی سے کوئی فرق نہیں کرتا۔ اسلام کہتا ہے کہ کسی کو کسی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں پھر اس بات کا عملی نمونہ دیکھیں کہ مسلمان سعودی عرب میں اپنے فریضہ حج کے موقع پر کرتے ہیں۔ کوئی کسی ممالک سے آیا ہوا ہوتا ہے تو کسی کسی ملک سے، سب کی زبان، رنگ و نسل سے بالاتر ہو کر ایک اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ وہاں صرف اسلام ہی نظر آتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی کتاب قرآن کی سورۃ توبہ آیت 33 میں ہے کہ ''وہ اللہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو ہر دین پر غالب کرے خواہ یہ بات مشرکوں کو ناگوار گزرے۔'' اور سورۃ آل عمران آیت 58 میں ہے کہ ''جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا تو اللہ کے ہاں یہ دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور آخر میں ناکام رہے گا۔'' سورۃ آل عمران میں ہے کہ ''بلاشبہ اللہ کے نزدیک صرف سچا دین اسلام ہی ہے۔'' وہ تھوڑی دیر کے لیے سانس لینے کے لیے خاموش ہوا تو راون نے فوراً پوچھتے ہوئے کہا کہ

''پھر یہ عیسیٰ (علیہ اسلام) کی کیا کہانی ہے۔''

''سر اس کے متعلق بھی میں آپ کو بتایا ہوں کہ حضرت عیسیٰ بھی اللہ کے نیک پیغمبر تھے، اب وہ قرب قیامت میں پھر دنیا میں آئیں گے اور اسلام کی تعلیمات کا پرچار کریں گے۔ گویا گزشتہ تمام دینوں کا سردار اسلام ہے اور یہ آخری دین ہے اور سب نے اس کی پیروی کرنی ہے۔'' رابرٹ نے تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔

''اچھا! اب تم سے پرسنل سوال ہے سچ بتانا۔'' راون نے رابرٹ کو سنجیدگی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جی سر پوچھیے۔'' رابرٹ نے تحمل بھرے لہجے میں باس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم نے اسلام کا اتنا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور مجھے تبلیغ کی ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم اسلام قبول کر چکے ہو، کیا یہ سچ ہے؟'' باس راون نے پوچھتے ہوئے کہا۔

''جی سر میں اسلام قبول کر چکا ہوں اور میرا اسلامی نام بلال ہے۔'' رابرٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو تم میری کمپنی چھوڑنا چاہتے ہو اور تم یہ چاہتے ہو کہ میں بھی اسلام قبول کر لوں۔''

''نہیں سر! میں آپ کی نوکری نہیں چھوڑنا چاہتا اور نہ ہی میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ ابھی ابھی اسلام قبول کر لیں، کیونکہ اسلام میں کسی قسم کی کوئی زبردستی نہیں ہے۔ یہ امن و شانتی کا دین ہے۔ یہ تلوار سے نہیں بلکہ اخلاق سے پھیلا، لٹھ بندوق لے کر اسلام کو زبردستی کسی پر مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ آپ اسلام کا سکون سے مطالعہ کریں، قرآن کا ترجمہ پڑھیں اور پھر جو دل چاہے کریں۔'' رابرٹ نے بڑی باریک بینی سے باس کو فہمیدہ انداز سے سمجھایا۔

''ٹھیک ہے رابرٹ، اگر تم کہتے ہو کہ تم مسلمان ہو کر مجھ سے افضل ہو گئے ہو اور نوکری چھوڑنا چاہتے ہو تو میں اسلام کا مطالعہ نہ کرتا لیکن تمہاری ان باتوں نے میرا تھوڑا بہت دل جیتا ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ اسلام کا مطالعہ کر سکوں تم مجھے اس کے متعلق کتابیں لا کر دو۔'' بات سے آمادگی کا اظہار اور اسلام کے مطالعہ میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''جی سر، ضرور میں لا دوں گا۔'' رابرٹ نے سر ہلا کر ہامی بھری۔

''اچھا ایک بات یاد آ گئی ہے کہ تمہارے جانے کے بعد یہاں ایک جاسوسی کمپنی نے مجھ سے آڈیو ویڈیو چپ بنوائی تھی، مطلب ایک جاسوسی ٹریکر۔ اگر اس چپ کو کسی موبائل میں لگا دیا جائے، جس کی رینج اتنی ہو کہ ہم ایک ملک میں ہوں یا کسی دوسرے ملک میں، تو ان کی آواز اور تصویر صاف سنائی دے جیسے کہ تھری جی ٹیکنالوجی، مگر تھری جی ٹیکنالوجی میں خود کال ملائی جاتی ہے اور اس میں موبائل صارف کو پتا بھی نہیں ہوگا کہ اس کے موبائل میں چپ لگی ہوئی ہے۔''

''سر یہ ایک گناہ ہے، کسی کی پرائیویٹ نجی معاملات میں جھانکنا ہوا میں آپ کی بات سمجھ نہیں پا رہا۔'' رابرٹ (بلال) نے تھوڑا اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ارے یار تم سنو تو سہی، تم تو تھے نہیں، اس لیے میں نے دوسرے انجینئر کو بلا کر اس طرح کی چپ بنوا کر تھری جی ٹیکنالوجی کے حامل چند موبائلز میں فٹ کروا دی ہے، اب وہ موبائلز جس ملک میں جائیں گے اور جیسے ہی صارف خرید کر موبائل کو آن کرے گا تو وہ چپ خود بخود کام شروع کر دے گی اور ہمیں ہماری کارکردگی کا پتا چل جائے گا۔'' راون نے کہا۔

''اوہ، نو سر یہ مناسب نہیں ہے۔ مسلمانوں کی کتاب قرآن میں ہے کہ ''جاسوسی میں نہ پڑو۔'' سر اس لیے ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

''رابرٹ اب بس! بات ختم کل سے آفس آ جانا۔'' راون نے اکتائے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

ارسل (جس کو سب مولوی کہہ کر بلاتے تھے) نے اپنی کتاب ایک طرف رکھی، مغرب کی نماز میں تھوڑا ٹائم باقی تھا، اس نے سوچا کہ ابھی سے ہی نکلا جائے، تھوڑی بہت واک بھی ہو جائے گی۔ وہ ابھی کمرے سے باہر نکلا ہی تھا کہ ساتھ پلاٹ میں اُسی کے کلاس فیلو اطہر، بطال اور اس کا کزن افہام نظر آئے اور ساتھ ہی دوسرے کئی اسٹوڈنٹس بھی تھے جو کہ خوش اور پُرجوش نظر آ رہے تھے۔ ارسل کے لیے یہ سارا منظر حیران کن تھا کہ نہ جانے کون سا واقعہ ہوا ہے جو یہاں رونق مچی ہوئی ہے۔ اس نے مجبوری سے اپنے کزن افہام سے پوچھنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ اس کی افہام سے بنتی نہیں تھی۔

''خیریت ہے افہام، یہ ماجرا ہے یہاں؟'' اس نے قریب جا کر تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ارے تمہیں نہیں پتا، پاکستان میں تھری جی ٹیکنالوجی لانچ ہوئی ہے، اس لیے سب اس بات پر خوشیاں منا رہے ہیں۔'' اس نے پُرجوش لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

''اوہ، تھری جی فوبیا، اب نہ جانے کیا حال کرتی ہے ہماری قوم اس ٹیکنالوجی کا۔'' ارسل نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ارے آؤ ارسل! آج ہمارے پاس بھی بیٹھ جاؤ، اچانک اطہر نے اس سے کہا۔ (ان میں اطہر ہی

تھا جو تھوڑا سلجھا ہوا تھا مگر ان سب کے ساتھ بیٹھ کر بگڑ چکا تھا اور ارسل کو مولوی کے نام سے نہیں پکارتا تھا)
''ارے یار ارسل! آج ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ۔''
افہام نے بالآخر کہہ ڈالا تو اس کو مجبوراً بیٹھنا پڑا۔
''یار یہ تھری جی ٹیکنالوجی کس کام کی ہے، اس کے فوائد کیا ہے؟'' ارسل نے بیٹھتے ہی سب سے سوال کیا۔
''یار اس کے بہت فوائد ہیں، آپ اس سے تیز اسپیڈ کے ساتھ میوزک سُن سکتے ہیں۔ فلمیں ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں، گیمز کھیل سکتے ہیں۔'' ان میں سے ایک دوست بطال نے جواب دیتے ہوئے کہا۔
''یار پلیز میں نے اس کے فوائد پوچھے ہیں۔'' ارسل نے کہا۔
''اوہ اچھا مولوی صاحب، میں تمہیں اس کے فوائد بتاتا ہوں۔ پہلے جس کام کے لیے ہمیں بہت محنت کرنا پڑتی تھی اب اتنی محنت نہیں کرنا پڑے گی کیونکہ وہ لائیو کال کے ذریعے گھر ہی ہو جائے گا۔'' افہام نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بطال سے پوچھا۔
''ہاں باس، اچھا اُس نے کہا تاکہ تم مجھے موبائل دینا میں میں تمہارے ساتھ لائیو بات کروں گی......'' اس نے آگے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔
''ارے یار شرماتا کیوں ہے مولوی اپنا ہی بندہ ہے، میری کسی کے ساتھ بات ہو چکی ہے اس نے کہا ہے کہ اگر تم مجھے تھری جی ٹیکنالوجی والا موبائل دو گے تو میں تمہارے ساتھ لائیو کال کے ساتھ لائیو ڈانس بھی کروں گی۔'' افہام نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ (مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کی اپنی بہن ماہم کسی ارحام نامی لڑکے سے موبائل لینے کے بعد شاید یہ وعدہ کر چکی ہے)
''اف توبہ، تمہاری یہ سوچ۔'' ارسل شرمندگی سے سوچتا ہوا بولا۔
''کاش تم اس ٹیکنالوجی سے قرآن پاک، اچھے اچھے اصلاحی بیانات ڈاؤن لوڈ کرو، سبق آموز ناولز، ڈاؤن لوڈ کرے اور پھر اپنے معاشرے کے اندر تبدیلی لاتے مگر ہم ستیاناس کر دیتے ہیں ہر چیز کا۔'' یہ سنتے ہی وہ اُلٹا اس کا مذاق اڑانے لگے تو ارسل ان سب کے لیے ہدایت کی دعا کر کے اُٹھ گیا۔

☆......☆......☆

آج ماہم کے تو خوشی سے پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹک رہے تھے کیونکہ جو وعدہ ارحام نے ماہم سے ڈرنک کارنر پر کیا تھا، یعنی تھری جی ٹیکنالوجی سپورٹ موبائل دینے کا، وہ اُسے آج مل گیا تھا اور وہ آج خوش تھی، بہت ہی خوش تھی مگر اس بات سے بے خبر کہ شاید اس کو نہ جانے اس کے بدلے میں کیا کچھ لٹوانا پڑے گا۔
جب وہ موبائل لے کر گھر پہنچی تو بالکل ایسا ہی موبائل اس نے اپنے بھائی افہام کے ہاتھوں میں دیکھا تو اس کے ذہن میں آئیڈیا آیا کہ کیوں نہ میں یہ موبائل افہام سے مانگوں اور اگر یہ نہ دے گا تو میں اپنا لینے کی ضد کروں گی اور پھر ضرورت پڑی تو ارحام والا موبائل ظاہر کر دوں گی، پھر وہی ہوا جس طرح وہ جو چاہتی تھی۔ اسے بھائی نے وہ موبائل دینے سے انکار کر دیا تو اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس نے کہا کہ مجھے بھی موبائل چاہیے تو اس کی یہ ضد مان لی گئی۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ کسی نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ جب ایک لڑکی کے پاس پہلے سے موبائل ہے دوسرے موبائل کی کیا ضرورت ہے۔ کیا اس نے بزنس ڈیلنگ کرنی ہوتی ہے۔ وہ کوئی کاروبار کرتی ہے جو اس کے بغیر اس کا کام نہیں چل رہا۔

☆......☆......☆

ایک ماہ ہو چکا تھا رابرٹ (بلال) کو اس کے پاس راون نے کوئی جواب نہیں دیا تھا تو ایک دن اس نے سوچا کہ کیوں نہ خود ہی ان سے بات کی جائے تاکہ کسی بات کا پتا تو چل سکے، پھر اس نے خود ہی بات کرنے کا فیصلہ کیا۔
''سر کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔'' ایک دن رابرٹ نے اپنے باس کا دروازہ بجاتے ہوئے کہا۔
''ہاں کیوں نہیں، آ جاؤ۔'' راون نے کہا۔
''شکریہ سر۔'' اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''کہو کیسے آنا ہوا؟'' راون نے لیپ ٹاپ سے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔
''سر میں نے آپ کو اسلام کے بارے میں

کتابیں دی تھیں اور اب بھی میری کوئی زبردستی نہیں ہے لیکن میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے مطالعے سے کیا حاصل کیا۔''

''اوہ ہاں، میں نے رابرٹ واقعی ان کتابوں کا مطالعہ کیا تھا اور اس کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ واقعی اسلام امن وسکون کا دین ہے، مساوات و برابری کا درس دیتا ہے۔ اسلام ہی سچا دین ہے، مگر اس کے بعد پتا ہے کیا ہوا۔''

''کیا ہوا سر، کیا آپ اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں۔'' بلال نے خوشی سے کہا۔

''اوہ نہیں مسٹر، تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تم کو ایک دفعہ کہا تھا کہ میں نے ایک ویڈیو چپ بنوا کر چند موبائلز میں فٹ کروادی ہیں اور وہ موبائلز جس ملک میں جائیں گے جیسے ہی صارف موبائل آن کریں گے، وہ چپ خود بخود آن ہو جائے گی اور ان سے ہمیں ہماری اس چپ کی کارکردگی کا پتا چل سکے گا، یاد ہے کہا تھا نا؟'' راون نے سمجھاتے ہوئے استفہامیہ انداز میں رابرٹ سے کہا۔

''ہاں سر، یاد تو ہے کہ آپ نے کہا تھا، مگر اب اس بات کا کیا تعلق اس سے۔''

''پہلے نہیں تھا مگر اب بہت گہرا تعلق بن گیا ہے، غور سے سنو، وہ موبائل پتا ہے کس ملک میں گئے، پاکستان میں۔ ہم نے تین موبائلوں میں چپ لگوائی تھی اور وہ تینوں پاکستان گئے۔

ان دنوں نئی نئی تھری جی ٹیکنالوجی پاکستان میں لانچ ہوئی تھی۔ وہاں ان موبائلوں کو خریدا گیا۔ میں نے لیپ ٹاپ آن کیا تو مجھے کاشن ملا کہ یہ موبائل خریدے جا چکے ہیں۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ کس نے اور کیوں خریدا ہے۔ بس مجھے تو اپنی چپ کی کارکردگی دیکھنی تھی۔ دن کو وہ موبائل تھوڑی دیر کے لیے چلے، پھر رات دوبارہ آن ہوئے، تو چونکہ مجھے اردو زبان آتی نہیں تھی اور میں نے تم اس لیے تمہیں نہیں بلایا، کیوں کہ تم اس کو گناہ سمجھتے ہو اس لیے میں نے اپنی کمپنی کے ایک ورکر جو کہ اردو جانتا تھا، اس کو بلایا تو جو کچھ ہم نے دیکھا اور میرے ورکر نے مجھے بتایا۔'' وہ میرے لیے بہت حیران کن تھا۔ میرے دو موبائل ایک ہی گھر میں استعمال ہو رہے تھے۔ ایک موبائل لڑکا استعمال کر رہا تھا، اس کا نام افہام تھا۔ اس کے دوسری طرف کا موبائل ہماری کمپنی کا نہیں تھا مگر ہماری چپ کام کر رہی تھی۔ یہ پہلے تو باتیں کرتا رہا پھر اس نے لائیو ڈانس کی فرمائش کی جو فوراً پوری ہوئی۔ اب اسی گھر میں یہ شاید اس لڑکے کی بہن تھی، اس کا نام ماہم تھا، یہ کسی ارحام نامی لڑکے کے ساتھ معروف تھی۔ اب اس طرح دونوں موبائل ہماری کمپنی کے تھے تو ان کا بھی وہی حال، پہلے تو باتیں کرتا رہا پھر اس نے لائیو ڈانس کی فرمائش کی جو فوراً پوری ہوگئی۔

''تو بلال صاحب آپ یہ ویڈیو دیکھنا چاہو گے۔'' راون نے بلال سے کہا۔ لیکن دوسری طرف بلال کا چہرہ برس کی طرف سفید ہو چکا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''ارے کیا ہوا بلال صاحب۔'' راون نے بنا کسی جذبات کے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں سر، میں آپ کا فیصلہ سننا چاہتا ہوں۔'' بلال نے اپنے آنسو کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ میرا فیصلہ...... ویسے تمہارے نزدیک اب مجھے کیا فیصلہ کرنا چاہیے اور تم خود سوچو کہ اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے تم۔ اور تمہارا فیصلہ کیا ہوتا، اتنا کچھ دیکھنے کے بعد کیا تم اپنا فیصلہ یا مذہب بدل دیتے یا نہیں۔'' راون نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

بلال کے دل پر ایک خنجر سا چلا تھا، اس کو اپنا جواب مل چکا تھا اور ''ٹھیک ہے سر، کل ملتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اُٹھ کر باہر چلا آیا۔ اس کے نومسلم ذہن میں کئی سوال اُٹھ رہے تھے کہ کاش یہ ٹیکنالوجی ایجاد نہ ہوئی ہوتی۔ کاش یہ ہوا ہوتا وہ اس بے دھیانی کے عالم میں آنسو بہاتے ہوئے غلط روڈ کراس کر رہا تھا تو پیچھے سے آنے والے ایک ٹرالر نے اُسے کچل دیا۔ جسم تو اس کا چھلنی راون کی باتوں سے ہو گیا تھا بس روح نکلنی باقی تھی، سو وہ ٹرالر نے کردی تھی۔ بلال کی کھلی آنکھیں یہ سوال کر رہی تھیں کہ راون کو مسلمان نہ کرنے میں قصور کس کا تھا؟''

☆☆......☆☆

ہم شکل

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور قلم کار، ایم اے راحت کے قلم کا جادو

سطر سطر تجسس سموئے، نئے سنسنی خیز سلسلے کی آٹھویں لڑی

خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشترکہ خاندان پر مبنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرد ہے۔ خاندان کی بزرگ دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ اُن کے قصوں اور ٹوٹکوں سے ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن قصوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے سات ''ہمشکل'' بنائے ہیں۔

ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی۔ ہسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برین ٹیومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نذر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دیئے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔

دلاور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلاور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کرلیتی ہے۔ دلاور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلاور شاہ زیب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر رُکتی ہے تو ایک مجمع اُسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو ''عالی'' کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ مجمع میں موجود ایک بزرگ اُسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے سات ہمشکل والی یعنی کہ ایک اور ''ہمشکل'' اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتا ہے۔

گھر پہنچنے کے بعد شاہ زیب کو معلوم پڑتا ہے کہ ''عالی'' جو اس گھر کا بیٹا ہے وہ شاہ زیب کا ہم شکل ہے اسٹیشن والی لڑکی جس کا نام نشاط ہے وہ عالی کی بیوی ہے عالی نشاط سے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب شاہ زیب کو عالی سمجھ کر سب گھر والے اور نشاط سمجھانے کی اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ زیب نے بڑی مشکل سے ان کو یہ بات باور کرائی کہ وہ عالی نہیں شاہ زیب ہے جس کی شکل عالی سے

مشابہ ہے۔ بہر کیف عالی کے خاندان والوں کو جب شاہ زیب کی حقیقت معلوم ہوئی تو وہ اس کے احسان مند ہو گئے اور شکریہ ادا کرتے اس سے اس کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ شاہ زیب نے بتایا کہ اس کی دادی ماں نے ایک بار کہا کہ ہر انسان کے سات ہمشکل ہوتے ہیں بس میرا دل چاہا کہ اپنی زندگی میں اپنے ہمشکلوں کو تلاش کروں اور یقین کریں کہ مجھے میرے دو ہمشکل مل گئے ایک دلاور اور آپ کا عالی اور تیسرا میں اور اب چوتھے ہمشکل کی تلاش ہے۔

عالی کے گھر والے اس کو خاصی رقم دے کر رخصت کرتے ہیں۔ شاہ زیب اپنے تیسرے ہم شکل عالی کے بعد وہاں سے نکل کر ایک فور اسٹار ہوٹل میں جاتا ہے۔ اب شاہ زیب کی زندگی میں سیزارو آجاتا ہے۔ وہ برطانیہ کے ایک خفیہ گینگ سے منسلک ہے۔ جس نے سیزارو کو ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ ابھی شاہ زیب سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُسے کوروتی ٹکرا جاتی ہے۔ کچھ بندے اُسے زبردستی اُس جگہ پہنچا دیتے ہیں جہاں پر ڈینیل نے کوروتی کو رکھا ہوا ہے۔

اب آگے ملاحظہ کیجیے

''کوروتی آپ بالکل خاموش ہیں، کیا آپ نے شمشیر سنگھ کو ساری صورت حال نہیں بتائی؟''

''کنور، میں تم سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی تم دغاباز، دھوکے باز اور کمینے انسان ہو۔''

''کوروتی! جو کچھ بھی کہہ لیں، میں سننے کو تیار ہوں، لیکن حقیقی بات یہ ہے کہ اگر میں جنم کنڈلی لے کر وہاں سے فرار نہ ہو جاتا تو مجھے اور آپ کو قتل کر دیا جاتا۔ ہم پرائے دیس میں تھے۔ میں ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، مجبوراً مجھے وہاں سے بھاگنا پڑا اور آپ یقین کریں کہ اس جنم کنڈلی ہی کی وجہ سے آپ بھی زندہ ہیں۔ اگر وہ جنم کنڈلی ان انگریزوں کے ہاتھ لگ جاتی تو آپ کی ضرورت انہیں باقی نہ رہتی، ایک طرح سے میں نے آپ سے برائی مول لے کر آپ کا جیون بچایا ہے۔''

''تم اتنے دغاباز ہو کہ میں تمہاری کسی بات کا یقین نہیں کر سکتی۔''

''آنے والا سمے آپ کو اس بات کا پورا پورا یقین دلا دے گا۔ ویسے رمیش سنہاجی میں آپ سے ایک بات کہوں، گرو داس بڑا ہی کینہ پرور انسان ہے، یہ جو کچھ کر رہا ہے اس کے بارے میں آپ یا کوروتی نہیں جانتے۔ اگر ہم اس کے قیدی رہے تو یوں سمجھ لیں کہ نہ تو ہم زندہ رہیں گے اور نہ کوروتی اپنا مقصد پا سکیں گی۔''

''تم مجھے ساری تفصیلات بتاؤ تو میں اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کروں۔''

''ایک ایک بات بتا دوں گا آپ کو، لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے ہم یہاں سے نکل جائیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کیا ہماری زندگی طویل ہے، میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اب چونکہ کوروتی اس کے ہاتھ لگ گئی ہیں اس لیے وہ ہم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''تم یہاں سے کیسے نکل بھاگے؟''

''میں نے ایک آدمی کو پھانس لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرے اس فرار کے سلسلے میں اس کا نام بھی نہیں آیا ہوگا، البتہ اب یہ لوگ مجھ سے پوچھیں گے کہ میں یہاں سے کیسے بھاگا، میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا اور کوشش کروں گا کہ دوبارہ اسے اپنے لیے تیار کر لوں، اس بار ہم ذرا مختلف انداز میں کام کریں گے۔ آپ سے ایک بات میں صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ آپ نے اگر میری بات نہ مانی اور یہاں رکے رہنے پر ضد کی تو نہ صرف اپنے دشمن بنیں گے بلکہ کوروتی کے بھی، اس لیے بہتر یہ ہے کہ آپ مجھ سے تعاون کریں اور یہاں سے فرار ہو جائیں۔''

شاہ زیب نے کوروتی کی طرف دیکھا، وہ سپاٹ نگاہوں سے سامنے دیکھ رہی تھی، گویا اس نے فیصلہ شاہ زیب پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ شمشیر سنگھ کی بات اس کی سمجھ میں تو نہیں آئی، لیکن ہو سکتا ہے جو کچھ کہہ رہا ہو سچ کہہ رہا ہوں، گرو داس اگر ان کی جان کا دشمن ہے تو پھر مسئلہ گڑبڑ ہو جائے گا، بہر طور شاہ زیب نے اس سلسلے میں کوروتی سے مشورہ کرنے کا فیصلہ

کرلیا اور کنور شمشیر سے کہا۔

''میں کوروتی کی مرضی کے بغیر کچھ کرنے کو تیار نہیں ہوں، تم وہ گوشہ اپنالو اور اس گوشے میں ہمیں رہنے دو، ہم لوگ آپس میں صلاح مشورہ کریں گے اور اس کے بعد فیصلہ کرسکیں گے۔''

''مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' کنور شمشیر نے جواب دیا اور شاہ زیب کوروتی کے ساتھ تہہ خانے کے دوسرے گوشے میں چلا گیا، کوروتی دیوار سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگئی، شاہ زیب اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا تھا جبکہ اصل کنور شمشیر سنگھ، کوروتی کی ہم شکل لڑکی شیری کے ساتھ دوسرے گوشے میں بیٹھا انہی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''کیا خیال ہے کیا کہتی ہو تم اس شرط کے بارے میں؟'' شاہ زیب نے کوروتی سے پوچھا۔

''میرا تو دماغ ماؤف ہوگیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟''

''اگر گروداس ہمیں قتل کرنا چاہتا ہے تو میرا خیال ہے کوروتی ہمارے پاس بچاؤ کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں کہ گروداس سے بات کر کے یہ کیسے پتا لگایا جائے کہ وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟''

''واقعی معاملہ بے حد الجھا ہوا ہے، بہرطور دیکھ لیتے ہیں، ابھی جلدی کیا ہے۔ جیسی بھی صورتِ حال ہوئی اس کے مطابق کریں گے۔''

شاہ زیب نے اس وقت کنور کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ بھی غالباً سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ کوروتی شاہ زیب کے قریب ہی دراز ہوگئی تھی، تھوڑی دیر بعد وہ بھی گہری نیند سوگئی، البتہ شاہ زیب جاگ رہا تھا اور دل ہی دل میں کئی باتیں سوچ رہا تھا، دادی اماں، اس کے بھائی بھابی، ہم شکل اور ان کے ساتھ ہونے والی ہنگامہ خیزیاں۔

☆☆

دوسری صبح یہ لوگ جاگے تو بدن بھوک سے نڈھال تھے۔ لیکن اس وقت ان کے ساتھ مہربانی کی گئی۔ صبح کا ناشتا بہت شاندار تھا۔ تمام کسر پوری کردی گئی تھی، چاروں ہی آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ کنور ناشتے کے بعد بولا۔

''میرا خیال ہے تم لوگوں نے کوئی نہ کوئی فیصلہ کرلیا ہوگا۔''

''کوروتی کا کہنا ہے کہ وہ تم پر بالکل بھروسا نہیں کرسکتیں۔''

''تو ٹھیک ہے ہمارا تو جو کچھ ہوگا لیکن میں ایک بات صاف کیے دے رہا ہوں، اب اگر میری ملاقات گروداس سے ہوئی تو میں صاف کہہ دوں گا کہ یہ کوروتی ہیں، شیری کی اصل شکل میں انہیں دکھادوں گا تو صورتِ حال واضح ہوجائے گی، تم مجھے اس سے نہیں روک سکتے۔''

شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا، ناشتے سے فارغ ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ بہت سے سپاہی اندر داخل ہوگئے اور انہوں نے ان چاروں سے چلنے کے لیے کہا، تھوڑی دیر کے بعد وہ چاروں پھر کل والے کمرے میں موجود تھے۔ گروداس انہیں دیکھ کر مسکرایا اور پھر کنور شمشیر سنگھ کی طرف رخ کر کے بولا۔

''کنور، یہ بات تو میری سمجھ میں آگئی ہے کہ اصل کنور شمشیر سنگھ تم ہو، لیکن ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرنا باقی ہے، ان میں سے اصل کوروتی کون ہے؟''

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ اصل کنور میں ہوں۔''

''بڑی معمولی بات ہے، تمہارے جسم پر زخموں کے نشانات ہیں جو ہمارے لگائے ہوئے ہیں اور اس آدمی کے بدن یا چہرے پر ایک بھی زخم نہیں ہے، اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے۔؟'' گروداس نے کہا اور کنور شمشیر سنگھ دانت پیس کر خاموش ہوگیا۔ تب گروداس نے کوروتی اور شیری کو اپنے سامنے بلایا اور پھر آہستہ سے بولا۔

''بہتر یہ ہے کہ تم لوگ مجھے خود ہی بتادو کہ اصل کوروتی کون ہے تاکہ میں کام کی بات کرسکوں''

کوروتی نے کہا ''اصل کوروتی میں ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی شیری بول پڑی۔

''نہیں یہ جھوٹ کہتی ہے اصل کوروتی میں ہوں''

کنور شمشیر کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی حالانکہ اس نے شاہ زیب کو دھمکی دی تھی کہ وہ اصل کوروتی کا حوالہ دے دے گا، لیکن اس وقت اس کی ساتھی شیری نے اس کی یہ بات غلط ثابت کر دی تھی۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ یہ بتاتی تھی کہ یہ تمام منصوبہ اسی کا ہے۔

''دیکھو تم دونوں سن لو کہ تم میں سے جو کوروتی ہے اس کی زندگی ممکن نہیں ہے اگر میں چاہوں تو تم دونوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بھوکے کتوں کے سامنے ڈال دوں۔ اگر یہ مجھے پتا چل جائے کہ تم میں سے اصل کون ہے تو ہو سکتا ہے کہ تم سے کام کی بات کر کے تمہاری زندگی بخش دوں۔ بہتر یہی ہے کہ تم دونوں آپس میں فیصلہ کر لو اور مجھے صورتِ حال سے آگاہ کر دو۔''

''میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ اصل کوروتی میں ہوں۔'' شیری نے کہا۔

''نہیں.. اصل کوروتی میں ہوں۔'' شیری کے بعد کوروتی نے کہا اور گروداس پریشان نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھنے لگا تھا۔

تھوڑی دیر تک گروداس ان دونوں کو دیکھتا رہا تھا، پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کسی قدر پُرسکون لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، تھوڑا سا انتظار کر لو، میں نے تو چاہا تھا کہ تم سے سودے بازی کر لی جائے اور تمہارا کام بھی بن جائے، لیکن تم دونوں موت کو گلے لگانے کے لیے تیار ہو تو پھر میرا کیا دوش، جاؤ انہیں لے جاؤ اور بند کر دو۔ شام کو ہم ان کا فیصلہ کر دیں گے۔''

اس کے بعد ان لوگوں کو دوبارہ اسی قید خانے میں پہنچا دیا گیا۔ ماحول میں گھٹن سی تھی، کوروتی نڈھال ہو کر شاہ زیب کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

''یہ تو واقعی زندگی کا عذاب ہو گیا۔ پتا نہیں تقدیر میں کیا لکھا ہے، گروداس سے ملاقات کے سلسلے میں یہ سوچا تھا کہ شاید اس کے قبضے میں جانے سے کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے، لیکن اس کی زبان کچھ اور ہی ہے، کیا ہم نے یہاں آ کر غلطی کی ہے شاہ زیب؟''

''سمجھ میں نہیں آتا کوروتی، اتنا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم یہاں پہنچے، خیال یہی تھا کہ گروداس نے کوروتی کے حصول کے لیے وشال سنگھ کو جتنی بڑی رقم کی پیشکش کی تھی اس کے بعد ہماری دستیابی اس کے لیے بڑی اہم ثابت ہو گی، لیکن یوں لگتا ہے کہ کنور شمشیر سنگھ نے یہاں آ کر سارا کھیل خراب کر دیا ہے، ویسے بھی یہ سوچنا ہے کہ شمشیر سنگھ اس لڑکی کو کوروتی بنا کر یہاں کیوں لایا ہے؟''

''وہ بہت گہرا آدمی ہے، میں خود اس سے دھوکہ کھا چکی ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ میری جنم کنڈلی لے کر فرار ہو گیا تھا اور اس کے بعد مجھے اس کا پتا نہیں چل سکا جبکہ اس سے پہلے نجانے اس نے مجھے کیسی کیسی باتیں کہی تھیں۔ بیچارہ ییزار و اور اس کی بہن سیسل بھی اسی چکر میں ماری گئی۔''

''خیر! پرانی باتیں دہرانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کیا کیا جائے''

''فی الحال تو ہم قیدی ہیں، گروداس سے اگر براہِ راست بات چیت کی جائے اور یہ تمام باتیں اس پر ظاہر کر دی جائیں تو اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ اس کا بھی کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ مجھے تو یوں لگتا ہے شاہ زیب، جیسے میں تمام زندگی ایسے ہی رہوں گی اور اپنے بارے میں کبھی نہیں جان سکوں گی۔ پتا نہیں دل میں کیسے کیسے خیالات آتے ہیں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ کہ....'' کوروتی جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ شاہ زیب بھی خیالات میں ڈوب گیا تھا۔

صبح ہو گئی اور پھر پورا دن گزر گیا۔ اس دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ ان کے لیے کھانا برابر آتا رہا۔ رات

ایک بار پھر گرو داس کی طرف سے بلاوا آیا، لیکن اس بار شاہ زیب اور کوروتی دونوں کو بلایا گیا تھا۔ یہ لوگ گرو داس کے پاس پہنچ گئے۔ وہ اس بار ایک نشست گاہ میں بیٹھا تھا اور اس کے چہرے پر شدید جھنجلاہٹ کے آثار تھے۔

''تم لوگوں نے آپس میں کوئی فیصلہ کرلیا ہوگا، میں کب تک تمہارا انتظار کروں۔ بالآخر مجبور ہو جاؤں گا تو تم سب کو قتل کردوں گا تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔''

کوروتی نے گرو داس کی طرف دیکھا اور بولی ''گرو داس، اگر تم یہ بتانا پسند کرو کہ تمہارا مقصد کیا ہے تو ہو سکتا ہے، ہم تمہاری مدد کریں۔''

''پہلے تم مجھے یہ یقین دلادو کہ تم اصل کوروتی ہو؟''

''ہاں... میں اصل کوروتی ہوں۔'' کوروتی نے غالباً اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرلیا تھا۔

''تمہارے یہ الفاظ کافی نہیں ہیں، اگر تم اصل کوروتی ہو تو وہ لڑکی کون ہے؟''

''یہ جاننا تمہارا کام ہے گرو داس، لیکن میں تم سے دوٹوک بات کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے بتاؤ میں کون ہوں؟ میرے ماتا پتا کون ہیں، میں نے بھرت چند کے ہاں پرورش کیوں پائی، مجھے یہاں سے اغوا کیوں کیا گیا، یہ ساری باتیں اگر تم مجھے بتا سکتے ہو تو بتادو۔ اس کے بدلے میں تم جو کچھ کہو گے میں تمہیں دینے کے لیے تیار ہوں۔''

گرو داس طنزیہ انداز میں ہنسنے لگا ''یہ تمام باتیں تو مجھ سے وہ لڑکی بھی کر چکی ہے جو کنور شمشیر کے ساتھ ہے، تم مجھ سے جنم کنڈلی کی بات کرو، تمہاری جنم کنڈلی کہاں ہے؟''

''وہ شمشیر سنگھ کے پاس ہے۔'' کوروتی نے جواب دیا اور گرو داس شاہ زیب کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''کیوں کنور، تم کیا کہتے ہو اس بارے میں؟''

''بھائی میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میرا نام کنور شمشیر سنگھ نہیں رمیش سنہا ہے اور میرا ان واقعات سے صرف اتنا ہی تعلق ہے کہ میں کوروتی کے باڈی گارڈ کی حیثیت رکھتا ہوں۔''

''تم سب فریب کر رہے ہو، لیکن میں تمہارے فریب کا پردہ چاک کردوں گا، آخری بار تم سے کہہ رہا ہوں کہ جنم کنڈلی میرے حوالے کردو اور ساتھ ہی اصل کوروتی بھی، ورنہ تم لوگوں کے حق میں بہتر نہیں ہوگا، میں نے تمہیں اس وقت اسی لیے تکلیف دی تھی میں چاہتا ہوں کہ میرے ہاتھوں تمہارے ساتھ کوئی سخت سلوک نہ ہو، لیکن شرط یہی ہے کہ تم اس سلسلے میں خود بھی مجھ سے تعاون کرو۔''

اس نے ایک بار پھر انہیں قید خانے میں بھیجنے کا حکم دے دیا۔ شمشیر سنگھ اور شیری بالکل مطمئن تھے۔ انہیں ذرا بھی تشویش نہیں تھی کہ ان دونوں کے گرو داس کے پاس جانے سے ان پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے۔ شاہ زیب نے اس بات کو خاص طور پر نوٹ کیا تھا، کنور شمشیر سنگھ نے مجھ سے ایک بھی سوال نہیں کیا، کوروتی کہنے لگی۔

''یہ بہت مطمئن معلوم ہوتا ہے، کیا خیال ہے، اس سلسلے میں ہمارے ہاتھوں میں تو کوئی بات نہیں رہی، غالباً اس نے کچھ اس طرح کی کاروائیاں کی ہیں کہ گرو داس بالکل بوکھلا کر رہ گیا ہے۔ میرے انکشافات بھی اس کے لیے حیرت انگیز نہیں تھے۔''

''میں تو سوچ رہا ہوں کہ اس وقت شمشیر سنگھ سے تعاون کیا جائے، گرو داس تو ذہنی طور پر بالکل دیوالیہ ہو چکا ہے۔ تمہاری مشکلوں کا حل اسی شخص کے پاس ہے۔''

''خود میرا بھی یہی خیال ہے۔'' کوروتی نے جواب دیا۔

''میں جانتا ہوں کہ گرو داس نے تم لوگوں سے کیا سوالات کیے ہوں گے اور تم نے اس کا بھی اندازہ لگالیا ہوگا کہ ہم سے الگ ہٹ کر بھی تم اسے اپنے آپ سے متاثر نہیں کرسکتے۔ بہتر یہ نہیں ہوگا کوروتی کہ آپ میرے ساتھ ہی تعاون کریں۔ اس کے باوجود میری طرف سے اجازت ہے کہ اگر آپ اپنے طور پر کچھ کرنا چاہیں تو کرسکتی ہیں، لیکن اگر مجھ سے تعاون کے بارے میں فیصلہ کرلیں تو پھر میرا ساتھ دیں۔''

''شمشیر سنگھ، جب تک تم مجھے جنم کنڈلی کے بارے میں نہیں بتاؤ گے میں تم سے کوئی تعاون نہیں کروں گی، تمہیں اندازہ ہے کہ تم نے میرے اعتماد کو دھوکہ دیا تھا۔''

''بہت سے اندازے آپ نے میرے بارے میں قائم کیے ہوں گے کوروتی اور بہت سے میں نے دوسروں کے بارے میں کیے تھے۔ بدقسمتی تو یہی ہے کہ جنم کنڈلی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ اگر وہ میرے پاس ہوتی تو شاید اس وقت تک میں اپنے مقاصد کی تکمیل کر چکا ہوتا۔ وہ ڈینئل مارکو کے آدمیوں نے اڑالی تھی۔''

''تم بکواس کرتے ہو، ڈینئل اتنا بیوقوف آدمی نہیں معلوم ہوتا کہ جنم کنڈلی کے حصول کے بعد بھی وہ کوئی کارروائی کرتا، اس نے مجھ سے یہی کہا ہے کہ جنم کنڈلی اس کے پاس نہیں ہے۔''

''بکواس کرتا ہے اس کا پلان کچھ اور ہوگا۔ بہر طور میں آپ کو کیسے اطمینان دلاؤں، یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔''

''تم نے شیری کو کوروتی کیوں بناڈالا؟''

''میں نہیں جانتا تھا کہ جنم کنڈلی گرو داس تک پہنچی ہے یا نہیں اور گرو داس کے پاس آنے کے لیے کوروتی کا سہارا ضروری تھا۔ یہاں آکر مجھے اس بات کا یقین ہوگیا کہ جنم کنڈلی اس کے پاس بھی نہیں ہے، اور وہ بھی اسی لیے بھٹک رہا ہے۔''

''تو پھر اب کیا کرنا ہے؟''

''فی الحال کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ آپ مجھ سے تعاون کریں تو میں آگے قدم بڑھادوں۔ میرے ساتھ تو یہ مشکل ہے کہ جب جنم کنڈلی میرے پاس تھی تو آپ نہیں تھیں اور اب آپ میرے پاس ہیں تو جنم کنڈلی نہیں ہے، تاہم میرے پاس کچھ ایسے ثبوت موجود ہیں جن کے ذریعے میں وہ کام کرسکتا ہوں جو آپ کے بس کی بات نہیں۔''

''اس کے لیے تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' کوروتی نے پوچھا۔

''تعاون... مکمل تعاون...''

''لیکن اس قید خانے میں تم سے تعاون کرنا بھی تو بے معنی ہے۔''

''میں نے کہا نا ہم انتظار کررہے ہیں۔ اگر آپ ہمارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوجائیں تو ہم لوگ ساتھ ہی یہاں سے نکل جائیں گے۔ اس بات پر آپ بھروسہ رکھیں کہ ہمارا بال بیکا بھی نہیں ہوگا۔ گرو داس کسی قیمت پر ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا کیونکہ اس میں خود اس کا بھی نقصان ہے۔ باقی رہا یہاں سے نکلنے کا مسئلہ تو میں مطمئن ہوں، وہ شخص آج نہیں تو کل میرے پاس آئے گا، جس نے مجھے پہلے فرار کرایا تھا۔''

کوروتی گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگی، شاہ زیب سے وہ پہلے ہی مشورہ کر چکی تھی اور اب اس سلسلے میں مزید کوئی بات نہیں رہ گئی تھی۔ چنانچہ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''ٹھیک ہے میں اپنے بارے میں جاننا چاہتی ہوں، اس سے زیادہ میری اور کوئی خواہش نہیں ہے کنور، اس لیے اگر تم اس بات کا وعدہ کرو کہ یہاں سے نکلنے کے بعد میرے تعاون سے تم اپنا مقصد حل کر کے مجھے میری منزل تک پہنچادو گے تو میں تمہارے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''یہ پیشکش تو میں نے پہلے ہی آپ کو کی تھی، اگر اس وقت آپ اس کے لیے تیار ہوجاتیں تو میرا خیال ہے درمیان کے لوگ ہمارے راستے نہیں کاٹ سکتے تھے، اس وقت آپ نے ایک بے مقصد ضد کی تھی۔''

''ٹھیک ہے، اس وقت کی بات اس وقت رہی، اب جو کچھ میں کہہ رہی ہوں اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''بالکل ٹھیک ہے، آپ اطمینان سے ہمارے ساتھ رہیں، میں جب ایک بات دعوے سے کہہ رہا ہوں تو آپ کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔''

اس کے بعد ان سب کے درمیان تعاون کا معاہدہ طے پا گیا اور سب یکجا ہو گئے۔ شیری عموماً خاموش رہتی تھی۔ کم گو لڑکی تھی، کسی قدر سنجیدہ بھی۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان تمام معاملات سے اکتائی ہوئی ہے، لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتی تھی۔

مزید دو دن گزر گئے۔ تیسری رات جو شخص ان لوگوں کے لیے کھانا لے کر آیا وہ اجنبی تھا اور تنہا ہی تھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد اس نے جلدی سے کھانے کے برتن رکھے اور کنور شمشیر سنگھ کے پاس پہنچ گیا۔ ''اوہ کنور! کنور میں یہاں موجود نہیں تھا، میں گرو داس کے کام سے کہیں گیا ہوا تھا۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ تم دوبارہ... دوبارہ....''

''ہاں بس ایسا ہی ہوا ہے، بدقسمتی مجھے دوبارہ ان کے چنگل میں لے آئی۔ میں زیادہ دور نہیں نکل سکا تھا اور اس کی بنیادی وجہ ایک غلطی تھی۔''

''کیا؟'' اجنبی نے پوچھا۔

''ہمارے پاس گھوڑے نہیں تھے اور ہم پیدل زیادہ دور تک نہیں نکل سکتے تھے۔''

اجنبی نے اس دوران شاہ زیب اور کوروتی کو دیکھا اور بری طرح اچھل پڑا۔

''یہ... یہ دونوں کون ہیں؟''

''ہمارے ہمشکل۔''

''یہ کہاں سے آئے؟''

''بس یہ بھی ہماری طرح پھنس گئے ہیں بیچارے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ ہمارے فرار کے لیے مزید کیا کر سکتے ہو؟''

''میں صبح واپس آ گیا تھا اور آتے ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ آپ دوبارہ ان کے قبضے میں آ گئے ہیں۔ آپ کا یہاں سے نکل جانا بے حد ضروری ہے، ورنہ یہ سب میرے لیے بھی مصیبت کا باعث بن سکتا ہے، چنانچہ سارا دن میں اسی کوشش میں مصروف رہا ہوں کہ اس بار آپ کو اس طرح نکالوں کہ آپ دوبارہ ان کے ہتھے نہ چڑھ سکیں۔''

''میں جانتا تھا کہ تم کتنے سمجھدار آدمی ہو۔'' کنور شمشیر سنگھ نے فخریہ انداز میں شاہ زیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر بولا ''لیکن اب تم نے یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ فرار ہونے والے دو نہیں بلکہ چار لوگ ہیں۔''

''کاش! یہ بات مجھے پہلے سے معلوم ہوتی لیکن آپ چنتا نہ کریں، ان لوگوں کے لیے بھی گھوڑوں کا بندوبست کر دیا جائے گا۔''

''تو پھر ہمیں کیا کرنا ہے شیام؟''

''آپ کو کچھ نہیں کرنا، آپ آرام سے بیٹھے رہیے، میں آپ کو وقت مقررہ پر آ کر اطلاع کر دوں گا۔''

''چار گھوڑے تیار رکھنا، میرا خیال ہے اس بار ہم کسی دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔''

''ہاں مہاراج، بہتر تو یہ ہے کہ اس بار پریم نواس چلے جائیں۔ پریم نواس جانے والے راستے کی طرف ان کی توجہ نہیں جائے گی کیونکہ وہ بہت دشوار گزار ہے اور پہاڑوں سے گزرتا ہے۔ کوئی بھی سمجھدار آدمی اس طرف کا رخ نہیں کر سکتا۔''

''ٹھیک ہے میں اسی طرف جاؤں گا۔'' شمشیر سنگھ نے کہا اس کے بعد شیام چلا گیا۔ شمشیر سنگھ مسکراتی نگاہوں سے شاہ زیب کی طرف دیکھنے لگا پھر بولا۔

''تم نے دیکھا جو کچھ میں نے کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔'' شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا، ظاہر ہے کنور کے معاملات اس کی سمجھ سے باہر تھے۔

رات کے تقریباً بارہ بجے ہوں گے جب شیام واپس آ گیا۔ اس کے پاس کچھ سامان تھا جو ایک پوٹلی میں بندھا ہوا تھا۔ وہ سامان اس نے کنور شمشیر کو دیتے ہوئے کہا۔

''آیئے مہاراج، سمے ہو چکا ہے۔''

''تمام کام ٹھیک کر لیے ہیں۔''

''بالکل، اس بار شیام دھوکہ نہیں کھائے گا۔''

کنور نے کچھ نہ کہا شیری اور کوروتی کھڑی ہو گئی تھیں۔ پھر وہ چاروں قید خانے سے باہر نکل آئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، لیکن قید خانے کے اس راستے کی جانب سفر نہ کیا گیا جدھر سے گزر کر گرو داس کے پاس جایا جاتا رہا تھا بلکہ شیام انہیں لیے ہوئے ایک بغلی راہ داری کی جانب چل پڑا تھا۔ یہ راہداری باغ کے عقبی گوشے میں ختم ہوتی تھی اور یہاں سے ان لوگوں کو دیوار عبور کرنی پڑی تھی۔ شیام ان لوگوں کے ساتھ ساتھ ہی تھا، دیوار کے دوسری جانب چار گھوڑے موجود تھے جن پر زینیں کسی ہوئی تھیں۔ شیام نے ان لوگوں کو آخری بار پرنام کیا اور اس کے بعد انہوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑھ لگا دی۔

شاہ زیب کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ یہ کام اتنا آسان ہوگا، لیکن بہرطور اب اس سلسلے میں گفت وشنید بے معنی تھی، چنانچہ وہ سب کنور شمشیر سنگھ کی رہنمائی میں آگے بڑھتے رہے۔

تاریک رات چاروں طرف مسلط تھی، کتے بھونک رہے تھے۔ یہ لوگ اس طرح گھوڑے آگے بڑھا رہے تھے کہ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز بھی نہ سنائی دے، ویسے مضبوط توانا گھوڑے تھے۔ شاہ زیب نے کوروتی سے گھڑ سواری کے بارے میں پوچھا تو اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں میں بہترین گھڑ سوار ہوں۔''

شیری بھی بڑے آرام سے گھوڑے کی پشت پر بیٹھی ہوئی تھی، یہ لوگ بے آواز چلتے ہوئے بالآخر بستی کے آخری سرے پر آ گئے اور جب بستی کا آخری مکان بھی پیچھے رہ گیا تو کنور شمشیر سنگھ نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''بس اب تیز رفتاری ہی ہماری مشکل حل کر سکتی ہے۔''

چنانچہ سب نے گھوڑوں کو ایڑھ لگا دی، کنور شمشیر سب سے پیچھے تھا، اس نے ایک سیدھ متعین کر دی تھی، چنانچہ عورتوں کی دونوں طرف سے حفاظت کی جا رہی تھی۔ شاہ زیب آگے آگے اپنا گھوڑا دوڑا رہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ ان لوگوں سے زیادہ دور نہ نکلنے پائے۔ شاہ زیب کے لیے عجیب وغریب صورت حال تھی۔ کار تو چلائی تھی لیکن گھڑ سواری کی زیادہ مشق نہیں تھی اس لیے اپنے آپ کو گھوڑے کی پشت پر جمانے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑ رہی تھی، یہ لوگ اونچے نیچے ٹیلے عبور کرتے رہے، کھائیوں میں بھی اترنا پڑا اور گڑھوں میں سے بھی گزرنا پڑا، واقعی بڑا ہولناک سفر تھا، بعض جگہیں تو ایسی تھیں کہ گردن گھما کر دیکھتا تو دل کی حرکت بند ہونے لگتی تھی۔ ایک طرف بلند وبالا پہاڑ، دوسری طرف اتنی گہری کھائی کہ نیچے زمین نظر نہیں آتی تھی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جس راستے پر گھوڑے دوڑ رہے تھے وہ زیادہ سے زیادہ تین فٹ چوڑا تھا اور اس کے کنارے بالکل سپاٹ تھے۔ گھوڑے کا کوئی بھی پاؤں غلط پڑتا تو وہ اپنے آپ کو سوار سمیت گہرائیوں میں گرنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ شاہ زیب خوف کی وجہ سے آنکھیں بند کیے گھوڑا دوڑا رہا تھا۔

خدا خدا کر کے یہ راستہ ختم ہوا اور اس کے بعد سپاٹ میدان آ گیا جس کے انتہائی سرے پر درخت نظر آ رہے تھے، گویا اب جنگل شروع ہونے جا رہا تھا۔ یہ لوگ سپاٹ میدان میں دوڑتے رہے، پھر درختوں میں داخل ہو گئے، جنگلوں کے درمیان گھوڑوں کا سفر بے حد دشوار گزار تھا۔ شاہ زیب نے گھوڑے کی رفتار سست کر لی وہ سب اس کے نزدیک آ گئے تھے، شاہ زیب نے کنور شمشیر سنگھ سے پوچھا۔

''جس طرف تم جا رہے ہو کیا وہاں جانے کے لیے کوئی باقاعدہ راستہ نہیں ہے؟''

''اول تو باقاعدہ راستہ نہیں ہے، لیکن دوسری بات یہ ہے کہ میں اس طرف جا بھی نہیں رہا، شیام لاکھ میرا وفادار سہی لیکن مار کے آگے بھوت بھاگتا ہے، اگر کہیں گرو داس کو شبہہ ہو گیا کہ ہمارے فرار میں اس کا ہاتھ ہے تو ظاہر ہے کسی نہ کسی طرح وہ یہ بات اگلوا لے گا کہ ہم لوگ کہاں گئے ہیں۔ میں نے اس خطرے کو مدنظر رکھا ہے اور اس طرف نہیں

جا رہا جدھر شیام نے کہا تھا۔"

شاہ زیب نے اس کی بات پر غور کیا تو اسے شمشیر سنگھ کی دانش مندی پسند آئی اور اس کے بعد یہ لوگ جنگل میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے۔ صبح کے وقت گھوڑے بالکل ہی تھک گئے تو کنور شمشیر نے گھوڑے کی پشت چھوڑ دی اس کے نیچے اترتے ہی باقی لوگ بھی نیچے اتر آئے، شاہ زیب نے کہا۔

"کنور! کیا خیال ہے قیام کے لیے یہ جگہ موزوں ہوگی؟"

"موزوں تو نہیں ہے، لیکن گھوڑے بری طرح تھک گئے ہیں، اگر ہم ایک دو گھنٹے کا سفر اور کرلیں تو ان پہاڑوں کو عبور کر کے ایک ایسے حصے میں جانکلیں گے جہاں ایک ندی پڑتی ہے، ندی کے کنارے درخت بھی ہیں۔ علاقہ بالکل سنسان ہے اور آس پاس کسی کے گزرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

"تو پھر کیوں نہ گھوڑوں کا یہ سفر بھی کرلیا جائے تاکہ ندی کے قریب پہنچ کر آرام سے وقت گزارا جائے، ورنہ یہاں تھوڑی دیر کے بعد سورج سروں پر پہنچ جائے گا تو پہاڑ تانبے کی طرح تپنے لگیں گے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ تمہیں راجپوتانہ کے بارے میں کیسے معلومات حاصل ہیں؟"

"کچھ نہیں... بس یہاں کا ماحول دیکھ چکا ہوں۔"

یہ لوگ بمشکل گھوڑوں پر بیٹھ کر آگے بڑھے، گھوڑے واقعی اب جگہ جگہ اڑ رہے تھے، لیکن کسی نہ کسی طرح انہیں چمکار اور مار کر بالآخر یہ لوگ اس میدان کو عبور کرنے میں کامیاب ہو گئے جو اونچے نیچے چٹانی ٹیلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور اس کے بعد جب یہ لوگ ایک بلندی سے گزر کر ڈھلان پر پہنچے تو وہ ندی نظر آ گئی جگہ جگہ گھاس نظر آ رہی تھی۔ گھوڑے گھاس دیکھ کر تیزی سے اس کی جانب بڑھے۔

ندی کے قریب پہنچ کر ان لوگوں نے گھوڑوں کو آزاد چھوڑ دیا اور خود درختوں کی چھاؤں میں لیٹ کر گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ کوروتی اور شیری کی کیفیت بھی ان دونوں سے مختلف نہیں تھی۔ ندی کے کنارے کچھ دیر آرام کرنے اور کھانا کھانے کے بعد یہ لوگ سفر کے اگلے حصے کے لیے تیار ہو گئے، لیکن کنور شمشیر سنگھ زمین پر ہی پڑا رہا شاہ زیب نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"میں... میں سخت بیمار ہوں.. میرا پورا بدن بے جان ہو رہا ہے۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"اوہ... کنور شمشیر سنگھ، ہمیں ہمت سے کام لینا ہوگا۔ یہاں تو تمہارا کوئی علاج بھی نہیں ہو سکتا۔ مجھے بتاؤ آس پاس کوئی بستی ہے میں تو ان علاقوں سے بالکل ناواقف ہوں۔"

"ہاں دریا کے کنارے، ہم تقریباً دو میل چل کر دریا عبور کریں اور تقریباً تین چار میل کا سفر طے کرلیں تو ہمیں بستی رجنی مل جائے، رجنی اچھی خاصی بستی ہے اور میرا خیال ہے ہمارے لیے محفوظ بھی کیونکہ اس طرف ان لوگوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔"

"دریا کے کس سمت سفر کرنا ہوگا ہمیں؟"

"بائیں سمت..." اس نے جواب دیا اور شاہ زیب نے گردن ہلا دی۔ یہ بات شاہ زیب نے احتیاطاً پوچھ لی تھی کہ اگر کہیں کنور شمشیر سنگھ کی حالت زیادہ بگڑ جائے تو کم از کم اسے کسی بستی تک پہنچا تو سکے۔ اس وقت شمشیر سنگھ ان کے لیے خاصی اہمیت اختیار کر گیا تھا، چنانچہ اس کی حفاظت بھی ضروری تھی وہ اسی طرح پڑا رہا شاہ زیب نے اور کوروتی نے بھی اس کی تیمارداری کی اور شیری تو اس کی دوست اور محبوبہ تھی۔ شمشیر سنگھ کو بخار نہیں تھا لیکن وہ مسلسل کراہے جا رہا تھا اور اس کی حالت خاصی خراب محسوس ہو رہی تھی طے یہ کیا گیا کہ رات یہیں گزار دی جائے۔ اس حالت میں شمشیر سنگھ سفر نہیں کر سکتا تھا۔

رات کو تھوڑا بہت کھانا کھایا گیا، جواب ختم ہونے کے قریب تھا۔ شمشیر سنگھ نے اس وقت کچھ نہیں کھایا تھا، اس کے ہونٹ خشک تھے اور آنکھیں چڑھی جا رہی تھیں، اس کی اس کیفیت کو دیکھ کر ان لوگوں کو تشویش ہوتی رہی، بہر طور کافی

رات گئے تک یہ لوگ جاگتے رہے اوراس کے بعد آنکھیں جھپکنے لگیں، کوروتی پہلے سوگئی تھی اوراس کے بعد شاہ زیب کی بھی آنکھ لگ گئی۔

رات کے کسی پہر دفعتاً شاہ زیب کے کانوں نے ایک چیخ سنی اور وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا، چیخ دوبارہ سنائی دی، شاہ زیب نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ کوئی گڑ بڑ ہے، پھر چیخ پر غور کیا تو وہ کوروتی کے علاوہ کسی اور کی آواز نہیں تھی۔ شاہ زیب وحشت زدہ انداز میں کھڑا ہوگیا، ایک عجیب وغریب منظر سامنے تھا، کوروتی شمشیر سنگھ کے بازوؤں میں مچل رہی تھی اور وہ اسے گھوڑے پر بٹھانے کی کوشش کررہا تھا۔ شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے؟

دیکھتے ہی دیکھتے شمشیر سنگھ گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ پھراس نے گھوڑے کی پشت پر ہاتھ مارا اور گھوڑے نے زقند لگادی، اسی وقت شاہ زیب ہوش میں آگیا شمشیر سنگھ کوروتی کو لیے جارہا تھا، شاہ زیب نے تیزی سے پلٹ کر دوسرے گھوڑوں کی طرف نظر دوڑائی، لیکن ایک اور منظر نے اس کے اوسان خطا کردیے۔ شاہ زیب سے کوئی دس گز کے فاصلے پر ایک گھوڑا مڑا تڑا پڑا ہوا تھا اور شاہ زیب کو بخوبی اندازہ ہورہا تھا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ شاہ زیب اس کے قریب پہنچا تو اس نے وہ وحشت زدہ منظر دیکھا۔ گھوڑے کی گردن پر خنجر پھیر دیا گیا تھا اس سے تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر دوسرا گھوڑا بھی مردہ حالت میں پڑا تھا اور اس کے ساتھ ہی تیسرا بھی، شاہ زیب کے اوسان خطا ہورہے تھے، بدن میں سنسنی دوڑ رہی تھی یہ سب کچھ کنور شمشیر سنگھ نے کیا ہے۔ رفتہ رفتہ تمام باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ کنور شمشیر سنگھ نے بیمار ہونے کا بہانہ کیا تھا اور نڈھال ہونے کی اداکاری کی تھی۔ اس کے ذہن میں شروع ہی سے یہ منصوبہ تھا کہ کسی طرح کوروتی کو لے کر فرار ہوجائے، شاہ زیب نے تیزی سے گھوم کر شیری کو دیکھا وہ بھی دونوں ہاتھ زمین پر ٹکائے بیٹھی تھی اور اس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا، شاہ زیب اس کے قریب پہنچ گیا۔

''شیری، شمشیر سنگھ کوروتی کو لے گیا۔''

شیری گم صم انداز میں شاہ زیب کو دیکھتی رہی اس نے شاہ زیب کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا، شاہ زیب نے پھر کہا۔

''اوراس نے تینوں گھوڑے ہلاک کردیے تاکہ ہم اس کا تعاقب نہ کرسکیں۔'' تب شیری کی گردن گھومی اور اس نے گھوڑوں کی لاشوں کو دیکھا دوسرے لمحے وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی تھی۔

''رونے سے کام نہیں چلے گا شیری، وہ کہاں گیا اور کوروتی کو کیوں لے گیا، کیا تم مجھے کچھ بتا سکتی ہو؟'' شاہ زیب کا لہجہ عجیب سا تھا۔

شیری نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، بس وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی اور شاہ زیب پاگلوں کے سے انداز میں اِدھر اُدھر ناچتا رہا، یہ سب کچھ اس کی توقع کے خلاف تھا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کنور شمشیر سنگھ میرے ساتھ ایسا فریب کرسکتا ہے۔ شاہ زیب نے اب کسی قدر غصیلی نگاہوں سے شیری کی طرف دیکھا اور پھر غرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''آواز بند کرو، یہ کیا اداکاری شروع کررکھی ہے تم نے؟''

شیری نے دونوں ہاتھ منہ پر سے ہٹائے اور شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھورنے لگی۔

''تم کون ہوتے ہو مجھ سے بکواس کرنے والے؟'' وہ جھلائے ہوئے انداز میں بولی۔

''وہ تمہارا ساتھی تھا۔''

''میں تم پر بھی لعنت بھیجتی ہوں اوراس پر بھی۔''

''لعنت بھیجنے سے کام نہیں چلے گا شیری، جس طرح وہ کوروتی کو نکال لے گیا ہے، اسی طرح تمہیں بھی نقصان اٹھانا پڑے گا۔''

''میں.. میں کہتی ہوں بکواس مت کرو، میں سب کچھ سمجھ چکی ہوں۔'' پھر شیری زاروقطار رونے لگی اور شاہ زیب پریشانی سے اس کے نزدیک بیٹھ کر اس کی شکل دیکھتا رہا، شاہ زیب کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کے بال پکڑ کر اس کا سر زمین پر دے مارے، غصے کے عالم میں اس کی حالت بری ہو رہی تھی، سوچنے سمجھنے کی تمام تو تیں چند لمحوں کے لیے بالکل ختم ہوگئی تھیں، کافی دیر اسی طرح گزر گئی، شیری کی سسکیاں ابھر رہی تھیں، پھر شاہ زیب نے اس سے کہا۔

''اللہ کی بندی یہ تو سوچ لو کہ اب ہم یہاں سے کیسے آگے بڑھیں گے کیا تم میری مدد نہیں کرسکتیں، کیا یہ نہیں بتاسکتیں کہ شمشیر سنگھ اسے کہاں لے گیا ہے؟''

''جہنم میں۔'' شیری بولی۔

''جہنم کا راستہ تو جانتی ہوگی تم؟'' شاہ زیب نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''تم بھی اس کے پیچھے چلے جاؤ، گھوڑے کے قدموں کے نشانات تو مل ہی جائیں گے تمہیں۔'' اس نے پھر جھلائے ہوئے انداز میں کہا اور شاہ زیب نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

''او مصیبت میں تیرا کیا کروں؟''

''جہنم رسید ہو جاؤ، مجھے تمہاری ضرورت بھی نہیں ہے، سمجھے۔ میں اپنا بچاؤ خود کرلوں گی، نہ بچ سکی تو مر جاؤں گی۔''

''مگر میں تمہیں ایسے نہیں چھوڑ سکتا۔''

''کیا بگاڑ لوگے تم میرا؟''

''ٹکڑے کردوں گا تمہارے، کیا سمجھیں، یہیں گردن دبا کر ندی میں پھینک دوں گا۔'' شاہ زیب نے خونخوار لہجے میں کہا اور شیری کسی قدر سہمی ہوئی نظر آنے لگی، پھر خوفزدہ انداز میں بولی۔

''میرا کیا قصور ہے، میں تو خود دھوکہ کھا گئی ہوں، وہ پاپی... میں سب سمجھ گئی ہوں، اچھی طرح جانتی ہوں، میں نے پہلے بھی محسوس کیا تھا کہ وہ مجھے دھوکہ دے رہا ہے وہ مطلبی ہے، خود غرض ہے۔''

''وہ جو کچھ بھی ہے لیکن اس کا پتا بتانے کے لیے صرف تم یہاں موجود ہو۔''

''پتا بتانے کے لیے، کیا وہ مجھے اپنا پتا بتا کر گیا ہوگا، اگر ایسا ہی ہے تو کیا وہ مجھے نہیں لے جاسکتا تھا، کوروتی تو اس کی ضرورت تھی، اور میں...... میں اس کی محبوبہ ہوں، اس کی منگیتر ہوں، سمجھے تم، لیکن میں..... میں اسے اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔''

''مجھے بھی سمجھا دو تو بہتر ہوگا۔''

''تم کیوں میرے کان کھائے جا رہے ہو، تمہارا جو دل چاہے کرو، میں خود مصیبت زدہ ہوں۔''

''بہتر ہے دریا میں کود کر خودکشی کرلوں۔''

''تو کرلو... بھاڑ میں جاؤ، مجھے کیا؟'' شیری جھلائے ہوئے انداز میں بولی اور پھر گھٹنوں میں منہ دے کر بیٹھ گئی۔

شاہ زیب پر عجیب سی بے بسی طاری ہوگئی تھی، لیکن پھر اس کے اندر ایک اور احساس ابھرا، ارے واہ... یہ تو بڑا اچھا ہوا کوروتی خود بخود میری زندگی سے نکل گئی اور یہ جھگڑا ختم ہوگیا۔ اب مجھے کیا پڑی ہے کہ اس کے پیچھے پیچھے چکر لگاتا پھروں، بہتر یہ ہے کہ یہاں سے کہیں اور نکل جایا جائے۔ لعنت ہے اس علاقے پر، لعنت ہے کوروتی پر اور لعنت ہے ان سب پر۔ میں کون سا ان سب کے لیے مضطرب ہوں یا مجھے کون سی ریاست حاصل کرنی ہے جو میں کوروتی کے لیے پریشان رہوں...... گئی...... جائے...... جہنم میں جائے، اب وہ جانے اور کنور شمشیر سنگھ۔ میرا پیچھا تو چھوٹ گیا۔ شاہ زیب سوچتا رہا، وہ اس سلسلے میں بہت زیادہ مصیبت پالنے کا قائل نہیں تھا، نہ ہی اس کے ذہن میں کوروتی کے لیے کوئی ایسا خیال تھا، بلکہ وہ خود ہی اس بارے میں مختلف انداز میں سوچتی رہی تھی، لیکن شیری، شاہ زیب سوچ رہا تھا کہ شیری کا کیا کیا جائے۔

شاہ زیب کافی دیر تک اپنی جگہ لیٹا آنے والے وقت کے بارے میں سوچتا رہا، کوروتی کی تلاش بے مقصد تھی،

جان بوجھ کر کون مصیبت مول لے۔ شیری بھی وہیں لیٹی ہوئی تھی، لیکن جب سورج بلند ہوا تو زمین لیٹنے کے قابل ہی نہ رہی اور وہ دونوں اٹھ بیٹھے۔ اب شیری کسی قدر معتدل نظر آ رہی تھی، اس نے شاہ زیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سنو، کیا نام ہے تمہارا رمیش؟''

''جی سنائیے۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''میں شاید غصے میں تمہیں بہت برا بھلا کہہ گئی ہوں۔''

''چ..... آپ کو یاد ہے؟'' شاہ زیب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''مجھ پر طنز نہ کرو، ذرا غور کرو میں نے جس کے لیے اپنی ساری زندگی لٹا دی وہ مجھے کس طرح چھوڑ کر بھاگ گیا، بے یار و مددگار، اس نے گھوڑوں کو بھی مار دیا کہ ہم اس کا پیچھا نہ کر سکیں، لیکن یہ نہ سوچا اس نے کہ اس بیابان میں ہمارا ہوگا کیا؟''

''ابھی زمین تپ جائے گی، آسمان بھی تپے گا تو ہم اطمینان سے اس میں روسٹ ہو جائیں گے، روسٹ سمجھتی ہو تم؟''

''میرا مذاق مت اڑاؤ، میں بہت پریشان ہوں۔''

''اچھا چلو ٹھیک نہیں اڑاتا تمہارا مذاق، لیکن میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''دیکھو، انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کم از کم انسانی رشتے سے تمہیں میری مدد کرنی چاہیے، میں یہ بات جانتی ہوں کہ خود تمہارے ساتھ بھی دھوکہ ہوا ہے اور وہ پاپی کوروتی کو تمہارے پاس سے چھین کر لے گیا ہے۔ جتنے مظلوم تم ہو اتنی ہی میں ہوں۔''

''ایک بات بتاؤں، میں بالکل مظلوم نہیں ہوں، بلکہ کنور شمشیر سنگھ نے میرے اوپر احسان کیا ہے کہ مجھے اس مصیبت سے نکال لیا، ارے واہ، مجھے کیا پڑی ہے کوروتی سے اور اس کی شناخت سے، اب وہ جانے اور کنور شمشیر سنگھ، میں تو ایک اجنبی ہوں۔ اپنے معاملات وہ یقیناً آپس میں طے کر سکتے ہیں۔''

''مگر تم تو اس کے ساتھ تھے اور وہ تم سے بہت مانوس نظر آتی تھی۔''

''تم اسے ناگہانی کہہ سکتی ہو۔ جب انسان پر برا وقت آتا ہے تو وہ ایسی ہی مصیبتوں میں پھنس جاتا ہے اور پھر برا وقت تو مجھ پر مرکوز ہے، اچھا وقت دیکھے ہوئے پتا نہیں کتنا عرصہ گزر گیا۔''

''تم بھی کافی پریشان معلوم ہوتے ہو۔''

''پہلے تھا اب نہیں ہوں۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ پریشانی کو کنور شمشیر بھگا کر لے گیا ہے۔''

''تم اس سے اتنے اکتائے ہوئے تھے؟''

''اس وقت تک نہیں اکتایا تھا جب تک وہ میرے ساتھ تھی، لیکن اب محسوس کر رہا ہوں کہ حماقت کر رہا تھا۔''

''تعجب ہے میں تو سمجھتی تھی تمہیں اس کے چلے جانے کا بہت دکھ ہوگا۔''

''اب تم یہ سمجھ لو کہ مجھے اس کے جانے کا دکھ نہیں ہے۔''

''تو اب کیا کرو گے؟''

''عیش...'' میں نے جواب دیا۔

''کہاں جاؤ گے؟''

''جہاں بھی تقدیر لے جائے، ویسے تمہارا کیا خیال ہے اس نے بستی کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا۔''

''بھگوان کی سوگند میں کچھ نہیں جانتی، میں بھی ان راستوں سے اتنی ہی ناواقف ہوں جتنے تم۔''
''تب یہ ندی کہیں نہ کہیں ضرور جاتی ہوگی، ہم اس کے کنارے کنارے چلتے ہیں، کہیں نہ کہیں پہنچ جائیں گے۔''
''دھوپ بہت تیز ہوتی جارہی ہے، کیسے سفر کریں گے؟''
''جیسے بھی ممکن ہوسکا۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔
''کھانے پینے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے۔''
''تمہیں زیادہ بھوک لگے تو تم مجھے کھا جانا اور مجھے زیادہ بھوک لگی تو میں.....'' شاہ زیب نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور شیری آہستہ سے مسکرادی۔
''ویسے تم دلچسپ آدمی ہو۔''
''خبردار دوبارہ یہ جملہ نہ کہنا، میری کھوپڑی آؤٹ ہوجائے گی۔''
''کیوں؟'' وہ بدستور مسکراتی ہوئی بولی۔
''پہلے تم لوگ دلچسپ کہتی ہو، پھر پر کشش اور اس کے بعد...ارے باپ رے نہیں اب میں کسی مصیبت میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''
''دیکھو میرا مذاق مت اڑاؤ، کسی بے بس لڑکی پر تمہیں رحم کھانا چاہیے۔''
''آج تک اس کے علاوہ اور کیا ہی کیا ہے، بے بس لڑکیوں پر رحم کھاتا رہا ہوں اور مصیبت میں پھنستا رہا ہوں۔ میری مصیبت کی وجہ لڑکیاں ہی ہیں۔''
''لیکن میں تمہارے لیے مصیبت نہیں بنوں گی۔ وعدہ کرتی ہوں، بس کسی آبادی تک مجھے ساتھ رکھو، جہاں انسانوں کی کوئی بستی آجائے تم مجھے چھوڑ دینا، دوسری بات نہیں کہوں گی وعدہ ہے۔''
''پکا وعدہ۔'' شاہ زیب نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
''ہاں پکا وعدہ۔ میں تو خود دکھی ہوں، اپنا گھر بار، سنسار سب کچھ چھوڑ دیا تھا اس پاپی کے لیے مگر نجانے کیوں مجھے کچھ دنوں سے یقین ہو چلا تھا کہ وہ خود غرض ہے اور اپنا مطلب نکال رہا ہے بس اور کچھ نہیں۔''
''تو پھر آؤ چلیں، ندی کے کنارے کنارے چلتے ہیں اس طرح پانی کے نزدیک رہے تو دھوپ کی تپش زیادہ محسوس نہیں ہوگی۔'' شیری نے گردن ہلادی اور دونوں چل پڑے، دھوپ واقعی تیز تر ہوتی جارہی تھی، لیکن یہ فیصلہ بھی درست تھا کہ ندی کے ساتھ ساتھ چلا جائے تاکہ جب ضرورت پڑے یہ لوگ پانی میں اتر کر اپنے بدن بھگولیں۔ دھوپ سے بچنے کے لیے ان دونوں نے دو تین بار ایسا ہی کیا جانے کتنا سفر طے ہوگیا بری طرح تھک گئے تھے، ان کی طبیعت بھوک کے مارے نڈھال ہورہی تھی لیکن پھر کچھ ڈھلانوں میں اترتے ہوئے انہیں پھل دار درخت نظر آگئے اور دونوں ان کی جانب بڑھ گئے، اتنی دیر تک پیدل سفر کرتے رہے تھے، بدن پھر تھک گئے تھے۔ چنانچہ درختوں کے نیچے نہایت سکون محسوس ہوا، پھل انہوں نے توڑ کر کھائے اور ان سے پیٹ بھی بھر گیا۔ شیری ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی، شاہ زیب کو اس پر ترس آنے لگا، لیکن اس نے اپنے آپ کو روکا، یہ ترس ہی تو مصیبتوں کا باعث بن جاتا ہے۔
''مہیش، میں بہت تھک گئی ہوں۔ کیا ابھی آگے کا سفر کرنا ہے یا رات کو آرام کرلیا جائے۔''
''ابھی تو رات کافی دور ہے۔''
''ہاں، مگر یہ ہوسکتا ہے کہ آگے ہمیں ایسی جگہ نہ ملے۔''
شاہ زیب چند لمحے سوچتا رہا پھر ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلادی۔
''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔''
شیری نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ شاہ زیب واقعی پریشان ہوگیا تھا، اگر یہ ندی یونہی سپاٹ میدانوں اور سنگلاخ

چٹانوں کے درمیان سے گزرتی رہی تو کیا ہوگا؟ ہوسکتا ہے آگے چل کر کہیں راستہ رک جائے۔ کیا اسے عبور کر کے دوسرے کنارے کو دیکھا جائے، لیکن اس سے بھی فائدہ نہیں تھا، جہاں تک نگاہ کام کر رہی تھی، ویرانہ ہی ویرانہ نظر آرہا تھا۔ اس ویرانے میں اگر کوئی ذی روح شاہ زیب کے ساتھ تھا تو صرف شیری، اگر تنہا ہوتا تو شاید زیادہ خوفناک بات ہوتی، اس وقت شاہ زیب کے لیے شیری کا ساتھ غنیمت تھا، کم از کم بولنے بات چیت کرنے کے لیے تو کوئی تھا، چنانچہ اب اس نے اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کرلی اور نرم لہجے میں شیری سے کہا۔

''اگر تمہیں نیند آرہی ہو تو سو جاؤ۔'' وہ اپنی آنکھیں کھول کر بولی۔

''نیند نہیں آرہی، تھکن ہوگئی ہے۔ دھوپ کافی تیز تھی انگ انگ دکھ گیا ہے۔''

''چاہو تو ندی میں نہا لو۔''

''نہیں اب اس کی ضرورت نہیں محسوس ہو رہی۔'' وہ بولی اور پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

شام آہستہ آہستہ جھکی چلی آرہی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد فضاؤں میں اندھیرے اتر آئے، شیری شاہ زیب کے قریب ہوکر بیٹھ گئی تھی۔

''دیکھو کوئی غلط بات مت سمجھنا، بس مجھے رات کی تاریکیوں سے ڈر لگتا ہے۔''

''کوئی بات نہیں، اطمینان سے بیٹھو، میں تمہارے ساتھ ہوں، ویسے ان جنگلوں میں نہ تو کیڑے مکوڑے نظر آتے ہیں اور نہ ہی دوسرے جانوروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، ایسا لگتا ہے کہ یہاں پرندوں کے علاوہ اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو نقصان پہنچا سکے۔''

''ہاں۔'' اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

بھوک لگی تو پھر وہی پھل توڑ کر کھائے گئے اور اس کے بعد ایک صاف ستھرا ٹھکانہ بنا کر وہاں دونوں بیٹھ گئے۔ شاہ زیب نے کہا۔

''شیری کیا تم بتانا پسند کروگی کہ کنور سے تمہارا واسطہ کیسے پڑا؟''

شیری چند لمحے سوچتی رہی اس نے فوری طور پر شاہ زیب کی بات کا جواب نہیں دیا تھا پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آہستہ سے بولی۔

''تقدیر کی خرابی کہو رمیش، اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ اس پاپی نے مجھ سے محبت کا ناٹک رچایا تھا، وہ مجھ سے پریم کرتا تھا، وہ کہتا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرے گا۔ میں پاگل اس کی باتوں میں آگئی۔''

''تمہارا کوئی نہیں ہے اس دنیا میں۔ گھربار، ماں باپ کوئی تو ہوگا تمہارا۔'' شاہ زیب نے سوال کیا اور شیری کے چہرے پر غم کے تاثرات پھیل گئے۔ پھر وہ بولی۔

''ہیں چاچا جی، چاچی ہیں، لیکن چاچا جی چاچی کے ہاتھوں میں کھیلتے ہیں، مجھے کبھی سنسار میں وہ سکھ نہیں ملا جو اپنوں کا ہوتا ہے، ہمیشہ خود کو بے سہارا ہی پایا۔ کبھی کوئی ایسا نہیں ملا جس نے دل سے پیار کیا ہو، یہی وجہ تھی کہ جب مجھے کنور شمشیر کا سہارا ملا تو میں نے اپنا سارا سنسار اسے سمجھ لیا۔ میں نے سوچا کہ اب میری تقدیر کھل گئی۔ اس کے روپ میں میں نے سنسار پالیا تھا، مگر میری کالی تقدیر... اسے بدلنا تو میرے بس میں نہیں ہے۔'' شیری کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔

''مجھے افسوس ہے شیری، واقعی یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں، کنور تمہارے ساتھ مخلص نہیں تھا اس نے تمہیں صرف آلۂ کار بنایا تھا، لیکن کیا اس نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ تمہیں یہ روپ دے کر کیا کرنا چاہتا ہے؟''

''کیا بتاؤں، مت ماری گئی تھی، میری تقدیر نے دھوکہ دیا تھا اس نے میری اصل شکل بدل دی، ایک آدمی سے میرا چہرہ بدلوایا تھا، پاپی ہتھیارا، بھگوان اس سے اس کی ساری خوشیاں چھین لے، بھگوان کرے وہ کبھی سکھی نہ رہے۔'' شیری نے غصے میں آکر اپنے چہرے سے کچھ اتارنے کی کوشش شروع کردی اور تھوڑی زور آزمائی کے بعد وہ اپنے چہرے سے

نقلی چہرہ اتارنے میں کامیاب ہوگئی جو یقیناً کسی ماہر فن سے بنوایا گیا تھا، اس کا اصل چہرہ نمایاں ہو گیا تھا، اپنی اصل شکل میں بھی وہ کافی حسین تھی، نازک نازک سے نقوش کی مالک، خوبصورت آنکھوں والی، اس نے روتے ہوئے کہا۔

''چاچی جی نے اتنا تنگ کیا تھا مجھے کہ میں سدھ بدھ کھو بیٹھی اور اس پاپی کے فریب میں آ گئی ورنہ.. ورنہ میں اپنا گھر کیوں چھوڑتی؟''

''بھیس بدلنے کے سلسلے میں اس نے تم سے کیا کہا تھا؟'' شاہ زیب نے پھر سوال کیا۔

''گھر سے نکلنے کے بعد میں بہت خوش تھی، اس نے مجھے ایک مکان میں رکھا تھا اور وہاں وہ میری خوب دلجوئی کرتا تھا، بہت کچھ بنا کر دیا تھا اس نے مجھے، کہتا تھا کہ سنسار کی ہر خوشی میرے قدموں میں ڈال دینا چاہتا ہے۔ مگر کچھ مجبوریاں ہیں، میں اگر ایک کام کر دوں تو دن بدل جائیں گے، مجھے بیوقوف نے خود ہی اس سے اس کام کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے ایک کہانی سنا دی، اور پھر کہا کہ میں کوروتی بن جاؤں اور اچھے دنوں کے لیے کچھ محنت کرلوں تو پھر عیش ہی عیش ہوں گے' ہاں اس نے ایک آدمی کو بلا کر یہ نیا چہرہ میرے چہرے پر چڑھوا دیا اور پھر مجھے ساتھ لے کر شاستری پور آ گیا جہاں گرو داس نے ہم دونوں کو گرفتار کر لیا، مگر وہ جو کچھ سوچ رہا تھا وہ نہ ہوا، گرو داس اس سے جنم کنڈلی کے بارے میں پوچھتا تھا جو اس کے پاس نہیں تھی۔''

''وہ کیا کہانی تھی شیری، براہ کرم مجھے بتاؤ۔'' شاہ زیب نے دلچسپی سے کہا اور شیری کسی گہری سوچ میں گم ہوگئی، غالباً وہ کہانی یاد کر رہی تھی، پھر اس نے کہا،

''اس نے مجھے کوروتی کے بارے میں بتایا تھا۔''

''کیا شیری؟'' شاہ زیب نے دھڑکتے دل سے پوچھا، کوروتی کی کہانی شاہ زیب کے لیے بھی پراسرار تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد شیری پھر بولی۔

''کوروتی ریاست شاستری پور کے جاگیردار مول چند کی بیٹی ہے، مول چند اور اس کے پرکھوں نے ہمیشہ انگریز راج کی وفاداری کی جس کے نتیجے میں اسے بہت سی جاگیریں دی گئیں اور وہ بے حد دولت مند ہو گیا، پھر وہ کہیں کھدائی کرا رہا تھا کہ اسے ایک بہت بڑا خزانہ ہاتھ لگا، خزانے کے بارے میں اندازہ تھا کہ اس سے چار بڑے شہر بسائے جا سکتے ہیں، چالاک مول چند نے خزانہ وہاں سے نکال کر کہیں اور چھپا دیا۔ اس سلسلے میں اس نے بڑی رازداری سے کام لیا تھا اور جن لوگوں کے ذریعے اس نے خزانہ چھپایا انہیں قتل کر دیا، مگر ان میں سے ایک کسی طرح بچ گیا، مول چند اسے مردہ سمجھ کر چھوڑ گیا تھا، مگر اس میں جان تھی وہ زخمی حالت میں پڑا تھا کہ ڈینئل مارکو نامی ایک انگریز شکار کھیلتا ہوا اس طرف جا نکلا اور وہ زخمی اس کے ہاتھ لگ گیا۔ زخمی نے اسے خزانے کی کہانی سنائی لیکن اس کے چھپانے کی جگہ بتائے بغیر مر گیا، خزانے کی جگہ کے بارے میں ڈینئل مارکو کو کچھ نہ معلوم ہو سکا، لیکن اسے یہ پتا چل گیا تھا کہ خزانہ مول چند کی تحویل میں ہے، ڈینئل مارکو کے تعلقات نہیں تھے لیکن ایک انگریز افسر کی حیثیت سے وہ مول چند سے ملا اور بالآخر اس پر ظاہر کر دیا کہ وہ خزانے کے بارے میں جانتا ہے اس لیے بہتر ہے کہ اسے خزانے کا حصے دار بنایا جائے، مول چند نے اس خزانے سے لاتعلقی کا اظہار کر دیا، لیکن ڈینئل مارکو نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اس نے مول چند کو ان لوگوں کے قتل کے الزام میں پھانس کر جیل میں ڈلوا دیا جنہیں مول چند نے خزانہ پوشیدہ رکھنے کی وجہ سے قتل کیا تھا۔ پھر جیل میں اس نے مول چند کو دھمکیاں دیں کہ اگر اس نے اس خزانے کے بارے میں نہ بتایا تو اس کی بیٹی کوروتی کو ہلاک کر دیا جائے گا۔ مول چند نے جیل میں ملاقات کرنے کے لیے آنے والے اپنے ایک معتمد خاص بھرت چند سے درخواست کی کہ وہ کوروتی کو لے کر روپوش ہو جائے اور وفادار بھرت چند نے ایسا ہی کیا۔ اس نے کوروتی کی پرورش کی اس بات سے مایوس ہو کر ڈینئل مارکو نے مول چند کے دوستوں سے رابطہ قائم کیا اور انہیں خزانے کے بارے میں بتا کر کوشش شروع کر دی کہ خزانہ مل جائے۔ کنور شمشیر سنگھ کو بھی ویریندر سنگھ کے ذریعے خزانے کی کہانی معلوم ہوگئی، مول چند نے ایک کام اور کیا وہ یہ کہ کوروتی کی جنم کنڈلی میں اس خزانے کا نقشہ پوشیدہ کر دیا، لیکن جنم کنڈلی کا راز، راز نہ رہ سکا۔ تاہم

کوروتی ہی کا پتا نہیں تھا، پھر انگریز راج ختم ہوگیا اور ڈینئل مارکو کو بھی دوسرے انگریزوں کی طرح یورپ واپس جانا پڑا، لیکن خزانے کی یاد وہ اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا اور اس کا مسلسل رابطہ ان لوگوں سے رہا اور وہ خود بھی ضرورت کے وقت یہاں آتا رہا اور ویریندر سنگھ اور دوسرے لوگ بھی خزانے کے چکر میں اپنے طور پر سرگرداں رہے۔ ڈینئل مارکو کو یہ احساس بھی تھا کہ چونکہ اب ہندوستان میں ان کا اقتدار نہیں ہے اس لیے یہ دوسرے لوگ جو اپنے طور پر کام کررہے ہیں، آیا وہ بااثر ہوگئے ہیں کسی طرح اسے بھرت چند کے بارے میں معلوم ہوگیا اور اس نے بھرت چند کے خلاف کارروائی شروع کردی۔ لیکن وہ وفاپرست اپنے گھر کو خاکستر کر کے جنگلوں میں روپوش ہوگیا، لیکن پھر وہ زندہ نہ بچ سکا اور کوروتی مختلف حالات سے گزرتی ہوئی پہلے شمشیر سنگھ اور پھر ڈینئل مارکو کے ہاتھ لگ گئی۔ شمشیر سنگھ نے اس کی جنم کنڈلی اڑالی اور واپس ہندوستان کا رخ کیا اور بہت دن تک جنم کنڈلی کا راز کھولنے میں لگا رہا۔ ادھر مول چند جیل سے رہا ہوگیا اور اس نے اپنی ایک جاگیر میں اپنے لیے ایک کوٹھی بنوالی، لیکن کوروتی اسے نہ مل سکی۔ کنور شمشیر سنگھ کو جب کنڈلی سے خزانے کا راز ملا تو اس نے خزانے کے حصول کے لیے کوششیں شروع کردیں اور جب وہ خزانے کی جگہ پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ خزانہ وہاں سے نکالا جاچکا ہے اور ظاہر ہے خزانہ مول چند کے علاوہ اور کون نکال سکتا تھا۔

کنور شمشیر کی ساری کوششیں بیکار ہوگئی تھیں وہ پریشان ہوگیا، بقول اس کے اس نے اپنی ساری پونجی داؤ پر لگادی تھی اور اس کے پاس کچھ نہیں رہا تھا جو لوگ اس چکر میں سرگرداں تھے ان میں گرو داس بھی تھا، لیکن اسے بھی اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا، پھر کنور شمشیر بڑی چالاکی سے مول چند سے ملا اور اس نے کوروتی کی جنم کنڈلی اس کے حوالے کر کے اسے بتایا کہ یہ کسی نے اسے دی تھی۔ مول چند نے اس پیشکش کی کہ اگر وہ کوروتی کو تلاش کرلے تو وہ اسے اتنی دولت دے گا کہ اس کے بال بچے تک عیش کریں گے، اب کنور شمشیر سخت افسردہ تھا کہ اس نے کوروتی کو ایسے کیوں چھوڑ دیا، اس نے کوروتی کو تلاش کیا وہ تو اسے دوبارہ نہ مل سکی لیکن اس نے ایک اور ترکیب سوچ لی، وہ یہ کہ کسی اور کو کوروتی بنا کر مول چند کے سامنے پیش کردیا جائے اور اس پاپی نے مجھے اس کے لیے تیار کیا اس نے مجھے ساری پٹیاں پڑھائیں کہ کس طرح میں مول چند سے ملوں گی، بھرت چند کے بارے میں بتاؤں گی، شاید اسی لیے اس نے مجھے یہ ساری کہانی بھی سنادی تھی کہ میں اپنا کردار سمجھ لوں، ورنہ مجھے اصل کہانی بھی نہ سناتا، بہرحال اس کے بعد وہ مجھے لے کر چل پڑا، مگر اس کے فرشتوں کو بھی یہ بات معلوم نہیں تھی کہ گرو داس بھی اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے، ہم سندر گڑھی جانے کے لیے یہاں پھول نگر آئے تھے کہ گرو داس کے آدمیوں نے ہمیں گرفتار کرلیا، مگر گرو داس کو ساری بات نہیں معلوم تھی۔ وہ بدستور جنم کنڈلی کے چکر میں پڑا ہوا تھا، اسی کے سلسلے میں اس نے شمشیر سنگھ کی خوب پٹائی بھی کی اور اس سے پوچھا کہ جنم کنڈلی کوروتی کے گلے سے اتار کر اس نے کہاں چھپائی ہے، شمشیر سنگھ کو افسوس تھا کہ اس نے جنم کنڈلی مول چند کے حوالے کردی اگر وہ ہوتی تو اسے گرو داس کو دے کر وہ اپنی جان بچالیتا کیونکہ اب جنم کنڈلی ایک بیکار چیز تھی، بہرحال کوشش میں لگا رہا اور پھر اس نے گرو داس کے ایک ملازم شیام کو توڑ لیا اور اس نے ہمارے فرار کا بندوبست کردیا ہم یہاں سے نکل آئے لیکن زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ دوبارہ گرفتار ہوگئے، پھر تم سے قید خانے میں ملاقات ہوئی اور بعد کی کہانی تمہیں خود معلوم ہے۔"

شیری خاموش ہوگئی، شاہ زیب نے سر پکڑ لیا تھا، 'عجیب کہانی تھی، کتنی پیچیدہ، کیسی الجھی ہوئی، بہرحال میرا اس سے کیا تعلق تھا، البتہ یہ سوچنا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ اس بات کا اندازہ بھی ہورہا تھا کہ شمشیر سنگھ کہاں گیا ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ سیدھا مول چند کے پاس گیا ہوگا اور اس نے کوروتی کو اس کے باپ کے سامنے پیش کردیا ہوگا، بہرحال ایک بات تو سکون بخش تھی کہ کوروتی بالآخر اپنوں میں پہنچ گئی، لیکن خاتون شیری، ارے باپ رے، اب یہ کہیں میرے گلے پڑنے کی کوشش نہ کرے۔' شاہ زیب نے سوچا اور خوفزدہ نگاہوں سے شیری کی طرف دیکھا۔ وہ گردن جھکائے کسی سوچ میں گم تھی، شاہ زیب نے کہا۔

''بڑی دکھ بھری کہانی ہے شیری؟''
''اب میرا کیا ہوگا؟'' وہ روتے ہوئے بولی۔
''میری بات مانو گی شیری؟''
''کہو۔''
''تم اپنے چاچا چاچی کے پاس چلی جاؤ۔''
''مرتے دم تک نہیں جاؤں گی، میرے چلے آنے سے ان کی کم بدنامی ہوئی ہوگی، وہ لوگ پہلے ہی مجھ سے جلتے تھے۔ اب تو مجھے بھون کر کھا جائیں گے۔''
''تو تم وہاں نہیں جاؤ گی۔؟''
''کہا نا کبھی نہیں۔''
''ہوں چلو، یہاں سے تو چلو۔ تم نے تو اپنے چہرے سے یہ خول اتار پھینکا ہے، مگر میرا یہ چہرہ میرا بدترین دشمن ہے۔ یہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔''
''کیا مطلب؟'' شیری نے پوچھا۔
''گرو داس کے آدمی ہماری تلاش ترک نہیں کریں گے، تم تو اس لیے بچ جاؤ گی کہ تم کوروتی نہیں ہو لیکن میرے چہرے پر کوئی خول نہیں ہے اور میں ضرور پکڑا جاؤں گا۔''
''ہائے رام یہ بات تو ہے۔'' شیری نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔
''چلو یہاں سے تو چلو۔'' شاہ زیب نے کہا اور یہ لوگ وہاں سے چل پڑے، کوئی منزل نہیں تھی کسی راستے کا تعین نہیں تھا، پھر ایک جگہ سے ان لوگوں نے ندی پار کی زیادہ گہری نہیں تھی ندی پار کرنے کے بعد سیدھے سفر کرتے رہے اور پھر ایک ڈھلان پر ایک بستی نظر آ گئی، شاہ زیب نے شیری سے مشورہ کیا تو اس نے بھی یہی خیال کیا کہ یہ بستی رجنی ہے۔ بستی رجنی میں داخل ہو کر کھانے پینے کی سہولتیں مہیا ہو گئیں اور قیام کے لیے سرائے بھی مل گئی، لیکن سرائے کی پہلی رات شاہ زیب کے لیے تشویش کی رات تھی۔
کھانے پینے سے فارغ ہو کر یہ لوگ آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے، شیری کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی، تب اس نے کہا۔
''ایک بات پوچھوں۔''
''ہاں شیری پوچھو۔''
''تم کون ہو اور کوروتی سے تمہارا کیا تعلق تھا؟''
شیری کے اس سوال پر شاہ زیب چونک پڑا، شاہ زیب کے بارے میں اس کا اتنا تجسس خطرناک بھی ہو سکتا تھا چنانچہ شاہ زیب نے سنبھل کر کہا۔
''میرا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ اس نے مجھے صرف اس مقصد کے تحت حاصل کیا تھا کہ میں اسے اس کے گھر تک پہنچا دوں۔ وہ اپنے گھر کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی اور میں اس کے لیے کام کر رہا تھا، جس کا اس نے مجھے معقول معاوضہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔''
''دیکھو، کتنی خود غرض ہے یہ دنیا، وہ بھی تمہیں چھوڑ کر فرار ہو گئی۔''
''ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے، یہ سب تقدیر کی باتیں ہیں۔''
''میرا کیا ہوگا رمیش، ایک انسان ہونے کے ناتے میرے بارے میں بھی سوچو۔''
''میں بھلا کیا سوچ سکتا ہوں شیری، میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات آئی تھی اور وہ یہ کہ تم اپنے چاچا چاچی کے پاس چلی جاؤ، لیکن تم کہتی ہو کہ تمہارا ان کے پاس جانا خطرناک ہوگا، تو اب اس کے بعد میں کیا کہہ سکتا ہوں۔؟''

"میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گی رمیش، میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گی، کیا تم شادی شدہ ہو؟" اس نے عجیب سی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں، اس نے سنبھل کر ایک سرد آہ بھری اور آہستہ سے بولا۔

"ہاں.... میری پہلی شادی میرے ماتا پتا نے کی تھی، ایک موٹی بھدی اور جھگڑالو عورت سے، جس کے ساتھ رہتے ہوئے میری آدمی زندگی برباد ہوگئی، اس نے مجھے سزا کے طور پر چھ بچوں کا باپ بنا دیا، پھر میں نے دوسری شادی اپنی مرضی سے کی اور میرا تجربہ اس سلسلے میں بھی بہت بھیانک نکلا۔ میری اپنی پسند کی شادی بھی ناکام ہوگئی اور مزید پانچ بچے میری تقدیر میں لکھے گئے۔ اب میں گیارہ بچوں اور دو بیویوں کا شوہر ہوں۔ دونوں ساتھ ساتھ رہتی ہیں اور میں کوشش کرتا ہوں کہ گھر سے بھاگا رہوں، ایسے ہی کام تلاش کرتا ہوں جن میں مجھے ان سے دور رہنا پڑے، تم بتاؤ شیری ایک ایسے آدمی کی زندگی کیا حیثیت رکھتی ہے جس کے دائیں طرف ایک موٹی بھدی جھگڑالو عورت کھڑی ہو اور دوسری طرف ایک اور خوفناک عورت، ایک کے ہاتھ میں بیلن ہو اور دوسری کے ہاتھ میں جھاڑو اور دونوں کا نشانہ میں ہی ہوں، گیارہ بچوں کی تالیاں گھر کے چاروں کونوں میں ابھریں... ان حالات میں تم خود ہی سوچو میری کیا کیفیت ہوگی؟"

شاہ زیب کا خیال تھا کہ شیری یہ سب سن کر ہنس پڑے گی، لیکن وہ رحم آمیز نظروں سے شاہ زیب کی طرف دیکھ رہی تھی، پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"تو پھر تم اس نرکھ سے نکل کیوں نہیں آتے رمیش، میں تمہارے دل سے وہ سب کچھ بھلا دوں گی جو ان دونوں نے تمہارے دل میں پیدا کر دیا ہے، میں جیون بھر تمہاری سیوا کروں گی اور تمہیں کبھی تکلیف نہ ہونے دوں گی۔"

شاہ زیب نے تھوک نگلتے ہوئے شیری کو دیکھا اور بولا "مجھے سوچنے کا موقع دو شیری، غور کرنے کا موقع دو۔" شاہ زیب کو سوچنے کا موقع دینے سے پہلے ہی شیری اپنا داؤ پکا کر لینا چاہتی تھی، لیکن وہ اس کے ہر حملے سے بچتا رہا اور رات کے آخری پہر وہ تھک کر سو گئی۔ اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ شاہ زیب نے راتوں رات نہ صرف سرائے چھوڑی بلکہ بستی رجنی بھی چھوڑ دی۔

کوئی راستہ کوئی سمت ذہن میں نہیں تھی، شاہ زیب بس آوارہ گردوں کی مانند چلا جا رہا تھا، رات کا یہ آخری حصہ بھی ختم ہو گیا اور صبح تک وہ تھکن سے چور ہو گیا تھا۔ لیکن پھر خوش قسمتی سے ایک بس آتی ہوئی نظر آئی اور شاہ زیب اس میں سوار ہو گیا۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ بس کہاں جا رہی ہے، پھر جب شاہ زیب بس سے اترا تو اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ جگہ سندر گڑھی ہی ہے۔ وہی بستی جس کا نام لیا گیا تھا اور جو مول چند کی بستی تھی۔ مول چند کی بستی میں آ کر خواہ مخواہ ہی شاہ زیب کے ذہن میں تجسس پیدا ہو گیا تھا کہ کوروتی کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں، ویسے بھی کوروتی اب شاہ زیب کے لیے خطرناک نہیں تھی، اگر وہ اپنے باپ تک پہنچ گئی تو اس کی ذمے داری ختم، ظاہر ہے وہ شاہ زیب کو کیا خاطر میں لائے گی، وہ معلومات حاصل کرتا ہوا بالآخر مول چند کی حویلی کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں آ کر شاہ زیب نے کوروتی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ حویلی کے ایک حصے میں دیے روشن تھے جنہیں دن کی روشنی میں بجھا دیا جاتا تھا، جس شخص سے اُس نے معلومات حاصل کیں اس نے ان دیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ دیے رات کو پھر جل اٹھیں گے، سات دن تک ان میں گھی کے چراغ جلیں گے اور آج تو صرف تیسرا ہی دن ہے۔"

"وجہ؟"

"وجہ یہ کہ مول چند کی بیٹی کوروتی بہت عرصے تک گم رہنے کے بعد اسے ملی ہے۔"

شاہ زیب کا اندازہ درست نکلا تھا، کوروتی اپنے گھر پہنچ گئی تھی۔ گویا اب سندر گڑھی بھی رکنا بیکار تھا، دوپہر تک وہ سندر گڑھی میں چکرا تا رہا، دل میں بہت سے فیصلے کر رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے اور پھر جب وہ حویلی سے کافی دور ایک باغ کے نزدیک ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوا تھا تو چند گھڑ سوار اس کے قریب پہنچ گئے۔ انہوں نے گھوڑے روک

کر شاہ زیب کے نزدیک آتے ہوئے کہا۔
''مہاراج! آپ یہاں گھوم رہے ہیں اور وہاں پرانی حویلی میں مول چند آپ کا انتظار کر رہے ہیں''
''مم...میرا..''شاہ زیب نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔
''ہاں..ان کے پاس زیادہ سمے نہیں ہے، براہ کرم ہمارے ساتھ چلیے۔''
''لیکن بھائی.....''
''چلیے مہاراج، یہ گھوڑا حاضر ہے۔''ان میں سے ایک نے کہا اور کچھ اس طرح مجبور کیا کہ ان کے ساتھی جاتے ہی بن پڑی۔

پرانی حویلی وہ نہیں تھی جس میں شاہ زیب نے مول چند کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں، یہ ایک ٹوٹا پھوٹا کھنڈر تھا اور ٹوٹے پھوٹے کھنڈر کے ایک حصے میں مول چند نے شاہ زیب سے ملاقات کی، وہ ایک دراز قامت آدمی تھا۔ چہرے ہی سے سخت گیر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے شاہ زیب کو دیکھتے ہی سرد لہجے میں کہا۔

''کنور شمشیر سنگھ، میں نہیں چاہتا کہ اب تم ایک لمحہ بھی یہاں رکو، یہ سنبھالو اپنے حصے کی دولت اور یہاں سے فوراً روانہ ہو جاؤ، تمہارا گھوڑا تیار ہے اور ایک بات کان کھول کر سن لو کہ اب اگر تم راجپوتانہ کے نواح میں نظر آئے تو تمہاری زندگی ممکن نہیں ہوگی یہ مول چند کا قول ہے، لو یہ سنبھالو''

اس نے باقاعدہ ایک بوجھ شاہ زیب کے حوالے کر دیا، اس بوجھ کے کپڑے سے ہیرے کی چمک صاف نظر آ رہی تھی، یہ تھیلی اس کے ہاتھ میں تھمانے کے بعد مول چند نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ شاہ زیب کو سندر گڑھی کی سرحد کے پار چھوڑ آئیں اور وہ لوگ اسے لے کر چل پڑے۔ شاہ زیب اس خوفناک صورت حال پر غور کر رہا تھا، یقیناً یہ دولت اسے کنور شمشیر سنگھ کے دھوکے میں دی گئی تھی اور یہاں سے نکال دیا گیا تھا۔ اب تھوڑی دیر کے بعد اصل شمشیر سنگھ مول کے پاس پہنچے گا۔ ہاتھ آئی دولت کو بھلا کون ٹھکرائے، چنانچہ بہتر یہی تھا کہ وہ گھوڑے کو ایڑھ لگائی جائے اور اس وقت تک اس کی پٹائی کی جاتی رہے جب تک کہ وہ شاہ زیب کو یہاں سے اتنی دور نہ پہنچا دے کہ یہ لوگ اس کا نشان بھی نہ تلاش کر سکیں، چنانچہ شاہ زیب نے گھوڑے کی پیٹھ پر ایک سانٹا جمایا اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ تیز ہوائیں کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھیں، شاہ زیب عمدہ گھڑ سوار بھی نہیں تھا، چنانچہ گھوڑے کی پشت پر جمے رہنا مشکل ثابت ہو رہا تھا، جوش میں آ کر اور جلد از جلد دور نکل جانے کے تصور سے گھوڑے کو چابک لگا تو دیا تھا مگر لینے کے دینے پڑ گئے تھے، گھوڑا چابک کا برا مان گیا تھا اور شاہ زیب کی ہر خوشامد کو نظرانداز کر رہا تھا غالباً اسے اعتراض تھا کہ اس کے ساتھ یہ بدسلوکی کیوں کی گئی۔ بہرحال شاہ زیب خود کو جمائے رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

جانے کتنی دیر گزر گئی، پھر گھوڑے کی رفتار سست ہونے لگی اور وہ رک گیا، شاہ زیب نے ڈرتے ڈرتے گردن اٹھائی کہ کمبخت کی کوئی چال نہ ہو، اطراف میں ہرے بھرے میدان پھیلے ہوئے تھے۔ پس منظر میں سنگلاخ پہاڑ نظر آ رہے تھے اور بائیں سمت کچھ عمارتیں، کوئی چھوٹی سی بستی تھی۔ شاہ زیب نے وہ گٹھری سنبھالی جس میں تاریخی خزانے کا کافی بڑا حصہ تھا۔ جس کے لیے جانے کتنے لوگ کب سے سرگرداں تھے۔ پھر وہ بڑی مہارت سے گٹھری سمیت گھوڑے سے کود گیا، زمین پر قدم جمتے ہوئے اس نے گٹھری کھول کر دیکھا اور اس کی آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔ انتہائی قیمتی زیورات، سونے کے قدیم سکے اور جانے کیا کیا تھا۔ گٹھری کو اسی طرح باندھ کر سونے کے چند سکے نکال کر جیب میں رکھے اور پھر ایک مناسب جگہ تلاش کر کے وہاں جا بیٹھا۔

اس کا انگ انگ دکھ رہا تھا اور آرام کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی چنانچہ گٹھری سرہانے رکھ کر لیٹ گیا، دماغ میں خیالات کی یلغار ہو رہی تھی، پھر اس نے کچھ دیر کے لیے ذہن کو آزاد چھوڑ دینا مناسب سمجھا اور اسی طرح لیٹ گیا۔ یہ سب کچھ انتہائی برق رفتار تھا، صورت حال کا کافی حد تک اندازہ ہو گیا تھا، کنور شمشیر سنگھ نے مول چند کے پاس پہنچ کر کورو تی کو اس کے حوالے کیا ہوگا اور مول چند نے کورو تی کی بازیابی کے بعد یقیناً شمشیر سنگھ سے وعدہ کر لیا ہوگا کہ وہ

اس کی اس روایتی خزانے کا ایک حصہ بطور معاوضہ ادا کرے گا۔ ہو سکتا ہے کنور شمشیر سنگھ نے کوروتی پر جال ڈالنے کی کوشش کی ہو جس کا علم مول چند کو ہو گیا بعد اس کا رویہ یہی بتا تا تھا کہ وہ کنور کو دھمکی دے رہا ہے کہ اگر وہ خزانے کا یہ حصہ لے کر فوراً یہاں سے نہ چلا گیا تو اس کے ساتھ برا سلوک کیا جائے گا۔ اب یہ کنور شمشیر سنگھ کی بدقسمتی تھی اور شاہ زیب کی خوش قسمتی کہ اس کے بجائے شاہ زیب اتفاقیہ طور پر مول چند کے آدمیوں کے ہاتھ لگ گیا اور شمشیر سنگھ کا ہمشکل ہونے کی وجہ سے خزانہ شاہ زیب کے ہاتھ لگ گیا، اصل شمشیر سنگھ جب مول چند کے پاس اپنا حصہ وصول کرنے پہنچے گا تو مول چند اس کے ساتھ جو سلوک کرے گا اس کا اندازہ بخوبی ہو رہا تھا۔ شاہ زیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، حقیقت تو یہی تھی کہ اس خزانے کا حقدار کسی حد تک شاہ زیب ہی تھا کیونکہ کوروتی کے سلسلے میں جس قدر بھاگ دوڑ شاہ زیب کو کرنا پڑی تھی اسے وہی جانتا تھا، کنور شمشیر کی تقدیر میں یہ سب کچھ نہیں تھا جبکہ شاہ زیب کی تقدیر میں بہت کچھ لکھ دیا گیا تھا۔

بہر حال شاہ زیب ایک کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا اور گھر میں بھی روپے پیسے کی کمی نہیں تھی، لیکن ان حالات میں اتنا بڑا خزانہ مل جانے کا مطلب تھا کہ جہاں چاہتا عیش سے بس کر سکتا تھا۔

خزانے کو پوشیدہ رکھنا بھی بے حد ضروری تھا، سب سے عجیب بات یہ تھی کہ کہیں نہ کہیں اس کا کوئی نہ کوئی ہم شکل موجود ہوتا جو اس کے لیے زحمت ہی بن کر رہ جاتا تھا۔ بہر حال لیٹا رہا، نیند تو نہیں آسکی تھی لیکن کافی دیر تک ایک ہی انداز میں لیٹے رہنے سے جسمانی تھکن کسی قدر کم ہو گئی اور دکھتے ہوئے بدن کو کافی آرام ملا تھا۔ ایک گھنٹے تک وہ اسی طرح لیٹا رہا اس کے بعد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر گٹھری اٹھائی اور اسے ساتھ لیے ہوئے آبادی کی طرف چل پڑا۔ بہت چھوٹی سی پسماندہ بستی تھی اور وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ قیام کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں مل سکتی تھی۔ البتہ کوئی آدھے گھنٹے بستی میں گھومنے کے بعد جس جگہ پہنچا وہاں ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن موجود تھا۔

ریلوے اسٹیشن کی ایک چھوٹی سی عمارت بھی موجود تھی اور پٹریاں بھی بچھی ہوئی نظر آرہی تھیں، شاہ زیب اسٹیشن کی عمارت کے اندر داخل ہو گیا اور پھر ایک جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے ذہن میں یہی خیال تھا کہ اب ٹرین کا سفر اختیار کیا جائے۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ٹرین کے انجن کی آواز سنائی دینے لگی، غالباً کوئی ٹرین آرہی تھی، پھر تھوڑی دیر کے بعد ٹرین اس اسٹیشن پر رک گئی، اب یہ جستجو کرنا تو بیکار ہی تھی کہ ٹرین کہاں سے آئی ہے اور جا کہاں رہی ہے، کہیں بھی نکل جایا جائے چنانچہ شاہ زیب ٹرین پر چڑھ گیا، ایک ڈبے میں جگہ نظر آئی اور شاہ زیب وہیں جا بیٹھا۔

ڈبے میں تمام سیٹیں پُر تھیں۔ دھوتی اور کرتے میں ملبوس ایک شخص نے ازراہ ہمدردی شاہ زیب کو اپنے پاس جگہ دے دی اور اس نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے گٹھری نہایت بے پروائی سے سیٹ کے نیچے اپنے پیروں کے پاس سرکالی۔ بھاری بھرکم آدمی خوش اخلاق معلوم ہوتا تھا، تھوڑی دیر کے بعد اس نے شاہ زیب سے اس سفر کے بارے میں پوچھا لیکن شاہ زیب اس کا جواب گول کر گیا اور خود اس سے پوچھ ڈالا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

''آگرہ اتروں گا، یہ گاڑی تو آگے چلی جائے گی مگر میں آگرے میں ہی رہتا ہوں۔''

''گڈ... گڈ...'' شاہ زیب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا ''آپ آگرے میں کیا کرتے ہیں؟''

''سنار ہوں بھیا جی! یہاں اپنی بیٹی کے پاس آیا تھا۔ وہ یہیں رہتی ہے۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''بڑی دلچسپ بات ہے کہ آپ جوہری ہیں، میں بھی آگرے جا رہا ہوں، کچھ کام ہے مجھے وہاں اور پھر مجھے اپنے دادا جی کے دیے ہوئے سونے کے یہ چار سکے بھی فروخت کرنے ہیں، دادا جی نے خاص طور سے ہدایت کی تھی۔''

''سونے کے سکے ذرا دکھاؤ تو۔'' سنار نے کہا اور شاہ زیب نے جیب سے ایک سکہ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ سنار اسے آنکھوں کے قریب کر کے دیکھنے لگا پھر اس نے اسے ہتھیلی پر گھس کر دیکھا اور گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''کھرا سونا ہے، آسانی سے بک جائے گا، ویسے چار سکے نہیں تم چاہو تو دو سکوں کے پیسے یہیں لے لو۔''

شاہ زیب بغیر ٹکٹ ریل میں سفر کر رہا تھا، پیسے نہ ہونے کی وجہ سے، ویسے ایسے واقعات دلچسپ ہوتے ہیں۔ جانے کتنی مالیت کا سونا میرے ساتھ تھا، لیکن ٹرین کا ٹکٹ لینے کے لیے پیسے نہیں تھے، یہ کام خوش قسمتی سے یہیں ہو گیا

اور جب ٹکٹ چیکر آیا تو اس نے بڑے اطمینان سے اسے نوٹ دیتے ہوئے کہا کہ پہلے ٹکٹ نہیں بنوا سکا۔ ٹکٹ چیکر نے وہیں اُسے ٹکٹ بنا کر دے دیا تھا، اس طرح یہ مشکل بھی حل ہو گئی اور یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ نئی منزل آگرہ ہے۔

سفر ختم ہوا اور یہ لوگ آگرے کے ریلوے اسٹیشن پر اتر گئے، یہاں وہ سنار شاہ زیب سے رخصت ہو گیا اور شاہ زیب ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے، آگرہ تاریخی مقام تھا اور یہاں کچھ عرصہ رہا جا سکتا تھا۔ شاہ زیب نے ایک سائیکل رکشہ کا انتخاب کیا اور کسی ایسے ہوٹل چلنے کے لیے کہا جہاں قیام کیا جا سکے۔ شاہ زیب نے اپنی شخصیت بالکل ہی تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ رکشہ ڈرائیور نے شاہ زیب کو ایک ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ شاہ زیب نے ہوٹل میں کمرہ حاصل کرتے وقت ہوٹل کے رجسٹر میں اپنا نام نندراج لکھوایا تھا۔ اس ہوٹل میں کوئی خوبی نہیں تھی، لیکن ایسی ہی جگہ اس کے لیے محفوظ ہو سکتی تھی، شاہ زیب نے اس گٹھری کو سنبھال کر ایک جگہ رکھا اور منہ ہاتھ وغیرہ دھو کر آرام کرنے لیٹ گیا۔

جاگا تو شام ہو گئی تھی، ایک بار پھر اٹھ کر منہ ہاتھ وغیرہ دھویا اور آئندہ پروگرام کے بارے میں سوچنے لگا۔ زندگی کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا، نہ کہیں جانا نہ آنا، کوروتی کا کھیل ختم ہو گیا تھا وہ اپنے باپ کے پاس پہنچ گئی تھی اور سارے مسئلے حل ہو گئے تھے، ہاں اب اگر کوئی شاہ زیب کا دشمن ہو سکتا تھا تو وہ کنور شمشیر سنگھ تھا کیونکہ اسے شاہ زیب کے ہاتھوں چوٹ پہنچی تھی، لیکن اس کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں ہو گی کہ شاہ زیب وہاں پہنچ گیا ہے۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے اس کے کسی گوشے میں جا کر کچھ دن گزارنا ایک معمولی بات تھی چنانچہ شاہ زیب خود کو بڑا پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ پھر اس نے بازار سے عمدہ قسم کا ایک سوٹ خریدا اور کچھ ایسی ہی چیزیں جو اس کی ضرورت میں کام آ سکتی تھیں۔ پھر وہ ہوٹل کے کمرے میں محدود ہو گیا تھا، جو دو سکے فروخت کیے تھے ان کی رقم ہی اتنی مل گئی تھی کہ سارے کام ہو گئے تھے، دوبارہ اس سنار کی دکان کا رخ نہیں کیا کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے، بعد میں جو ہو گا دیکھا جائے گا، پھر شاہ زیب نے مزید چار سکے ایک اور جوہری کو فروخت کیے اور اب اس کے پاس اچھی خاصی رقم آ گئی تھی۔ ایک دن مزید ہوٹل میں گزارا گیا اور اس کے بعد وہ گھومنے کی غرض سے نکل گیا۔ اس کا رخ تاج محل کی طرف تھا۔

زمانہ قدیم کی یہ حسین یادگار آج بھی اپنی تمام روایتوں کے ساتھ دنیا کے سامنے تھی، کیسے کیسے عجیب لوگ تھے۔ ایک دوسرے کی محبت میں دیوانے ہو جاتے تھے۔ شاید زندگی کے دوسرے مسائل ان سے دور رہتے ہوں گے۔ شاہ جہاں نے ممتاز محل سے عشق کیا اپنی پسند کے مطابق تاج محل تعمیر کرا دیا۔ اگر وہ بھی ہم شکلوں کے بیچ پھنس جاتا تو تاج محل کا وجود اس کائنات میں نہ ہوتا، سیاحوں کی ٹولیاں ادھر اُدھر گردش کر رہی تھیں، نوادرات کی دکانیں سجی ہوئی تھیں، تاج محل کے چھوٹے بڑے ماڈل برائے فروخت رکھے ہوئے تھے اور جانے کیا کیا چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

فوٹو گرافر تاج محل کے ہر حصے کی تصویر بنانے کے لیے مستعد تھے اور ہر شخص سے اس بارے میں سوالات کر رہے تھے۔ شاہ جہاں کے مقبرے میں ایک مؤذن آواز کے کرشمے دکھانے کے لیے مستعد کھڑا ہوا تھا، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ وہاں پر اذان دیتا جس کی آواز تاج محل کے بے شمار گوشوں میں پہنچ جاتی تھی۔ شاہ جہاں اور ممتاز محل کی اصل قبریں نیچے تہہ خانے میں تھیں، اوپر ان کی نقل بنائی گئی تھی۔ شاہ زیب تاج محل کے اس حصے کی جانب چل پڑا جہاں سے جمنا بہتی نظر آتی تھی۔ اس طرف زیادہ لوگ نہیں تھے، نیچے گہرائیوں میں جمنا بہہ رہی تھی، اس عمارت کا حسن اپنی روایتوں کے ساتھ عجیب ہی کیفیت رکھتا تھا، دیر تک اس جگہ کھڑا جمنا کا نظارہ کرتا رہا۔ آس پاس کوئی موجود نہیں تھا، یہ راہداری آگے جا کر ختم ہو جاتی تھی اور اس طرف کا گوشہ سنسان پڑا ہوا تھا۔

اچانک ہی ایک عجیب سی روشنی کا احساس ہوا، یہ روشنی شاہ زیب پر پڑی تھی اور اس کی نگاہیں بے اختیار اپنی داہنی سمت گھوم گئیں۔ اس جگہ جہاں تھوڑی دیر پہلے کوئی نہیں تھا ایک خوش لباس عورت نظر آئی جو بلند قامت تھی اس کے ہاتھ میں کیمرہ دبا ہوا تھا اور یقیناً یہ اس کیمرے کی روشنی ہی تھی جو دن کی وجہ سے بہت زیادہ محسوس نہیں ہوئی تھی، مگر یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ کوئی چیز چمکی ہے۔ عورت نے کیمرہ نیچے کیا اور بے پروائی سے شاہ زیب کے نزدیک سے گزر گئی، لیکن

شاہ زیب کے دل میں ایک عجیب سا احساس جاگزیں ہو گیا تھا، اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے واقعی اس کی تصویر اتاری گئی ہو، ویسے تو سیاح تاج محل کے گوشے گوشے کی تصاویر لے رہے تھے شاید تصاویر لینے پر پابندی بھی عائد کر دی گئی ہے، لیکن یہ پابندی غیر ملکی سیاحوں کے لیے نہیں ہے یا ہو گی اس کا اندازہ نہیں تھا۔ یہ تصویر تاج محل کے کسی گوشے کی نہیں لی گئی تھی کیونکہ پوری طرح فلیش لائٹ شاہ زیب پر پڑی تھی۔ پھر شاہ زیب نے خیال کیا کہ ہو سکتا ہے اس خاتون کو شاہ زیب کا یہ پوز پسند آ گیا ہو اور انہوں نے بہتی ہوئی جمنا کے ساتھ ساتھ اس کی تصویر بھی لے لی ہو۔ یہ کوئی ایسی خاص بات بھی نہیں تھی لیکن جانے کیوں اس کے ذہن میں چبھتی رہی۔ خاتون بھی کچھ عجیب وغریب خدوخال کی مالک تھیں۔ مغربی لباس تھا لیکن چہرے کے نقوش خالص مغربی نہیں کہے جا سکتے تھے۔ رنگ انگریزوں کی مانند تھا لیکن انگریزوں جیسی کھردراہٹ چہرے پر نہیں تھی بلکہ اس میں ایک انوکھی سی ملاحت تھی جسے کوئی تشبیہ نہیں دی جا سکتی تھی۔ خدوخال سے خاصی حسین عورت تھی اور عمر کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ تیس سے لے کر پینتالیس سال تک کوئی بھی عمر تعین کی جا سکتی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر شاہ زیب کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور شاہ زیب شانے جھٹک کر پھر جمنا کی جانب متوجہ ہو گیا، یہ بات قابل غور نہیں تھی جس پر مسلسل توجہ دی جاتی۔

پھر شاہ زیب تاج محل سے نکل کر اپنے ہوٹل پہنچ گیا۔ پھر یہیں سے اس نے فتح پور سیکری کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور فتح پور سیکری روانہ ہو گیا۔

فتح پور سیکری میں شاہ زیب نے بلند دروازہ دیکھا جو بلاشبہ عظیم تھا۔ وہ عظیم الشان مسجد بھی دیکھی جس میں خواجہ سلیم الدین چشتی کی درگاہ مبارک تھی، اس کے بعد رانی جودھا بائی کے محل کی جانب آ گیا۔ شاہ زیب یہاں آ کر مغلوں کی تاریخ میں کھو گیا اور اسے اپنے اطراف ہلکی ہلکی سرسراہٹیں سنائی دینے لگیں، دور مغلیہ نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا۔ باادب باملاحظہ کی آوازیں سرگوشیوں کے انداز میں کانوں میں ابھرنے لگی تھیں۔ ایک عجیب سا سحر ذہن و دل پر طاری ہو گیا۔ اچانک ایک تیز آواز سنائی دی اور شاہ زیب چونک اٹھا۔ اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے پلٹ کر دیکھا اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔ آواز ایک پتھر کے لڑھکنے سے پیدا ہوئی تھی اور پتھر کسی سیاح کی ٹھوکر سے اپنی جگہ سے ہٹا تھا۔

شاہ زیب کو دو پاؤں نظر آئے جو سیڑھیاں اتر رہے تھے یہ سیڑھیاں ایک تنگ دروازے کی شکل میں تھیں اور نیچے آنے والے کا چہرہ اسی وقت دیکھا جا سکتا تھا جب وہ نیچے آ جائے۔ کوئی جھک کر آخری سیڑھی اترنے کے بعد باہر نکلا اور شاہ زیب کی آنکھیں اسے دیکھتی رہ گئیں۔ شاہ زیب نے ایک لمحے میں اسے پہچان لیا۔ یہ وہی سیاح عورت تھی جس نے تاج محل میں شاہ زیب کی تصویر اتاری تھی۔ اس نے بھی ٹھٹک کر شاہ زیب کو دیکھا، اس کی آنکھیں شاہ زیب کا جائزہ لیتی رہیں پھر وہ سپاٹ چہرہ لیے آگے بڑھ گئی۔ شاہ زیب سحر زدہ سا ہو گیا تھا، یہ سب کیا ہے، اس عورت کا چہرہ بلاشبہ حسین تھا، لیکن اس کے خدوخال میں ایک ایسی بات تھی جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال اس کے بعد دوبارہ اس سے سامنا نہیں ہوا اور شاہ زیب نے اسے ذہن سے نکال پھینکا۔ پھر وہ فتح پور سیکری کے مختلف علاقے دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ شاہ زیب نے مزید دو دن وہاں قیام کیا اور اس کے بعد ممبئی روانہ ہو گیا۔ ممبئی عالمی شہر اور ہندوستان کی فلمی زندگی کا مرکز، شاہ زیب نے سوچا بھی نہیں تھا کہ

اس طرح وہ ممبئی آئے گا اور فلمی ستاروں کی اس دنیا میں خود گھومے پھرے گا۔ ریلوے اسٹیشن پر ہی ممبئی کے ہوٹلوں کے بارے میں تفصیلات معلوم ہو گئی تھیں اور شاہ زیب نے ایک عمدہ سے ہوٹل کا انتخاب کر لیا۔ ہوٹل میں داخل ہونے کے بعد یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ ہندوستان کے کس شہر میں ہے، کچھ دیر آرام کیا اور رات کو ایک انتہائی اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں پروگرام دیکھنے گیا، کچھ رقاصائیں اور چند مقامی فنکار اسٹیج شو پیش کر رہے تھے جس کا اہتمام ایک ہوٹل نے کیا تھا اور کافی پبلسٹی کی گئی تھی۔ ایک ایک میز پر چار چار افراد کے لیے گنجائش رکھی گئی تھی۔

شاہ زیب جس میز پر بیٹھا اس پر صرف ایک فرد آیا ہوا تھا۔ باقی دو سیٹیں خالی تھیں، لیکن ان پر ریزرویشن کے کارڈ لگے ہوئے تھے، اسٹیج پر تیز روشنیوں میں آرکسٹرا مدھم موسیقی بکھیر رہا تھا۔ ابھی پروگرام شروع نہیں ہوا تھا شاہ زیب کی

نگاہیں اطراف میں بھٹکنے لگیں۔ ممبئی سے متعلق جتنی روایتیں تھیں وہ سب کی سب یہاں زندہ تھیں، مختلف صوبوں کے لوگ مختلف چہرے لیے سامنے تھے، شاہ زیب ان کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس نے اپنی کرسی ہلکی سی گھمائی اور اپنے عقب میں دیکھنے لگا۔ شاہ زیب کے بالکل برابر والی میز پر بھی تین سیٹیں خالی تھیں اور صرف ایک خاتون اس میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ شاہ زیب نے یونہی سرسرے انداز میں جائزہ لیا تو اس کے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا اور وہ ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔

یہ چہرہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا، یہ وہی سیاح عورت تھی جس سے دوبار پہلے بھی ملاقات ہو چکی تھی، وہ اس وقت بھی شاہ زیب کی طرف ہی دیکھ رہی تھی اور وہ اپنے جھنجھناتے ذہن پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ 'کیا یہ صرف اتفاق ہے، کیا اب بھی اسے اتفاق قرار دیا جا سکتا ہے' اس نے سوچا اور جرأت سے کام لے کر اٹھ گیا۔ شاہ زیب کا رخ اسی کی میز کی جانب تھا، اب اس حقیقت کی نقاب کشائی ہو جانی چاہیئے۔ اس کی مدھم لیکن گونج دار آواز سنائی دی۔

''بیٹھ جائیے پلیز۔''

شاہ زیب ایک لمحے کے لیے جھجکا، لیکن کرسی سرکا کر بیٹھ گیا۔ اب جب یہاں تک آ ہی گیا تھا تو باقی مراحل بھی طے ہو جانے چاہیے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ شاہ زیب کو اس طرح سامنے دیکھ کر اس کے انداز میں کوئی تبدیلی پیدا ہو گی یا وہ اس کی آمد کو بہت اچھے انداز میں نہیں لے گی کیونکہ پہلی ملاقاتوں میں اس نے شاہ زیب کو دیکھنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ شاہ زیب نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ بالکل پُرسکون تھی۔ چند لمحات کے بعد شاہ زیب اس کے قریب آنے کی وجہ بھی بھول گیا۔

''کیا پئیں گے آپ؟'' اس نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

''شکریہ... کچھ نہیں۔''

''کیا خدمت کر سکتی ہوں آپ کی؟'' اس نے سوال کیا۔ اب شاہ زیب کے لیے خاموش رہنا ناممکن تھا اس نے اپنا حلق صاف کیا اور آہستہ سے بولا۔

''شاید آپ کو یہ احساس ہو کہ یہ ہماری پہلی ملاقات نہیں ہے۔''

''یہاں آپ نے لفظ احساس کا استعمال غلط کیا ہے، مجھے یقین ہے بلکہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ پہلے بھی ہماری ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں اور یقینی طور پر آپ اسے ایک دلچسپ اتفاق سمجھ رہے ہوں گے۔''

''بدقسمتی سے میرے ذہن میں تجسس کا مادہ بہت زیادہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں بے چین ہو کر آپ کے سامنے آ گیا۔''

''آپ اسے تجسس کہہ لیں، لیکن میں کچھ اور سمجھتی ہوں۔'' اس نے پُراعتماد مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

شاہ زیب اس پُراسرار عورت پر غور کر رہا تھا لیکن کچھ نہ بول سکا وہ بھی خاموشی سے شاہ زیب کی صورت دیکھتی رہی، اس نے پھر کہا۔

''میں آپ کا تجزیہ کر رہی ہوں آپ مجھے مسلسل اپنے ساتھ دیکھ رہے ہوں گے۔''

''ہاں میں اسے اتفاق ہی سمجھ رہا ہوں۔''

''نہیں... یہ اتفاق نہیں ہے میں آپ کا تعاقب کر رہی ہوں۔'' اس نے نہایت صاف گوئی سے کام لے کر کہا۔

''اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''دنیا کا کوئی کام بھی بے مقصد نہیں ہوتا۔''

''میں یہ مقصد جاننا چاہتا ہوں۔''

''بے شمار باتیں اپنے وقت پر سامنے آ جاتی ہیں، وقت سے پہلے انہیں نہیں جانا جا سکتا۔''

''گویا آپ یہ بتانے پر آمادہ نہیں ہیں کہ آپ میرا تعاقب کیوں کر رہی ہیں؟'' شاہ زیب ہمت کر کے بولا۔ وہ بڑی پُراعتماد تھی چنانچہ اس نے اسی ٹھوس انداز میں کہا۔

''نہیں۔''

اب شاہ زیب کے پاس کوئی اور سوال نہیں تھا اور وہ احمقوں کی طرح اس کے سامنے بیٹھا رہا۔ وہ مسکراتی رہی شاہ زیب کے ذہن میں اس کے لیے حیرت پیدا ہوگئی تھی، چند لمحے اس نے سوچتے رہنے کے بعد کہا۔

''لیکن آپ آخر مجھ سے چاہتی کیا ہیں، میرا مطلب ہے میں آپ کے کس کام آسکتا ہوں؟''

''فی الحال اگر آپ چاہیں تو میرے دوست بن سکتے ہیں، بہت سی باتیں چند لمحات میں نہیں سمجھائی جاسکتیں، اتنا میں آپ کو بتادوں کہ میرے دوست بن کر آپ فائدے میں رہیں گے۔''

''چلیے ٹھیک ہے، میں یہ بات تسلیم بھی کرلوں کہ کسی طرح آپ میری شخصیت سے واقف ہوگئی ہیں، لیکن آپ کا دوست ہو کر میں آپ کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہوں۔''

''دوستوں کو فائدے یا نقصان کے لیے منتخب نہیں کیا جاتا، بس بعض اوقات جی چاہتا ہے کہ کسی سے دوستی کرلی جائے۔ اب اس کے نفع اور نقصان کا مسئلہ تو بعد میں سامنے آتا ہے۔''

''بے مقصد دوستی کسی سے نہیں کی جاتی۔''

''میں نے کب کہا بلکہ میں نے تو یہ اعتراف بھی کیا کہ میں جوہر شناس ہوں اور میں نے تمہاری شخصیت میں وہ چیزیں تلاش کرلی ہیں جو میرے لیے کارآمد ہوسکتی ہیں۔''

''آپ کی دوستی قبول کرکے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟''

''آپ بار بار یہی سوال دہرا رہے ہیں، میں نے کہا نا فائدہ یا نقصان تو بعد ہی میں سامنے آتا ہے یہ بتائیے آپ میری دوستی قبول کرنا پسند کریں گے یا نہیں؟''

''فرض کیجیے میں ہاں کہہ دوں تو؟''

''تو پھر میں آپ سے آپ کے بارے میں بھی پوچھوں گی کہ آپ کون ہیں؟ آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟'' اس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور اس کے جواب میں آپ مجھے اپنے بارے میں بتائیں گی؟''

''اس حد تک جہاں تک مناسب ہو۔''

''گویا حدود کا تعین کیا جائے گا۔'' شاہ زیب نے خود کو سنبھال کر کہا۔

''ہاں.. حدود ہر حال میں قائم رہنی چاہیے ہیں، ورنہ نقصانات بھی ہوجاتے ہیں۔ آپ مجھے بتائیے آپ کون ہیں، کیا کرتے ہیں؟''

''میرا نام شاہ زیب ہے اور میں صرف آوارہ گرد ہوں۔''

''تعلق کہاں سے ہے؟''

''آپ ساری دنیا سے میرا تعلق سمجھ سکتی ہیں کیونکہ اب تو میں اپنی اصل جگہ ذہن سے فراموش کرچکا ہوں۔''

''اب تک کون کون سے ممالک گھومے ہیں آپ نے؟''

''بے شمار۔'' شاہ زیب نے مختصراً جواب دیا۔

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر، اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں آپ کو بھی مجھ سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔'' اس نے جواب دیا۔

''اب میں یہی سوال آپ سے کرتا ہوں میڈم؟'' شاہ زیب نے کہا۔ ویسے یہ عورت واقعی بہت پراسرار تھی، لیکن وقت گزاری کے لیے شاہ زیب نے اس سے دوستی کا فیصلہ کرلیا تھا۔

(زندگی کے پیچیدہ راستوں میں اپنے ہم شکلوں کی کھوج میں نکلے، شاہ زیب کی اگلی منزل کیا ہوگی......؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے۔)

گردِ صحرا ہوں بس!

دستگیر شہزاد

نفس کی پیاس بجھاتی، خود اس میں بھسم ہوجانے والی دوشیزہ کی کتھا، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے

''ثمرین تم کسی پریشانی یا مصیبت میں ہو جو تم نے مجھے سانس بھی لینے نہیں دیا اور یہاں گھسیٹ لائیں۔ بتاؤ کیا بات ہے؟'' رخسانہ نے کمرے میں قدم رکھتے ہی ایک دم چڑ کر پوچھا۔

''پریشانی اور مصیبت میں میں، میں نہیں تم ہو'' ثمرین نے تڑخ کر جواب دے کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور ایک سی ڈی پلیئر میں لگا کر ویڈیو سسٹم چالو کر کے کہا۔

''دیکھو پریشانی کی ماں، مصیبت نے تمہیں کس بری طرح گھیر رکھا ہے۔''

سی ڈی پلیئر پر آن ہوتے ہی جو مناظر چلنے لگے تھے، انہیں دیکھ کر رخسانہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے یا پھر آسمان ٹوٹ کر گر پڑے اور یہ دنیا ختم ہو جائے۔ اسکرین پر وہ مونس کے ساتھ انتہائی شرم ناک حالت میں نظر آرہی تھی۔ کپڑوں سے بے نیاز دونوں ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ آج کے بعد دوبارہ زندگی نہیں یا اس زندگی کے بعد انہیں موت نہیں۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ایک جان دو قالب کی مصداق معلوم ہو رہے تھے۔

رخسانہ نے اپنی زندگی کا ہولناک منظر دیکھا تو دونوں ہاتھوں سے منہ کو چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اب آنکھیں کیوں بند کر لیں؟ کس بات پہ شرم آ رہی تمہیں...... لوٹو اور لوٹو زندگی کے مزے۔ تمہیں تو...... فلم بنواتے وقت تو خوب اٹھلا اور مسکرا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ تمہاری زندگی کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن اب کیا ہوا؟ لو دیکھ لو خوب اچھی طرح سے دیکھ لو۔ مونس کے ساتھ جو شرمناک کھیل کھیلتی رہی ہو۔ وہ سب کچھ اس سی ڈی میں موجود ہے۔ دیکھ لو تمہاری زندگی کی یادیں تازہ ہو جائیں گی۔''

''خدا کے واسطے اسے بند کر دو۔'' رخسانہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''اس سے آگے دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے، پلیز اسے یہیں روک دو۔'' ''ٹھیک ہے میں اس کو بند کر دیتی ہوں۔'' ثمرین نے کہا۔

''لیکن تم اس بلیک میلر کی زبان کیسے بند کرو گی۔ اس طرح تو وہ تمہیں رکھیل کی طرح استعمال کرے گا اور اس طرح کے مناظر تو روز نئے انداز میں سامنے آیا کریں گے۔'' ثمرین نے رخسانہ کہ کہنے پر سسٹم بند کر کے پلیئر سے سی ڈی نکال لی اور رخسانہ کے پاس آکر بیٹھ گئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے کہا۔

''میری جان سے زیادہ عزیز مجھے بتاؤ۔'' ثمرین

بڑے خلوص اور محبت سے رخسانہ کی دلی کیفیت جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''یہ سب کیسے ہوا۔'' اُس نے رخسانہ کا دایاں بازو اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔

''جی محترمہ کچھ تو فرمایئے کیوں تم نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی قبر کھود دی ہے۔ تم کیسے اس عیاش اور نفس پرست شخص کے قابو میں آ گئیں اور اتنا بڑا اقدم اٹھالیا۔''

''مونس نے مجھے بہکا دیا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے رخسانہ نے ثمرین کے شانے پر اپنا سر ٹکالیا اور آنسو بہاتے ہوئے بولی۔

''میں جانتی ہوں کہ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ میرا گھر ہے، چھوٹے چھوٹے بچے ہیں میرے۔ ثمرین خدا کے لیے مجھے برباد ہونے سے بچالو۔ میں زندگی بھر تمہاری ممنون واحسان مند رہوں گی۔''

''میں خود بھی دل سے یہی چاہتی ہوں کہ تم برباد نہ ہو، تمہارا گھر آباد اور بچے سلامت رہیں۔'' ثمرین نے رخسانہ کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''دیکھو رخسانہ کوشش کرنا میرا کام ہے اور اس کا صلہ دینا اوپر والے کے ہاتھ میں ہے لیکن یہ سب کچھ اس صورت ممکن ہے جب تم مجھے ساری صورتحال سے آگاہ کرو گی کہ یہ سب کیسے ہوا؟''

آنسوؤں سے بھیگی رخسانہ کی آنکھیں خلا میں تک گئیں، جیسے وہ واقعات کی کڑیوں کو ایک زنجیر میں پرونے کی کوشش کر رہی ہو۔

رخسانہ آبائی طور سے گلاب پور جنوبی پنجاب کی رہنے والی تھی۔ یہ علاقہ اپنی سرسبزی وشادابی کے لحاظ سے انتہائی خوش ہے، سرسوں پھوٹنے کے زمانے میں زمین پر پیلے رنگ کے پھول آگ لگا دیتے ہیں۔ سردی میں گنے کی فصل سے بہار آتی ہے۔ بہار میں کماد کی فصل بہار دکھاتی ہے۔ نہروں کا میٹھا پانی زندگی بخشتا ہے۔ اپنی خوبصورتی اور ہریالی کے سبب گلاب پور گاؤں ہونے کے باوجود گاؤں نہیں لگتا، ایسا لگتا ہے گلاب پور میں گلابوں کا گلدستہ کھل گیا ہے۔

آج سے تقریباً دس سال قبل اس کی شادی راجو پارک کے ایک شخص ندیم سے ہوئی تھی۔ راجو پارک گلاب پور سے دور ایک شہری علاقہ تھا، جہاں گلاب پور کے معقول لوگ رہتے تھے۔ لیکن اپنے آبائی گاؤں سے ان کا رشتہ برقرار تھا۔

ندیم نقاشی دار فرنیچر کا ماہر کاریگر تھا۔ اس نے کام کے لیے کئی ملازم رکھے ہوئے تھے اور اس کا کاروبار خاصا اچھا چل رہا تھا۔ اس کی آمدنی بھی خاصی موٹی تھی گویا خوشحالی اس کے قدموں میں لگی ہوئی تھی، شہر میں عمدہ فرنیچر کے شوقینوں اور قدر دانوں کی کوئی کمی نہیں تھی، اس لیے وہ دونوں ہاتھوں سے پیسا کما رہا تھا۔ انسانی ہاتھوں سے بنے اربوں ڈالروں کے ایٹم بموں اور ہائیڈروجن بموں میں آنے والے کل کی راکھ جمع ہے اور کچرے میں پھینکی گئی خشک بیل میں زندہ بچوں کے اندر آنے والے کل کی روئیدگی لہلہا رہی ہے۔

☆......☆......☆

رخسانہ اور ندیم کی زندگی ہنسی خوشی گزرنے لگی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ چار بچوں کے والدین بن گئے۔ خوبصورت گھر دو بیٹے اور دو بیٹیاں ان کی زندگی کی کرن تھے۔ یہ حقیقت ایک روشن دیا ہے کہ کنبہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ اخراجات بھی بڑھ جاتے ہیں اس لیے جب سامانِ حیات بڑھا تو زائد آمدنی کی ضرورت محسوس ہونے لگی وہ اکثر سوچتا کہ چار پیسے کی الگ کمائی ہوگی تو وہ گھر اور بچوں کے کام ہی آئے گی اس لیے زائد آمدنی کا ذریعہ بھی ندیم کے ذہن میں تھا۔ اس کا مکان خاصا بڑا تھا۔ اس کا صرف ایک پورشن ہی اس کے استعمال میں تھا۔ اس لیے اس نے مکان کا اگلا حصہ کاروباری کام کے لیے کسی کو کرائے پر دینے کا فیصلہ کرلیا۔

جب اس بات کا تذکرہ لوگوں سے کیا تو ندیم کے پاس مکان کرائے پر لینے کے خواہش مند بھی آنے لگے۔ ندیم نے ان میں سے مونس کا انتخاب کیا اور اسے دکان کا اگلا حصہ کرائے پر دے دیا۔ مونس آبائی طور پر گلاب پور کا ہی رہنے والا تھا۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ مونس اور رخسانہ ایک ہی محلے کے رہنے والے تھے۔ محلے کی قربت و شناسائی کے سبب وہ دونوں ایک دوسرے سے بے تکلف ہوگئے۔ مونس کے والد مبارک علی برسوں قبل کام کی تلاش میں اس شہر آ کر بس گئے تھے پہلے وہ کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ بعد میں انہوں نے راجو پارک میں ذاتی مکان بنوالیا تھا۔ مونس کی شادی کئی سال پہلے رابعہ سے ہوچکی تھی۔ وہ تین بچوں کا باپ تھا۔ یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ رابعہ کا تعلق بھی گلاب پور سے تھا۔ اس کی شناسائی رخسانہ سے نہ تھی۔ مونس نے ندیم کا مکان کرائے پر لے کر وہاں ریڈی میڈ گارمنٹس کا کام شروع کردیا، لیکن مونس کا یہ کاروبار نہ چل سکا۔ گاہک اس کی دکان پر آتے ہی نہیں تھے۔ نہ جانے کیوں شاید اس علاقے کے لوگ ریڈی میڈ گارمنٹس میں اس قدر دلچسپی نہیں لیتے تھے یا پھر وہ پورا دن بیکار ہی بیٹھا رہتا تھا۔

دوسری طرف دوپہر کو رخسانہ کے پاس بھی کوئی کام نہیں ہوتا تھا اس لیے وہ مونس کی دکان میں آ کر بیٹھ جاتی تو کبھی مونس بھی گھر کے اندر جا کر رخسانہ سے گپ شپ کرنے لگتا۔ چونکہ دونوں ایک ہی جگہ کے رہنے والے تھے اس لیے ان دونوں میں اجنبیت اور بیگانیت کے تمام بادل چھٹ چکے تھے۔ اب تو شناسائی کی منازل طے ہو رہی تھیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ممکن ہوگیا کہ اکثر ندیم اپنے کاروبار کے سلسلے میں شہر سے باہر رہتا تھا اور رخسانہ گھر میں اکیلی ہی جذبات کی آگ میں جل رہی ہوتی تھی۔ اس ناتے دونوں میں ہنسی مذاق بھی ہوجاتا تھا۔ دیور بھابی کے اس ہنسی مذاق کو رخسانہ اتنی اہمیت نہیں دیتی تھی، جب کہ مونس اسے نہ صرف للچائی نظروں سے دیکھتا تھا بلکہ اس کی نظر میں رخسانہ کے گورے بدن کا ایک ایک حصہ نقش ہوگیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حسین وجمیل رخسانہ اپنے بھرے بھرے گداز جسم کے ساتھ مونس کے پاس بیٹھتے بیٹھتے اس کے دل میں اتر گئی اور اب وہ اس کے دل کے ذریعے اس کے جسم میں اترنا چاہتا تھا۔ اس لیے ہنسی مذاق میں مونس اپنے دل کی بات ڈھکے چھپے لفظوں میں کہتا رہتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ رخسانہ یا تو مونس کی باتوں کا مقصد سمجھی نہیں تھی یا سمجھنے کے باوجود نظر انداز کردیا کرتی تھی۔

یہ بات طے ہے کہ جہاں عورت مرد تنہائی میں اکٹھے ہوں وہاں تیسرا شیطان بیچ میں ضرور ہوتا ہے۔ مونس کے دل و دماغ پر مکمل طور پر شیطان کا قبضہ ہوچکا تھا۔ اس لیے وہ رخسانہ کے ساتھ ہر وقت ذومعنی باتیں کرتا رہتا تھا۔ بے تکلفی سے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ رخسانہ کے گورے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر مسلتا تھا۔ اس کی مخروطی انگلیوں اور چاند جیسی ہتھیلیوں اور خوبصورت

کلائیوں کے بوسے بھی لیتا رہتا تھا۔

ایک دن مونس نے مذاق مذاق میں رخسانہ کے ساتھ ایسی حرکت کی کہ جو کوئی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ رخسانہ اس کی اس حرکت پر ششدر رہ گئی۔ مونس شاید اور بھی پیش قدمی کر جاتا، مگر اسی وقت باہر سے کسی نے آواز دے دی۔ وہ بلانے والے کو کوستا ہوا باہر چلا گیا۔ مونس کے جانے کے بعد رخسانہ اپنے آپ میں واپس لوٹی اس کے حواس پر مونس کی اس حرکت کا احساس اور عجیب سی کیفیت اب بھی قائم تھی۔

مونس نے اپنے منصوبے کے مطابق رخسانہ کے اندر یہ احساس بیدار کر دیا تھا کہ اس کا شوہر ندیم پیسا کمانے میں اس قدر مصروف ہے کہ وہ اسے تقریباً بھول ہی چکا ہے اور اب اس کی حالت اس دھرتی جیسی ہو گئی تھی جس پر عرصہ ہوا بادل نہ برسا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے رخسانہ کا جی بڑی شدت سے چاہا کہ مونس باہر سے جلدی لوٹ آئے اور پھر اس اس کے ساتھ وہی حرکت کرے، لیکن ہوا یہ کہ مونس کی بجائے اس کا شوہر ندیم کام پر سے جلدی گھر لوٹ آیا اور رخسانہ سے کاروباری باتیں کرنے لگا۔

رخسانہ کو اس وقت ندیم کی باتیں زہر لگ رہی تھیں۔ اس وقت وہ کسی اور ہی موڈ میں تھی اور وہ اپنے شوہر کی بھرپور توجہ چاہ رہی تھی۔ کچھ پیار بھری باتیں کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر ندیم اس کے اندر اٹھنے والے جوار بھاٹے سے بے خبر اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا۔ وہ اپنی نئی پارٹیوں کے ساتھ ہونے والے ہزاروں روپے کے سودوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ایڈوانس میں ملی ہزاروں کی رقم دکھا رہا تھا مگر ان کی باتوں سے بے نیاز رخسانہ کا دل کچھ اور سوچ رہا تھا۔

دوسرے دن دوپہر کو مونس پھر رخسانہ کے گھر میں آ بیٹھا اسے دیکھ کر رخسانہ کے دل میں عجیب سی ہلچل ہونے لگی آج وہ خود چاہ رہی تھی کہ مونس اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرے۔ مونس عورتوں کا شکاری تھا چونکہ ایک گھاگھ مرد تھا جو عورتوں کی نفسیات سے کھیلتا تھا۔ دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتا اور اپنا کام نکالتا۔

اس نے رخسانہ کو دیکھا تو سمجھ گیا کہ لوہا گرم ہے، وہ جدھر چاہے اُدھر موڑ سکتا ہے۔

''کیا ارادے ہیں بچے کی جان لوگی کیا۔ کیسے کیسے تیر اس حسین دامن میں چھپا رکھے ہیں۔ آج تو بڑی حسن کی بجلیاں گرا رہی ہو۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''جیسے جلا کر بھسم کرنے کا ارادہ ہے کیا۔''

''جلے کو کیا جلانا۔'' رخسانہ ہنس کر بولی۔

''یعنی تمہارے حسن کے نشانے پر میں ہوں۔'' یہ کہہ کر موقع غنیمت جانتے ہوئے مونس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ مضبوطی سے رکھ دیے۔ جو دوسرے ہی لمحے رخسانہ کو کچھ پیغام دینے لگے۔

''ہائے اللہ۔'' رخسانہ نے مصنوعی ناراضگی س دیکھتے ہوئے کہا۔

''پرائی عورت کو ہاتھ لگاتے ہو تمہیں شرم نہیں آتی۔''

''پہلے تم پرائی تھیں لیکن اب......'' مونس نے پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اب تم میرے ہاتھوں میں ہو، لہٰذا تم میری ہو گئیں۔''

مونس نے رخسانہ کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ''خدا کی قسم! تم دنیا کی حسین ترین عورت ہو۔ تم پر میں اپنی بیوی جیسی سیکڑوں عورتیں قربان کر سکتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ تمہیں اپنے دل کے مندر میں بٹھا کر تمہاری پوجا کروں......تم حسن کی دیوی ہو۔''

یہ سن کر رخسانہ پر بے خودی سی طاری ہو گئی۔ ایک مرد کی جھوٹی تعریف نے ہمیشہ کی طرح ایک عورت کو بہکا دیا۔ اس میں قصوروار صرف مرد نہیں تھا عورت بھی برابر کی تھی۔ اس نے اپنی مرضی سے مرد کو آگے بڑھنے کا راستہ دیا، ورنہ مرد کی کیا جرأت کہ وہ ایک حد سے آگے بڑھے۔

تجربہ کار مونس سمجھ گیا کہ اب رخسانہ مزاحمت نہیں کرے گی، اس لیے وہ اس سے کھیلنے لگا۔ خشک موسم میں برسات شروع ہوتے ہی رخسانہ کو ایسی آسودگی ملی کہ وہ اس پر دل و جان سے نثار ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا، مونس کی رفاقت سے رخسانہ غلط راستوں پر چل نکلی نہ اسے شوہر یاد رہا نہ بچے نہ اپنی عزت کا خیال۔ جو جال مونس نے بچھایا تھا، وہ اس میں پھنستی چلی گئی۔ رخسانہ کے قدم ایک بار غلط راہ پر کیا اٹھے کہ پھر تو اٹھتے ہی چلے گئے۔ وہ غلاظت کی دلدل میں دھنستی چلی گئی۔

مونس کے دماغ میں ایک شیطانی منصوبہ سر اٹھا رہا تھا۔ اس کا کاروبار تباہ ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے رخسانہ کو بلیک میل کر کے روپیہ کمانے کا سوچا۔ مونس رخسانہ کی آسودہ اور خوش حال زندگی سے بہت متاثر تھا۔ دولت کی ریل پیل نے اسے ہوس کا پتلا بنا دیا۔

☆......☆......☆

ایک دن مونس رخسانہ گھر کہ آیا تو اس کے ہاتھوں میں نیا موبائل فون تھا۔ اس نے رخسانہ کو وہ فون دکھایا تو وہ کہنے لگی۔

''ارے یہ تو بالکل لیٹیسٹ ماڈل ہے۔ اوہو، فوٹو کھینچنے کے لیے اس میں کیمرہ بھی ہے۔''

''رخسانہ اس سے صرف فوٹو ہی نہیں کھینچے جاتے بلکہ ویڈیو فلم بھی بنائی جاتی ہے۔'' مونس نے اس کے شوق کو ہوا دیتے ہوئے کہا۔

''اچھا میری فلم بناؤ تم، میں دیکھوں کہ اس سے کیسے فلم بنتی ہے۔'' رخسانہ نے انتہائی پرجوش ہو کر بڑے اشتیاق سے کہا۔

''تمہاری فلم بنانے کے لیے ہی تو یہ موبائل خریدا ہے۔'' مونس نے کہا۔ ''لیکن یہ عام فلم نہیں ہوگی رخسانہ بیگم یہ بڑی اسپیشل فلم ہوگی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔'' رخسانہ نے تجسس بھرے حیرت انگیز لہجے میں پوچھا۔

''اس کے لیے تمہیں بے لباس ہونا پڑے گا۔'' مونس نے شوخ لہجے میں آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''کیا تم میری بلیو فلم بناؤ گے؟'' رخسانہ ایک دم چونکی۔

''ہاں تو اس میں کیا برائی ہے۔'' مونس نے اسے جذباتی طور پر بلیک میل کرتے ہوئے کہا۔ ''رخسانہ ڈارلنگ تم کتنی حسین ہو۔ جب تم پاس نہیں ہوتیں تو مجھے تمہاری بہت یاد آتی ہے۔ تمہیں دیکھنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ میں تمہیں موبائل اسکرین پر دیکھ کر خوش ہو لیا کروں گا۔''

''یہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔'' رخسانہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ارے تم عجیب بات کرتی ہو۔ فون میرا ہے دوسرا کوئی کیسے دیکھے گا۔'' مونس نے مصنوعی حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو جان من! تم یہ فضول سا وہم اپنے دل سے نکال دو اور تیار ہو جاؤ اپنی خوبصورت سی فلم بنوانے کے لیے۔''

رخسانہ قطعی نہیں چاہتی تھی کہ اس کے جسم کی فحش عکاسی ہو لیکن مونس کی ضد کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ رخسانہ نے بے بسی کا اظہار کرتے، کچھ خوشی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مونس کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ چونکہ مونس نے اس فلم کو پوشیدہ رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس لیے وہ بھی اپنی بلیو فلم بنانے کے لیے راضی ہوگئی۔

رخسانہ کے راضی ہونے کا اہم سبب مونس پر اندھا اعتماد بھی تھا، پھر یہ کہ مونس اس کی تنہائی کا ساتھی بھی تھا۔ جو ندیم کی عدم موجودگی میں بن بادل برسات کی طرح تھا۔

رخسانہ نے مونس کی منشا کے مطابق فلم بنوانا شروع کر دی۔ مونس بڑی مہارت سے فلم بنا رہا تھا۔ بعد میں رخسانہ نے وہ ویڈیو کلپ دیکھی تو خود ہی شرم سے گڑ گئی۔ گورے گورے بدن پہ خوبصورت ابھار عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ مونس نے رخسانہ کا ایک ایک انگ نمایاں کر کے فلمایا تھا۔ اب معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کوئی ماہر عکس بند ہے۔

''دیکھو مونس میں نے تمہارا کہا مانا۔ اب تم میرا کہا مانو اور اس فلم کو ضائع کر دو۔'' رخسانہ نے مونس سے التماس بھرے لہجے میں کہا۔

''ضائع کر دوں گا تم بے فکر رہو۔ مجھے ذرا تسلی سے دیکھ تو لینے دو کچھ دن تک مجھے اس کے مزے تو لے لینے دو۔'' مونس نے اسے جھوٹی تسلی دی۔

رخسانہ نہیں جانتی تھی کہ عام طور پر دھوکہ اسی سے ملتا ہے جس پر زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے۔ زوال ہمیشہ اندر سے آتا ہے۔ یہ بات اور کوئی نہیں موئن جودڑو کہہ رہا تھا جس کی سات تہیں ہیں۔ یہ سات بار اجڑ کر آباد ہوا اور ان میں سے ہر تہہ اپنے سے نیچے والی زمانی لحاظ سے ماقبل کی تہہ سے کمتر ہے۔

☆......☆......☆

گارمنٹ کا دھندا نہ چل پانے کے سبب مونس نے کاروبار بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے راجو پارک میں ہی ایک دکان کرائے پر لے کر بجلی کے آلات کا کام شروع کر دیا۔ سی ڈی بنانے کے لیے اس نے ایک کمپیوٹر بھی خریدا۔ اس کام میں مونس کی دیوانگی کے سبب رخسانہ نے دکان کھولنے کے لیے شوہر سے چوری چھپے مونس کی مالی مدد بھی کی۔ مونس کی دکان اوسط طریقے سے چلنے بھی لگی لیکن اس کے باوجود وہ رخسانہ سے روپے لیتا رہتا کہ نئی دکان کھولی ہے۔ اس لیے ہاتھ تنگ ہے۔ جلد ہی مجھے ایک جگہ سے پیسا ملنے والا ہے پھر میں تمہارا سارا پیسا واپس کر دوں گا۔''

مونس روپے لوٹانے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔ دراصل وہ رخسانہ کو سونے کا انڈا دینے والی مرغی سمجھ بیٹھا تھا کہ رخسانہ

کے پاس لاکھوں روپے نقد ہیں اور وہ اسے دے سکتی ہے۔
دوسری طرف مونس کے مطالبات سے عاجز آ کر رخسانہ نے اس سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ اس کی فون کال بھی ریسیو نہیں کرتی تھی۔ شاید اس کی سمجھ میں اب یہ بات آ گئی تھی کہ مونس کے دل میں اس کے لیے سچا پیار نہیں ہے اور یہ کہ وہ دھوکے باز اور مکار انسان ہے اور اسے صرف پیسے سے پیار ہے۔ رخسانہ کی اس بے رخی سے ناراض ہو کر مونس نے اس کی ویڈیو کلپنگ کی سی ڈی تیار کر لی اور وہ سی ڈی ثمرین کو دیکھنے کے لیے دے دی۔ ثمرین اکثر اس کی دکان سے فلمیں لے کر جاتی تھی۔ مونس یہ بات خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ ثمرین رخسانہ کی گہری سہیلی ہے۔ اس کے ذریعے رخسانہ تک بات پہنچ جائے گی کہ اس کی بلیو فلم کی سی ڈی تیار ہو چکی ہے۔

ثمرین نے جب اس بارے میں مونس کو فون کیا تو اس نے دس لاکھ روپے کا مطالبہ کر دیا کہ مونس نے یہ سارا کام محض رخسانہ سے رقم اینٹھنے کے لیے کیا تھا۔ اب سارا معاملہ صاف ہو چکا تھا۔

ثمرین نے گہرائی سے سوچنے کے بعد رخسانہ کو اس بلیک میلر کے سامنے جھکنے کے بجائے اسے سبق سکھانے کے مشورہ دیا۔

"دیکھو رخسانہ! تم نے جو کچھ کیا ہے اس کی سزا کی حق دار تو تم ہو ہی۔" ثمرین نے سمجھاتے ہوئے کہا اس لیے اب تم اپنے شوہر کو ساری باتیں سچ سچ بتا کر اپنے گناہ کی معافی مانگ لو۔ جو وہ سزا دے اسے سر آنکھوں پر قبول کرو۔ اس کے بعد تم پولیس میں جا کر مونس کے خلاف رپورٹ درج کروا دینا۔ پولیس مونس جیسے بلیک میلروں سے نپٹنا خوب جانتی ہے۔ میری بڑی بہن کا جیٹھ اسی علاقے میں اے ایس آئی لگا ہوا ہے۔ وہ تمہاری پوری مدد کرے گا۔"

رخسانہ میں شوہر سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی ہمت نہیں تھی، اس کے باوجود جو گناہ اس نے کیا تھا اس کی معافی مانگنا بھی ضروری تھی۔ اس دوران کئی بار اس نے خودکشی کا ارادہ کیا لیکن بچوں کا خیال آتے ہی ہمت نہ ہوئی۔

رخسانہ کو اپنے اندر حوصلہ پیدا کرنے میں چار دن لگے مگر سچ کا سامنا کرنے کے لیے اس نے خود کو تیار کر لیا تھا۔ پھر رو رو کر رخسانہ نے ندیم کو ساری بات بتا دی۔ ندیم کو غصہ تو بہت آیا مگر حالات کو دیکھتے ہوئے وہ سارا غصہ پی گیا۔

اس نے ساری صورتحال میں اسے اپنا قصور بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے تھوڑے سے پیسوں کے لالچ میں گھر کا ایک حصہ غیر مرد کو کرائے پر دے دیا اور پھر اس سے آنکھیں بھی بند رکھیں۔ اس کے علاوہ پیسے کمانے کی دھن میں وہ اپنی بیوی کو بالکل ہی فراموش کر چکا تھا۔

☆☆......☆☆

اگلی صبح وہ رخسانہ کو لے کر علاقے کے تھانے میں پہنچا اور ثمرین کی بہن کے جیٹھ یوسف سے ملا۔ ثمرین نے پہلے ہی اس سے بات کر لی تھی۔ وہ ان کو ساتھ لے گیا اور تھانہ انچارج ممتاز رسول کو سارا معاملہ بتا دیا۔ ممتاز رسول نے فوراً ابتدائی رپورٹ درج کر لی اور انسپکٹر محمد یوسف کو تفتیشی افسر مقرر کر دیا گیا۔

مہر یوسف نے صبح چھ بجے مونس کی دکان پر چھاپہ مار کر اسے سوتے ہوئے حراست میں لے لیا۔ اس کے بعد اس کی دکان کی تلاشی لی گئی۔ بلیو فلموں کی 15 سی ڈیز، کیمرے والا موبائل، کمپیوٹر، وہ میموری کارڈ جس میں رخسانہ اور دوسری عورتوں کی فحش ویڈیو کلپنگ تھی، برآمد کر لیے۔

اگلے دن مونس کو کورٹ میں پیش کر کے گہرائی میں پوچھ تاچھ کرنے کے لیے دو دن کا ریمانڈ لے لیا گیا۔ ریمانڈ کی معیاد پر پولیس نے پوچھا تو ساری بات سامنے آ گئی۔ دراصل ابتدائی دور میں رخسانہ نے مونس کی پیسے کی ہر مانگ پوری کی تھی۔ اس کے اندر لالچ سما گیا تھا۔ آخر میں اسی لالچ نے اسے دبوچ لیا۔ ریمانڈ ختم ہونے پر پولیس نے مونس کو کورٹ میں پیش کیا۔ جہاں اسے جیل بھیج دیا گیا۔

اس واقعے کے بعد رخسانہ اب شوہر کی اتنی خدمت گزار اور فرمانبردار ہو چکی ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ شوہر کے پاؤں دھو دھو کر پیتی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس طرح وہ اپنی ذاتی خطا کا ازالہ کر رہی ہے۔ دوسری طرف اس کا شوہر بھی اُس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ اسے بھرپور توجہ دیتا ہے۔ اس کو سیر و تفریح کے لیے بھی لے کر جاتا ہے اور شاپنگ کرواتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس حادثے میں وہ بھی برابر کا خطار کار ہے۔ اس کی کوتاہی اور لاپروائی کی وجہ سے ایک شیطان صفت آدمی کو اس کے گھر میں نقب لگانے کا موقع ملا تھا۔

قارئین کہانی پڑھنے کے بعد اب آپ فیصلہ کریں کہ اس میں خطا کس کی ہے؟

☆☆......☆☆

پرندہ راستہ بھولا ہوا تھا

احمد علی عاقل

جدید ٹیکنالوجی کا شکار ہونے والی دوشیزہ کی داستانِ الم، وہاڑی سے

''میرے لیے زندگی شاید اب بے معنی ہو چکی تھی۔ زندگی جیسی تلخ حقیقت سے نبرد آزما ہونے کے لیے عزت ہی تو سب سے بڑا ہتھیار ہوتی ہے۔ میں جو بھی کر رہی ہوں بہت سوچ سمجھ کر کر رہی ہوں۔ میری موت کا ذمہ دار صرف اور صرف نبیل ہے۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ اس نے مجھے......''

یہ لکھتے ہوئے سحرش کی آنکھوں سے آنسو کا چشمہ ٹوٹ پڑا تھا۔ ماضی قریب کا ایک ایک لمحہ زہر بن کر اس کے دماغ میں اتر چکا تھا۔ پچھلے دس دنوں میں اس نے خود کو ختم کرنے یا نبیل احسن سے بدلہ لینے کے دونوں آپشنز پر غور کیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ نبیل جیسے انسان کو اس کے کیے کی سزا دی جائے۔ لیکن کچھ تو تھا جو اس کو ایسا کرنے سے روک دیتا تھا۔

آج اس نے خودکشی جیسی حرام چیز کو گلے لگانے کا ارادہ تو کر لیا تھا لیکن یہ آسان نہ تھا۔

''سحرش او ہیلو! کیا ہوا؟ آر یو او کے؟'' حمیرا کمرے کا دروازہ کھول کے اندر داخل ہوئی۔

''آئی ایم فائن۔ تم سناؤ کیسی ہو؟'' سحرش بمشکل ہی بول پا رہی تھی۔ ''تم گھر نہیں گئیں۔ آج تو ہفتہ ہے۔

''مجھے چھوڑو تم اپنا بتاؤ کیا حال بنایا ہوا ہے؟'' حمیرا سحرش کو اس حال میں دیکھ کے پریشان ہو گئی تھی۔

''ارے کچھ نہیں ہوا یار! میں تو بس ایسے ہی......'' سحرش کے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔

''سحرش! بتاؤ نہ میری جان کیا ہوا ہے؟'' حمیرا اب سحرش کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

''ایک تو حنا نے بھی ابھی جانا تھا، تم ایک کام کرو جب تک حنا نہیں آ جاتی، تم میرے روم میں شفٹ ہو جاؤ۔''

''یار میں ٹھیک ہوں اور حنا کے بھائی کی شادی ہے اس کو تو جانا ہی تھا۔ اور ویسے بھی اس ہوسٹل میں رہتے ہوئے مجھے دوسرا سال ہے اب تو اکیلے رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔'' سحرش خود کو نارمل دکھانا چاہ رہی تھی۔

''اچھا چلو آؤ میرے ساتھ کوئی مووی دیکھ لیتے ہیں۔ حنا بھی وہاں ہی ہے۔'' حمیرا کو یقین تھا کہ حنا نارمل نہیں ہے۔

''اچھا میں آتی ہوں تھوڑی فریش ہو جاؤں۔ مجھے اس حال میں دیکھ کر تمہاری روم میٹ ڈر ہی نہ جائے۔'' سحرش کو بالآخر حمیرا کی بات ماننی پڑی۔

حمیرا کے چہرے پر ہنسی سج گئی تھی۔ لیکن سحرش کی ہنسی تو شاید کہیں کھو گئی تھی۔ اڑی اڑی سی رنگت، بکھرے ہوئے بال، کئی دنوں سے اس نے برش بھی نہیں کیا تھا بالوں میں۔ اس کے کمرے کی حالت بھی کچھ اس طرح کی تھی۔

اور کھانا تو وہ تب کھاتی جب اس کو زندہ رہنے کی ذرا سی بھی خواہش ہوتی۔

''اچھا میں آتی ہوں۔ شاور لے لوں۔'' سحرش اٹھ کر کھڑی ہوتی۔

''میں یہیں بیٹھی ہوں۔ تم جاؤ۔'' حمیرا اس کو ساتھ ہی لے کر جانا چاہتی تھی۔

حمیرا کی پریشانی بجا تھی کیوں کہ جس سحرش کو وہ پچھلے ایک سال سے جانتی تھی وہ بالکل ایسی نہیں تھی۔ پچھلے سال نومبر میں اس کی ملاقات سحرش سے یونیورسٹی کینٹین میں ہوئی تھی۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟'' حمیرا نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سحرش سے پوچھا تھا۔

''جی آپ کی مرضی ہے۔ ویسے تو چیئر بیٹھنے کے لیے ہی ہوتی ہے۔ اور آپ کی صحت دیکھ کر تو یہی لگتا ہے کہ آپ آرام سے بیٹھ سکتی ہو۔'' سحرش کا جواب سن کر حمیرا ہنسے بغیر نہیں رہ پائی تھی۔

یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ جو جلد ان کی بے تکلفی کی وجہ سے دوستی میں بدل گئی۔ اور حمیرا کو وہ دن بھی اچھی طرح یاد تھا۔ جب سحرش نے اس کی ملاقات حنا سے کروائی تھی۔

''میٹ حنا مائی بیسٹ فرینڈ، میری روم میٹ بھی، اور ہاں میری دھوبی، میری کک، میری پرسنل سیکریٹری بھی۔'' سحرش نے حنا کو چڑاتے ہوئے تعارف کروایا تھا۔ لیکن جلد ہی جب حمیرا ان کے ساتھ والے روم میں شفٹ ہوئی تو اس کو احساس ہو گیا تھا کہ سحرش نے تعارف ٹھیک ہی کروایا تھا۔ حنا حد سے زیادہ خیال رکھنے والی تھی۔ اس کے سارے کام خود کرتی تھی اور اگر کوئی رہ جاتا تو وہ اپنی ضد سے کروالیتی تھی۔

وہ ایسی ہی تو تھی شوخ و چنچل، ضدی اور خوب صورت شکل و صورت کے ساتھ ساتھ ایک خوبصورت دل کی بھی مالک تھی جس کی ہو جاتی اس کے لیے جان بھی دینے کو تیار ہو جاتی اور وہ کلاس کے چند ذہین اسٹوڈنٹس میں سے بھی تھی۔

''او ہیلو کہاں کھوئی ہوئی تھیں؟'' بالوں کو ٹاول سے لپیٹے سحرش نے حمیرا کو خیالوں کی دنیا سے نکالا۔

"ارے یار کچھ نہیں بس پرانے دن یاد آ گئے تھے۔" حمیرا نے بتایا۔

"یہ یادیں ہی تو ہیں جو انسان کو کسی قابل نہیں چھوڑتیں۔" سحرش کے لہجے میں تلخی برقرار تھی۔

"اچھا اچھا چلو جلدی کرو، زیادہ فلسفہ نہ جھاڑو۔" حمیرا نے ٹاپک بدلنا چاہا۔

پچھلے چار دنوں میں حمیرا نے سحرش کو ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑا تھا اور آج 22 نومبر تھی حنا کی واپسی کا دن۔ اسی وجہ سے سحرش کو کچھ بھی الٹا سیدھا کرنے کا موقعہ نہیں مل پایا۔ حمیرا کی پریشانی پچھلے چار دنوں سے مزید بڑھ گئی۔ اس نے سحرش کو کبھی اتنا خاموش نہیں دیکھا تھا لگتا تھا جیسے وہ سحرش تھی ہی نہیں۔

"کچھ تو ہے جو اس کے دماغ میں چل رہا ہے۔ یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تو نہیں۔" حمیرا کی سوچ اب ہر اینگل پر گھوم رہی تھی۔ اس کو انتظار تھا تو بس حنا کے آنے کا کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ حنا ہی وہ واحد لڑکی ہے جو سحرش سے اس کے دل کا حال اگلوا سکتی تھی۔

"السلام وعلیکم!" حنا چہکتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ "میں تو پریشان تھی کہ میری سحری اکیلی ہوگی لیکن یہاں تو اس کو میری کمی محسوس ہی نہیں ہوئی اس کا انداز چھیڑنے والا تھا۔ لیکن پھر اس کو ماحول کی تلخی کا احساس ہونے میں دیر نہیں لگی تھی۔

"کیسا رہا سفر حنا۔" حمیرا نے پوچھا۔

"اٹ واز فائن۔ لیکن تم دونوں کو کیا ہوا؟ اتنی خاموشی، وہ بھی سحری کے ہوتے ہوئے۔" حنا کی پریشانی بجا تھی۔

"نہیں ہوا تو کچھ بھی نہیں۔ تم بتاؤ بھابی کیسی ہیں؟" سحرش نے پوچھا۔

"کھڑی ہونا ذرا۔ گلے کون ملے گا؟ ادھر آؤ۔" حنا نے بناوٹی غصے کا اظہار کیا۔ بہت دن بعد گلے لگایا تھا حنا نے اپنی بیسٹ فرینڈ کو۔

"ارے یہ کیا تمہاری آنکھوں میں آنسو؟ سحری کیا ہوا ہے؟" حنا بہت زیادہ پریشان ہوگئی تھی۔

"حمیرا کیا ہوا ہے اس کو؟ تم تو اس کے ساتھ ہی تھیں نا؟" حنا کے چہرے پر تجسس اور پریشانی نمایاں تھی۔

دونوں کی خاموشی نے حنا کو پریشان کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

رات کی تاریکی نے دن کے شور کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ شاید سب لوگ سو چکے تھے لیکن نیند حنا سے کوسوں دور تھی۔ اس کا گمان تھا کہ سحرش سو چکی ہے لیکن اس کی کروٹ سے حنا کو شک ہو گیا تھا کہ شاید وہ بھی جاگ رہی ہے۔

"سحری تم جاگ رہی ہو۔" حنا نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

"ہوں ں۔ جاگ رہی ہوں۔" سحرش نے صرف اتنا ہی جواب دیا۔

"اوئے تم رو رہی ہو؟" لائٹ آن کرتے ہی جب حنا کی نظر سحرش لے چہرے پر پڑی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ادھر آؤ ذرا۔" سحرش نے حنا کو گلے سے لگایا اور بالا آخر سحرش کی آنکھوں کا طوفان امڈ آیا آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ شاید ہی حنا نے پہلے کبھی سحرش کو اس قدر پھوٹ پھوٹ کے روتے دیکھا ہوگا۔

"کیا ہوا ہے پلیز بتاؤ نا۔ چپ کرو بس اب نہیں رونا۔ بتاؤ مجھے کیا بات ہے۔" حنا نے اس کے آنسو صاف کیے اور سحرش بولی اور بولتی گئی۔

"حنا میرا یہ سیل فون میری بربادی کی وجہ ہے۔" سحرش نے اپنے موبائل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بربادی۔" حنا کا چونکنا فطری تھا۔ "ہوا کیا ہے بتاؤ تو یار!"

"نہ میں لاسٹ ایئر سیکنڈ پوزیشن لیتی نہ بھائی مجھے یہ موبائل گفٹ کرتے اور ناں......" سحرش کے رونے نے اس کی بات کو ادھورا چھوڑ دیا۔

"سحری میری جان ہوا کیا ہے؟" حنا دوبارہ اس کو چپ کرانا چاہ رہی تھی۔

"یار یہ فیس بک میرے لیے وبال جان بن گئی۔" سحرش اپنی بات پوری نہیں کر پا رہی تھی۔

"یار فیس بک تو میں بھی یوز کرتی ہوں۔ اس سے کیا ہوا؟" حنا بات سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"یار میں نے تم سے کچھ چھپایا تھا اور شاید یہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔" آنسوؤں کا طوفان کسی بھی طرح رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

''کیا چھپایا تھا۔'' حنا دوبارہ چونکی تھی۔

''یار میرا ایک فیس بک فرینڈ تھا نبیل احسن! وہ فیس بک فرینڈ سے میرا سب کچھ بنا۔'' مجھے احساس تک نہیں ہوا۔ ہماری چیٹ ہوتے ہوتے یہ دوسرا مہینہ تھا جب اس کے بے حد اصرار پر میں نے اسے اپنا موبائل نمبر دیا اور پھر اس سے بات ہوتی رہی۔''

''اوہ مائی گاڈ! تو وہ روم سے باہر جا کر اس سے بات ہوتی تھی؟'' حنا کو غصہ آ رہا تھا۔

''ہاں! لیکن مجھے نبیل نے قسم دی تھی کہ میں کسی کو بھی اس بارے میں نہیں بتاؤں۔'' سحرش نے وضاحت کرنا چاہی۔

''اچھا اور اس کے بعد کیا ہوا؟'' حنا کا تجسس بڑھتا چلا گیا۔

''پھر اس کی آواز، اس کی باتیں...... پتا نہیں کب میں ان میں کھو گئی۔ اس کی آواز سنے بغیر رہنا مشکل ہونے لگا تھا۔'' سحرش خاموش ہوگئی اتنا بول کر۔

''پھر؟'' حنا سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔

اور اس نے مجھ سے میری تصویر مانگی جانے میری عقل کو کیا ہوگیا تھا۔ ایک انجان شخص پر اتنا بھروسہ کر لیا میں نے۔ ایک ایک کر کے پتا نہیں کتنی تصاویر بھیج دی اس کو۔'' سحرش کے آنسو اب خشک ضرور ہوئے تھے لیکن اس کی آنکھیں شاید آگ کی طرح دہکنے لگی تھیں۔

''یار تم اتنی بے وقوف ہو تو نہیں۔ آج تک کسی لڑکے سے بات تک نہیں کی تھی تم نے۔'' حنا کو اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔

''ہاں شاید یہی وجہ تھی کہ میں اُس کو سمجھ ہی نہ سکی۔ اگر کبھی کسی سے بات ہوتی تو اندازہ ہوتا کہ وہ مجھے کس طرف لے جا رہا ہے۔ پہلی بار اس نے ملنے کا کہا تو میں نے صاف منع کر دیا۔ لیکن وہ میری کمزوری جانتا تھا۔ اس نے میری کال اٹینڈ کرنا چھوڑ دی۔ وہ دو دن میرے لیے عذاب سے کم نہ تھے۔ آخر میں نے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی یہ ضد بھی مان لی۔'' سحرش نے اپنی بات مکمل کی۔

آر یُو میڈ سحری؟ کسی لڑکے سے ہنس کر بات نہ کرنے والی کسی انجان لڑکے سے ملنے چلی گئی۔'' حنا کو بالکل یقین نہیں آ رہا تھا۔

''میں کہاں تھی اس وقت؟''

''تم گھر گئی ہوئی تھیں۔ اتوار والے دن ملے تھے ہم ایک ریسٹورنٹ میں۔ یار مجھے اُس سے مل کر یقین ہو گیا تھا کہ جتنا اچھا میں اس کو سمجھتی تھی وہ اس سے زیادہ اچھا ہے۔ مجھے اس سے اتنا پیار ہو گیا تھا کہ میں اس کو پوجنے لگی۔ وہ کہتا دن ہے تو میں کہتی دن ہے۔ وہ کہتا رات ہے تو میں رات مان لیتی۔ اور حنا پھر ایک دن......'' سحرش نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ایک دن؟ سحری کیا ہوا؟'' حنا کا دل ایک دم سے دھڑکا تھا۔ اور پھر سحرش نے وہ سب کچھ بتا دیا جو وہ صرف حنا کے سامنے ہی بول سکتی تھی۔ حنا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ رات ایسے ہی کٹ گئی تھی۔

☆......☆......☆

مسز احسن جلدی جلدی کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔ ان کا لاڈلا بیٹا آفس سے گھر آنے ہی والا تھا، اس سے پہلے کہ وہ آ کر پورے گھر کو سر پر اٹھا لیتا وہ کھانا تیار کرنا چاہتی تھیں۔

''ماں ابھی تک آپ کھانا بنا رہی ہیں؟ میرا بھوک سے برا حال ہے۔ آپ کو پتا بھی ہے لنچ بریک صرف آدھے گھنٹے کی ہوتی ہے۔ میں نے واپس بھی جانا ہے۔'' آتے ہی حسب توقع اس نے شور مچا دیا۔

''نہیں بیٹا دس منٹ۔'' مسز احسن نے کچن سے ہی جواب دیا۔

''پیچھے رہ گئے 20 منٹ اور اس میں مجھے کھانا کھا کر واپس بھی جانا ہے۔ جلدی نہ کریں پلیز۔'' وہ ہمیشہ کی طرح جلدی میں تھا۔

احسن صاحب کی وفات کے بعد مسز احسن نے اپنے اکلوتے بیٹے کو بہت لاڈ پیار سے پالا تھا۔ اس کی ہر خواہش منہ سے نکلتے ہی پوری ہوتی تھی۔

''واہ مما! کیا ذائقہ ہے آپ کے ہاتھ کے کھانے میں۔'' نبیل کھانا ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''او کے مما میں جا رہا ہوں۔ لو یو بائے۔''

''خدا حافظ بیٹا! خدا تمہارا حامی و ناصر۔'' مسز احسن نے دعا کے ساتھ اس کو رخصت کیا۔

آفس ٹائم کے بعد نبیل کبھی وقت پر گھر واپس نہیں آیا

تھا وہ اکثر رات کو دیر سے گھر آتا۔ مسز احسن نے بھی اس کے معاملات میں مداخلت نہیں کی۔ ان کا ماننا تھا کہ اب وہ بڑا ہو گیا ہے۔ اپنا اچھا برا جانتا ہے۔

☆......☆......☆

''ہاں شہزادے سناؤ تمہاری Princess کا کیا حال ہے۔'' حامد نے چھیڑنے کے انداز میں نبیل سے پوچھا۔

''princess کون سی والی؟'' رات کی تاریکی میں دونوں کا قہقہہ بہت دور تک سنائی دیا۔

''اوئے آہستہ ہنس۔ یہ پارک ہے۔ لوگ ہمیں پاگل سمجھیں گے۔'' حامد نے نبیل کو سمجھانا چاہا۔

''یار وہ کیا نام تھا اس کا؟ ہاں سحرش۔ آج کل تمہاری بائیک پہ نظر نہیں آ رہی۔'' حامد نے شرارتی انداز میں پوچھا۔

یار اس کا کیا ہے۔ کہو تو ابھی بلا لوں۔ اس کو حاضر کرنے والی جادو کی چھڑی ہے میرے پاس ہر وقت جیب میں'' نبیل نے اپنے آپ کو داد دینے والے انداز میں بولا۔

''ارے ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا ہے تمہارے پاس؟ ہمیں بتا بھی دیا کرو یار۔'' حامد نے بات کو کریدنا چاہا۔

چل یار کیا یاد کرے گا تو بھی۔ ابھی دکھاتا ہوں۔'' نبیل نے اپنا موبائل جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔

''یہ دیکھو وہ جادو کا چراغ۔'' نبیل نے اپنے موبائل میں ایک ویڈیو چلائی۔

''ارے یار نبیل۔ یہ سحرش ہے اور کہاں ہے یہ؟'' حامد چونک گیا تھا۔

''بس دیکھ لو اور دیکھتے چلے جاؤ۔'' نبیل ایسے اترا رہا تھا جیسے اس نے کوئی کارنامہ انجام دیا وہ۔

''اوہ یار تم نے اس کے ساتھ یہ سب......'' حامد کو جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں اور اسی ویڈیو سے وہ چپ چاپ چلی آتی ہے جہاں بھی بلاؤں۔'' نبیل کے چہرے پر شیطانی ہنسی تھی۔

''اور کب سے چل رہا ہے یہ سب؟'' حامد ایک دم سیریس ہو گیا تھا۔

''چھ ماہ سے۔ اور ویڈیو والا گیم دو ماہ سے۔'' نبیل کو جیسے اپنی اس گھٹیا حرکت پر فخر تھا۔

''یار وہ اتنی معصوم سی لڑکی......'' حامد کو سحرش پر ترس آنے لگا۔

''اوہیلو تم دوست کس کے ہو؟ میرے یا اس کے؟ کچھ زیادہ ہی معصوم لگتی ہے وہ تمہیں۔ کہو تو ابھی بلا لوں؟'' نبیل ابھی بھی اسی زعم میں تھا۔

''او شٹ اپ یار مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ یار مجھے لگا تھا اس بار تو سیریس ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے سحرش سے۔'' حامد شدید غصے میں تھا۔

''او بھائی خیریت ہے نا۔ تم جانتے ہو مجھے۔ میں آج تک اس طرح کے کسی بھی رشتے کو لے کر سیریس نہیں ہوا۔'' نبیل نے حامد کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن یار آج تک تم نے کبھی کسی کے ساتھ یہ سب نہیں کیا۔'' حامد نے نبیل کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹکا۔

''اوئے تُو کیوں اتنا سیریس ہو رہا ہے۔'' نبیل نے سوالیہ نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''یار تمہاری اپنی کوئی بہن نہیں ہے لیکن میری ہے۔ میں یہ سب نہیں سوچتا۔'' حامد اب اٹھ کے کھڑے ہو گیا تھا۔

''اچھا یہ اموشنل ڈراما بند کر، چل گھر چلتے ہیں۔ کافی لیٹ ہو گئے ہیں۔'' نبیل بھی اٹھتے ہوئے بولا۔

☆......☆......☆

حنا پوری رات سحرش کو سمجھانے اور دلاسے دینے میں لگی رہی لیکن سحرش کو شاید اب زندگی سے پیار ہی نہیں تھا۔ وہ بار بار مرنے کی باتیں کر رہی تھی۔

دیکھو یار تمہاری پہلی غلطی کہ تم نے اس پر بھروسہ کیا دوسری غلطی اس بارے میں کسی کو نہیں بتایا تیسری غلطی کہ اُس سے بلیک میل ہوتی رہی اور اب جب میں یہ سب کچھ جان چکی ہوں اور تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں ایک اور غلطی کرنے دوں؟'' حنا دو راتیں اُسے مسلسل سمجھاتی رہی تھی۔

''دیکھو سحری خودکشی حرام ہے۔ اور ایسا کام بزدل کرتے ہیں۔ تمہاری غلطی ضرور ہے لیکن ایسی نہیں کہ تم خدا سے معافی نہ مانگ سکو۔'' حنا کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا سحرش پر۔

''یار سب بھول بھی جاؤں۔ تو کیا ہوگا۔ شادی؟ حنا اب مجھے مرد پر اعتبار نہیں رہا۔ شاید ساری دنیا کہ مرد ایسے ہی

ہوتے ہیں۔ مطلبی دھوکے باز اور موقع پرست۔'' سحرش کے لیے دنیا اب ختم ہو چکی تھی۔ اور اس کی دنیا تھا وہی شخص۔ جب کوئی عورت یہ کہتی ہے کہ دنیا کہ سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ دنیا کہ سارے مردوں کو غلط سمجھ رہی ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس شخص نے اس کو دھوکا دیا وہ اس کے لیے پوری دنیا تھا۔

''ہاں یار میں سمجھتی ہوں اس وقت تم کس حالت میں ہو۔ لیکن سحری ہمیں مضبوط ہونا پڑے گا۔ ورنہ وہ ایسے ہی بلیک میل کرتا رہے گا۔ حنا نے سحرش کو گلے سے لگایا تھا۔

''یار حنا اس کے پاس ویڈیو ہے وہ کسی بھی وقت نیٹ پر اپ لوڈ کر سکتا ہے۔ میرے گھر بھیج دے۔ یونیورسٹی میں کسی کے پاس آ گئی تو؟ حنا اس وقت تو بدنامی کے بعد مرنا ہی میرا مقدر ہوگا۔'' سحرش حنا کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

''یار چلو مان لیا کہ تم ابھی یہ بے وقوفی کر بھی لو۔ تو کیا تمہارے اس اقدام سے تمہارے گھر والوں کی نیک نامی ہوگی۔ دنیا باتیں تو پھر بھی بنائے گی اور پھر تم سے دو چھوٹی بہنیں ہیں۔ ان کی شادی ہو جائے گی؟ اور نوید بھائی؟ وہ باہر کسی کو کیا بتائیں گے ان کی بہن نے خودکشی کیوں کی انکل کا کیا ہوگا؟ اور وہ ماں جس نے تمہیں پیدا کیا پالا۔ اتنی تکلیفیں برداشت کیں کیا اس دن کے لیے کہ ان کی بیٹی چپ چاپ ان کو بتائے بغیر خود کو ختم کر لے۔'' حنا اب خود بھی رو پڑی تھی۔

''یار اس سب کے بعد بھی اگر اس نے وہ ویڈیو اپ لوڈ کر لی تو تم مرنے کے بعد بھی خاندان کی بدنامی کا سبب بن سکتی ہو۔'' حنا نے بات جاری رکھی۔

''تو پھر میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ نہ مر سکتی ہوں نا جی سکتی ہوں۔ میرے پاس اب......'' سحرش کے موبائل کی رنگ ٹون نے دونوں کا دھیان اپنی طرف کر لیا۔

''یہ کس کا نمبر ہے۔ کوئی ان نون نمبر ہے۔'' سحرش کال اٹینڈ نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

''ادھر لاؤ مجھے دو میں دیکھتی ہوں۔'' حنا نے موبائل اس کے ہاتھ سے پکڑا۔

''ہیلو! آپ سحرش بول رہی ہیں؟ دوسری طرف کوئی لڑکا بات کر رہا تھا۔

''جی میں سحرش ہی ہوں لیکن آپ کون ہیں؟'' حنا نے جواب دیا۔

''جی میں آپ کا ویل وشر بات کر رہا ہوں میرا نام حماد ہے اور میں نبیل احسن کا دوست ہوں۔'' حنا نے یہ سنتے ہی موبائل کا اسپیکر آن کر دیا تھا۔

''جی سوری دوبارہ بتائیں آواز کلیئر نہیں آئی۔'' حنا نے اس سے بات دہرانے کو کہا تا کہ سحرش بھی سن سکے۔

''میں نے کہا میں نبیل احسن کا دوست حماد بات کر رہا ہوں اور میں آپ کی مدد...... نبیل کا نام سنتے ہی سحرش کے چہرے پر خوف نمایاں تھا۔ اس نے حماد کو بات مکمل کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اور کال کاٹ دی۔

''ارے یہ کیا کیا؟ اس کی بات سن تو لیتی۔ کیوں کاٹ دی کال؟'' حنا نے حیرت سے پوچھا۔

''کیوں کاٹ دی؟ حنا وہ اس کا دوست ہے۔ سنا نہیں تم نے؟'' سحرش ابھی تک خوف زدہ تھی۔

''یار لیکن وہ کہنا کیا چاہ رہا تھا، یہ تو سن لو۔ وہ خود کو ویل وشر اور مدد کرنے کا کہہ رہا تھا۔'' حنا نے بامعنی انداز میں اس کے ہاتھ سے موبائل پکڑا اور اسی نمبر پر دوبارہ کال ملائی۔

''جی مس سحرش میں جانتا ہوں آپ اس وقت نبیل احسن سے جڑے کسی بھی انسان پر بھروسہ کرنا نہیں کریں گی۔ کیوں کہ اس نے آپ کو جو دھوکہ دیا ہے وہ اتنا بڑا ہے کہ شاید ہی اس کا زخم اس زندگی میں بھر سکے۔

''لیکن تم تو اس کے دوست ہو۔ پہلی بار تم نے ہی اسے ڈراپ کیا تھا نا اس کو، مجھ سے ملنے کے لیے ریسٹورنٹ میں۔'' اس بار سحرش نے موبائل حنا کے ہاتھ سے پکڑ لیا تھا۔

''جی میں وہی ہوں اور شاید اس جرم میں کہیں نہ کہیں کسی طرح سے حصہ بنا ہوں۔'' حامد اپنی غلطی کا اعتراف کر رہا تھا۔

''اب کیا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟ اس وقت تو آپ کو خیال نہ آیا کہ مجھے اس سے بچاتے۔ آپ کو تو پتا ہی تھا نہ کہ وہ کیسا انسان ہے۔ سحرش کا شکوہ درست تھا۔

''جی بالکل یہی جرم ہے میرا۔ میرے سامنے غلط ہوتا رہا اور میں دیکھتا رہا۔ شاید میں نے اپنے دوست کو سمجھنے میں غلطی کی۔ خیر اب میں اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں'' حامد

نے جواب دیا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا! کیا کرنا چاہتے ہیں آپ۔" سحرش اور حنا حیران ہوئے بغیر رہ نہ سکیں۔

"میں کسی طرح نبیل کے موبائل سے وہ ویڈیو یا پھر اس کا موبائل ہی آپ تک پہنچا سکتا ہوں تاکہ وہ آپ کو بلیک میل نہ کر سکے۔" حامد نے جواب دیا۔

"لیکن آپ ایسا کیوں کریں گے؟ آپ تو اس کے دوست ہیں! کیا یہ نبیل کی ہی تو کوئی چال تو نہیں؟" سحرش اب بھی ڈر رہی تھی۔

"نہیں مس سحرش! وہ میرا دوست تھا اب نہیں رہا۔ اس نے جو کچھ بھی آپ کے ساتھ کیا ہے مجھے یہ سوچ کر بھی شرم آتی ہے کہ وہ بھی میرا دوست تھا۔" حامد کے جواب نے سحرش کو سکون پہنچایا تھا۔

"جی السلام وعلیکم! بھائی میں سحرش کی دوست حنا ہوں۔ آپ پلیز مجھے بتائیں کہ آپ کیا کر سکتے ہیں، ہمیں اس مصیبت سے دور نکالنے کے لیے۔" اس مرتبہ حنا نے موبائل سحرش کے ہاتھ سے پکڑ لیا تھا۔

"وعلیکم السلام! جی مس حنا میں وہ موبائل کسی بھی طرح چرا کر آپ تک پہنچا سکتا ہوں تاکہ آپ خود اس ویڈیو کو ڈیلیٹ کریں۔" حماد نے جواب دیا۔

"کیا سچ میں آپ یہ کام کر سکتے ہیں؟ آپ کا احسان ہوگا ہم پر۔" حنا کو جیسے سکھ کا سانس آیا۔

"جی میں کر سکتا ہوں اور کروں گا بھی۔ اور اس بات کو یقینی بناؤں گا کہ اس کے پاس اس ویڈیو کا بیک اپ نہ ہو۔" حماد نے جواب دیا۔

"اوکے۔ آپ کریں یہ کام میں آپ سے دوبارہ رابطہ کروں گی۔" حنا نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

☆......☆......☆
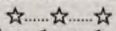
"یار تم نے یہ سب کیسے کیا؟ کیسے بنائی ویڈیو اور کس چیز سے بنائی۔" حماد نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے نبیل سے پوچھا۔

"یار تم نے پھر وہی ٹاپک شروع کر دیا۔ اس دن تو بہت غصہ آ رہا تھا آج پھر سے مزے لینے کی بات شروع کر دی۔" نبیل کے اس جواب پر حامد خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔

"نہیں یار ویسے ہی پوچھا۔" حماد نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

"یار اسی موبائل سے بنائی تھی، چھپایا ہوا تھا پہلے سے۔" نبیل نے موبائل دکھاتے ہوئے جواب دیا۔

"تو اگر یہ موبائل کہیں گم ہو جائے تو تمہاری جادو کی چھڑی تو گئی نہ۔" حماد نے بامعنی سوال کر ڈالا۔ اس کو بھی یہی ڈر تھا کہ اگر نبیل کو ذرا سا بھی شک ہو گیا تو بات ہاتھ سے نکل سکتی ہے آج حماد نے خود نبیل سے ملنے کا کہا تھا تاکہ اپنے اس دن والے رویے کی معافی بھی مانگ سکے اور نبیل نے اس کو اپنے گھر ہی بلا لیا تھا۔

"ارے نہیں ہوتا موبائل گم۔ ویسے بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے میں آج ہی اس کی ایک کاپی لیپ ٹاپ میں سیو کرتا ہوں۔" نبیل نے حماد کی بات کو سراہتے ہوئے جواب دیا۔ نبیل کی اس بات سے حماد کو یقین ہو گیا تھا کہ نبیل کے پاس اس ویڈیو کی کوئی اور کاپی نہیں ہے۔

"اچھا ذرا دکھاؤ تو وہ ویڈیو دوبارہ۔" حماد نے شرارتی انداز سے ہنسنے کی ایکٹنگ کی۔

"واہ جی واہ! کہاں تو اس دن مجھے اچھائی کا سبق دے رہا تھا اور کہاں......" نبیل نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اور اس کے چہرے پر شیطانی قہقہہ تھا۔

"بس یار سمجھا کر وناں۔" حماد اتنا ہی کہہ پایا۔

"اچھا یہ لو بھائی دیکھ لو۔" نبیل نے ویڈیو آن کر کے حماد کو موبائل تھما دیا۔ حماد نے اپنا موبائل نبیل کی نظروں سے بچاتے ہوئے تیزی سے ایک نمبر ملایا اور اگلے ہی لمحے نبیل کے گھر کا لینڈ لائن فون شور مچانے لگا۔

"مما فون ہے دیکھنا ذرا کون ہے۔" نبیل نے بیٹھے بیٹھے آواز دی۔

"اوہ یار مما بھی پتا نہیں کہاں ہیں۔ اچھا میں ابھی آتا ہوں۔" نبیل یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

حماد کو ڈرائنگ روم کے باہری دروازے سے نکل کر اپنی بائیک تک جانے میں چند سیکنڈ کا وقت درکار تھا اور اس کے پاس تھا ہی اتنا ٹائم۔ اس نے پھرتی سے اپنی بائیک اسٹارٹ کی اور تیزی سے گلی سے نکلتا ہوا اب مین شاہراہ پر تھا۔ وہ بہت تیز ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کو ڈر تھا کہ شاید نبیل اس کا پیچھا کرے گا۔ وہ یونیورسٹی کی طرف جا رہا تھا جہاں پہلے سے حنا

اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اچانک نبیل کے موبائل پر کال آئی۔ حماد جانتا تھا کہ یہ نبیل ہی ہوگا جو دوسرے نمبر سے کال کر رہا ہوگا۔ لیکن اب کی بار حماد کو یا ایک رو کنا پڑی کیوں کہ اس کے اپنے موبائل پہ کال آ رہی تھی اور یہ کال حنا کی بھی ہو سکتی تھی۔ جو بہت بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن اپنے موبائل کی اسکرین پر نبیل کے گھر کا فون نمبر دیکھ کر اس نے موبائل اپنی جیب میں ڈالا اور دوبارہ اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔

حنا کو سحرش نے دور کھڑے حماد کو آتے دیکھ کر بتا دیا تھا کہ یہ حماد ہے۔

''جی مس حنا کیسی ہیں آپ۔'' حماد نے حنا کو دیکھتے ہی اطمینان سے پوچھا۔

حماد کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر حنا بھی دل ہی دل میں سمجھ گئی کہ کام ہو گیا ہے۔

''جی میں ٹھیک ہوں کہاں ہے وہ موبائل۔'' حنا پوچھے بنا رہ نہ پائی تھی۔

''یہ لیں وہ موبائل۔'' نبیل کا فون حنا کے حوالے کرتے ہوئے حماد مسکرا دیا۔

''تھینک یو۔'' حنا بہت مطمئن نظر آ رہی تھی۔

میں نے نبیل سے باتوں باتوں میں پوچھ لیا تھا کہ اس کے پاس اس ویڈیو کی کوئی بھی اور کاپی نہیں ہے۔'' حماد نے حنا کو مزید اطمینان دلاتے ہوئے بتایا۔

☆......☆......☆

نبیل اس وقت درجنوں بار اپنے اور حماد کے نمبر پر کال کر چکا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے دوست نے ایسا کیا اور کیوں کیا؟ نبیل کا نمبر سوئچ آف آ رہا تھا جب کہ حماد اپنے نمبر سے نبیل کی کال اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ حماد کے گھر کال کرنے سے کنفرم ہو گیا تھا کہ وہ اپنے گھر نہیں گیا۔

''یہ آخر کر کیا رہا ہے۔'' نبیل یہی سوچ رہا تھا اُس وقت سے۔

☆......☆......☆

''مجھے یقین نہیں ہو رہا کہ میری اس مصیبت سے جان چھوٹ گئی ہے۔'' سحرش نے موبائل کا ایک پرزہ بھی جلائے بغیر نہیں چھوڑا تھا۔

''دیکھا پھر حماد کا کمال۔ اور تم اس سے بات بھی نہیں کرنا چاہ رہی تھیں۔'' حنا نے سحرش کو ہنسانا چاہا۔

''ہاں ویسے ایک بات تو بتاؤ مجھے۔ موبائل تو اس نے آتے ہی دے دیا تو پھر یہ آدھا گھنٹہ کیا باتیں ہوتی رہیں۔'' سحرش نے سوال داغ دیا۔

''ہاں باتیں ہوئی ضرور ہیں لیکن ابھی نہیں پھر بتاؤں گی وقت آنے پر۔'' حنا کے چہرے پر ہنسی تھی۔

آج کافی دنوں بعد سحرش نے حنا کو ریلیکس دیکھا تھا۔ یہ تبدیلی حمیرا نے بھی محسوس کی تھی۔ وہ بھی اس دن ان کے ساتھ آ گئی تھی۔ آج سحرش کے دل سے خوف کے لرزتے سائے غائب ہو چکے تھے۔ اتنے دنوں میں وہ حمیرا اور حنا کے ساتھ بہت ریلیکس انداز میں باتیں کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

نبیل یار مجھے ایک ضروری کال آ گئی تھی۔ بس نکلنا پڑا۔ اور تیرا موبائل کب میری جیب سے گرا بالکل پتا نہیں چلا۔ حماد نے بالآخر دوسرے دن نبیل کی کال اٹینڈ کی۔

''مجھے کہانیاں مت سناؤ مجھے میرا موبائل چاہیے جہاں سے بھی لاؤ۔'' نبیل کا غصہ آسمانوں پر تھا۔

یار تم پیسے لے لو مجھ سے یا تمہیں اُسی ماڈل کا نیا موبائل لے کر دے دیتا ہوں۔ اب اس کو میں کہاں سے لے کر آؤں۔'' حماد اپنی بنائی ہوئی کہانی پر قائم تھا۔

''میں نے سر پہ مارنا ہے نیا موبائل۔ تمہیں پتا ہے اس میں میرا کتنا اہم ڈیٹا تھا۔ پتا نہیں کس کے ہاتھ لگا ہوگا۔ یا پھر تم نے تو نہیں چھپا لیا اس ویڈیو کی وجہ سے۔'' نبیل کو حماد کی کہانی پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔

''پاگل ہو؟ اگر مجھے وہ ویڈیو چاہیے ہوتی تو میں اس کو شیئر کر لیتا اور موبائل تمہیں واپس کر دیتا۔'' حماد اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹ رہا تھا۔

''او کے تم ملو مجھے، باقی باتیں بعد میں مل کر کرتے ہیں۔'' پھر نبیل نے غصے سے فون بند کر دیا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ حماد جھوٹ بول رہا ہے لیکن وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ یہ سوال نبیل کو پریشان کر رہا تھا اس موبائل میں کئی قیمتی راز تھے اس کے۔ وہ کسی کے ہاتھ لگ گیا تو......

☆......☆......☆

یہ تیسرا موقع تھا حماد حنا سے ملنے یونیورسٹی آیا تھا۔ سحرش دور سے یہ دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ

حماد اچھا، وجیہہ نوجوان تھا۔ گندمی رنگت اور لانبا قد اُس کی وجاہت میں مزید اضافے کا سبب تھے۔ اُس کے جانے کے بعد سحرش حنا کے پاس آ گئی۔

''ہیلو میڈم کیا چل رہا ہے یہ سب؟ سحرش نے حنا کو کندھے پر مکا مارا۔

کہا تھا ناں وقت آنے پر سب بتا دوں گی۔'' حنا نے جواب دیا

''کب آئے گا وہ وقت؟'' سحرش نے اگلا سوال کر ڈالا۔

''بہت جلد، جسٹ ویٹ اینڈ واچ'' حنا یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆......☆......☆

''مما مجھے ابھی شادی نہیں کرنی ہے۔ میں جب بھی گھر آتی ہوں آپ یہی ٹاپک چھیڑ دیتی ہیں۔ مجھے کرنی ہی نہیں ہے شادی۔'' سحرش نے مسز ہمدانی کو جواب دیا۔

''بیٹا رشتہ بہت اچھا ہے۔ لڑکا بہت اچھی جاب کرتا ہے دیکھ لو۔ اب ہر بار تم انکار کر دیتی ہو لیکن اس بار نہیں چلے گی تمہاری۔'' مسز ہمدانی کا فیصلہ اٹل تھا۔

''بھیا آپ ہی سمجھائیں نہ مما کو۔'' سحرش نے نوید کی طرف دیکھتے ہوئے التجائیہ نظروں سے کہا۔

''سحرش مما ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ مان جاؤ ان کی بات۔ تمہارے ہاتھ پیلے کرنے تو ہیں ناں۔'' نوید ہمدانی بھی اپنی مما کی سائیڈ پر تھے۔

''واہ بھیا واہ پارٹی بدل لی؟'' سحرش نے شرارتی انداز میں سوال کیا'' اور آپ مجھ سے بڑے ہیں۔ پہلے آپ کی شادی ہو گی پھر میری۔''

تم دونوں کی شادی ایک ساتھ ہو گی۔ ابھی رشتہ آیا ہے، شادی نوید کا رشتہ طے ہونے کے بعد ہو گی۔'' مسز ہمدانی نے فیصلہ سنا دیا۔

''اب تو کوئی بہانہ نہیں ہے نہ تمہارے پاس۔'' نوید نے سحرش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

''آپ کا بیٹا ساتھ نہیں آیا؟ ہم بھی تو اس کو دیکھنا چاہتے ہیں۔'' مسز ہمدانی نے مہمانوں سے پوچھا۔

اصل میں اس کو ضروری کام تھا ایک۔ اس نے اپنے آفس سے ہی آنا تھا۔ بس آتا ہی ہو گا۔'' مسٹر جاوید نے جواب دیا۔

ماشاء اللہ گھر تو بہت اچھا اور صاف ستھرا ہے۔'' مسز جاوید کی نظریں اس وقت سے ہی گھر کا طواف کر رہی تھیں۔

''اچھا بلائیں نا بیٹی کو۔ اب اور انتظار نہ کروائیں۔'' مسٹر جاوید نے اپنی بیگم کی بات کو ان سنا کر دیا۔

''جی کیوں نہیں سحرش بیٹا! چائے لے آؤ۔'' مسز ہمدانی نے سحرش کو آواز دی۔

سحرش کے ساتھ حنا بھی تھی لیکن سحرش آج حد سے زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔ حنا نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا سحرش کو۔ اور اس کو دیکھ کے نظر بھی آ رہا تھا کہ کتنے اہتمام سے ہر چیز کا خیال رکھا گیا تھا۔

''السلام وعلیکم!'' سحرش نے چائے کی ٹرالی روکتے ہوئے سلام کیا۔ سب لوگ بیٹھ کر چائے پی رہے تھے کہ اچانک سحرش کے ہاتھ سے چائے کا کپ زمین پر آ گرا۔ اس کی آنکھیں مارے حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ کیوں کہ جو شخص ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا اس کو دیکھ کر اس کا سانس رکنا قدرتی تھا۔ تاہم حنا بالکل نارمل دکھائی دے رہی تھی یہ حماد جاوید تھا۔

''السلام وعلیکم! انکل اینڈ آنٹی، سوری مجھے آنے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔ دراصل میں آفس سے آ رہا ہوں۔'' حماد نے کن آنکھوں سے سحرش کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ سحرش خود کو بمشکل سنبھال پائی اور اسی لمحے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ حنا بھی اس کے ساتھ گئی تھی۔

''شرما گئی بچی!'' مسز جاوید کی بات پر سب کے چہروں پہ ہنسی آ گئی تھی۔

''یہ یہاں کیا کر رہا ہے حنا۔ یہ سب کیا ہے؟'' سحرش اپنے حواس بحال نہیں کر پا رہی تھی۔

''یار حماد ہے۔ اس کی فیملی ہے اور وہ لوگ تمہارا رشتہ لے کر آئیں ہیں۔ اس میں نہ سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے۔'' حنا کے لیے جیسے یہ بات بالکل نارمل تھی۔

''یار تم پاگل ہو؟ مجھے نہیں کرنی یہ شادی۔ وہ سب کچھ جانتا ہے پھر کیوں کر رہا ہے۔'' سحرش کا دل جیسے تھک سا گیا تھا۔

''پاگل ہو گئی ہو تم۔ میری اس سے اچھا رشتہ ملنے بھی نہیں والا ہے وہ سب جانتے ہوئے خود آیا ہے۔'' حنا سحرش

کو سمجھانے لگی۔
یار تم مرد کو نہیں جانتیں، آج یہ کسی بھی وجہ سے یہ سب کر رہا ہے کل وہی سب میرے سامنے آئے گا۔'' سحرش کی بات اپنی جگہ درست تھی۔
''اور میں تو سمجھ رہی تھی کہ وہ تمہارے ساتھ......'' سحرش نے حنا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔
''جی نہیں وہ میرے بھائی ہیں اور اب میرے ہونے والے بہنوئی۔'' حنا نے اب سحرش کی آنکھوں میں دیکھا۔
''لیکن یار میرا ڈر اپنی جگہ پہ ہے حنا! میں اس سے ایک بار بات کرنا چاہتی ہوں۔ اس سے پہلے کہ ممی ہاں کر دیں۔'' سحرش التجائی نظروں سے حنا کو دیکھ رہی تھی۔
''اوکے میں کچھ کرتی ہوں۔ تم ایسا کرو کہ اوپر جاؤ چھت پہ، میں بھائی کو لے کر آتی ہوں۔'' حنا نے سحرش کو تسلی دی۔
''ایکسیوزمی بھائی! کیا آپ تھوڑا ٹائم دیں گے ہمیں؟ آپ کو اپنا گھر بھی دکھا دوں۔'' حنا نے ڈرائنگ روم میں آتے ہی حماد کو مخاطب کیا تھا۔
''میرے خیال سے بچے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ حماد کو بھجوا دیتے ہیں۔'' جاوید صاحب نے اپنی بیگم نے کان میں سرگوشی کی۔
''جی بیٹا ضرور۔ حماد جاؤ بیٹا گھر دیکھ آؤ۔'' مسز جاوید نے حماد کو آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ تینوں چھت پر تھے لیکن کون کیا بولے ان کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔
''آپ دونوں اگر میری وجہ سے خاموش ہیں تو میں کباب سے نکل جاتی ہوں۔'' بالآخر حنا بولی۔
''نہیں نہیں تم کہیں نہیں جاؤ گی، ادھر ہی رُکو میرے ساتھ۔'' سحرش نے حنا کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔
''سحرش میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ آپ کے لیے بہت حیران کن بھی ہے اور بہت جلدی میں بھی ہوا ہے۔'' حماد نے بات شروع کی'' میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے یہ فیصلہ کیوں کیا لیکن اس کے لیے آپ کو میری پوری بات سُننی ہوگی۔''
''جی آپ بولیں میں سن رہی ہوں۔'' سحرش نے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔
''سحرش آپ کو پہلی بار میں نے اسی دن دیکھا تھا جب آپ کو نبیل......''
''پلیز! یہ نام آپ میرے سامنے مت لیں۔ مجھے اس نام سے بھی نفرت ہے۔'' سحرش نے بات کاٹ دی۔
''آئی ایم سوری۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔''
''دراصل میں بتانا چاہ رہا تھا کہ آپ پہلی نظر میں ہی مجھے بہت اچھی لگی تھیں لیکن اس وقت میں یہی جانتا تھا کہ وہ آپ سے شادی کرنا چاہ رہا ہے۔ لہٰذا ایسی کوئی سوچ پیدا ہونے سے پہلے ہی میں نے ختم کر دیا تھا۔ آپ سے ملنے میں کئی بار میں نے اس کی مدد کی تھی جس کا احساسِ شرمندگی مجھے ہمیشہ رہے گا۔ میں نے آپ سے شادی کا فیصلہ اس وجہ سے نہیں کیا کہ میں اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں یا مجھے آپ سے اس وجہ سے ہمدردی ہو رہی ہے کہ آپ کے ساتھ بہت برا ہوا۔'' حماد تفصیل سے بتانا چاہ رہا تھا۔
''پھر؟ ایسا کیا ہے جو آپ نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایسا فیصلہ کیا۔'' اس بار سحرش نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔
''سحرش جس جذبے کو میں دبانا چاہ رہا تھا وہ شاید یہ جان کر دوبارہ جاگ اٹھا کہ آپ اس کی نہیں ہیں۔ آپ کسی سے بھی شادی کریں مگر یہ گزرا ہوا کل آپ کے دل میں ڈر بن کر بیٹھا رہے گا کہ اگر یہ کل کسی طرح میرے سامنے آگیا؟'' حماد کی بات پر سحرش چونک گئی تھی۔
''آپ کس کس کو اور کیسے کیسے یقین دلاؤ گی کہ آپ بے قصور ہیں؟ یہ بات صرف میں جانتا ہوں کہ آپ بے گناہ اور بے قصور ہیں۔ سب کچھ جانتے ہوئے آپ کو دل و جان سے اپنانا چاہتا ہوں۔'' حماد کی آنکھوں میں پیار اُمڈ آیا تھا۔ ''کیا میں آپ کے پیار کے قابل ہوں؟'' سحرش کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔
''میں ابھی آتی ہوں۔'' حنا نے اب وہاں سے جانا مناسب سمجھا۔
''آپ کی عزت میرے نظر میں اتنی ہے کہ میں آپ کو اپنے گھر کی عزت بنانے آیا ہوں۔ آپ کا مقام میرے دل میں ہے تو اپنی زندگی آپ کے نام کر رہا ہوں۔'' حماد کے پہلی بار سحرش کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔
ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔ سحرش کے بال ہوا سے کھیل

رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے محبت اپنے تمام تر جلوں کے ساتھ ہوا میں رقص کر رہی ہو۔ حماد نے پہلی بار کسی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔ سحرش کے آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

☆......☆......☆

"کرن بیٹا چینل کیوں چینج کر رہی ہو بار بار۔ ادھر لاؤ ریموٹ مجھے دو۔" سحرش اپنی دو سال کی بیٹی سے ریموٹ پکڑنا چاہ رہی تھی جو بار بار چینل بدل رہی تھی کہ اچانک ایک نام سن کر اس کا رنگ اڑ سا گیا۔

"ادھر دو ریموٹ بیٹا۔" سحرش نے دوبارہ وہی چینل لگایا۔

"ہم اس وقت نبیل احسن کے گھر کے سامنے موجود ہیں اور کوشش کر رہے ہیں ہماری بات نبیل کی والدہ سے ہو جائے۔" نیوز رپورٹر ایک گھر کے باہر کھڑا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ! یہ سب کیا ہے سحرش کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"ناظرین ہم آپ کو دوبارہ بتاتے چلیں کہ ایک لڑکی کی غیر اخلاقی ویڈیو بنا کر اس کو بلیک میل کرنے کے الزام میں پولیس نے نبیل احسن کو حراست میں لے لیا ہے اور یہ سب ممکن ہوا ہمارے چینل کی وجہ سے۔ ہم نے اس لڑکی کی شکایت پر اس لڑکے کے گھر پہ ریڈ کروایا اور اس کے پاس موجود موبائل اور لیپ ٹاپ سے وہ ویڈیو برآمد کر لی گئی۔" نیوز رپورٹر کی بات سن کر سحرش کا سانس جیسے رک سا گیا۔

پچھلے تین سال میں سحرش کو حماد سے جتنا پیار ملا تھا اس کو یاد تک نہیں رہا تھا کہ کوئی نبیل بھی اس دنیا میں رہتا تھا۔ لیکن آج وہ جو کچھ دیکھ رہی تھی اس سے سحرش کے دل کو اطمینان ضرور پہنچا تھا لیکن اس کے زخم بھی ہرے ہو گئے تھے۔ وہ یہ سب کچھ بھلانا چاہتی تھی اور حماد کے پیار نے اسے اس مقصد میں کامیاب بھی کر دیا تھا۔ اب ان کے پاس ایک بہت پیاری بیٹی تھی۔ سحرش بہت خوش لگ رہی تھی اپنی زندگی سے۔ وہ خوشیاں اس نے سپنوں میں چاہی تھیں آج حقیقت میں اس کا مقدر بن گئی تھیں۔

"آیئے ناظرین اب ہم بات کرتے ہیں اس علاقے کے ڈی ایس پی جناب رانا ارشد صاحب سے۔" سحرش کا دھیان دوبارہ ٹی وی کی طرف ہوا۔

"سر یہ واقعہ جو پیش آیا ہے۔ آپ اس کے بارے میں کیا کہنا چاہیں گے۔ اس سے پہلے بھی یہ شخص ایسی حرکات کر چکا ہے۔ یہ لڑکی جس نے شکایت کی ہم اس کا نام ظاہر نہیں کر سکتے لیکن اس سے اتنا ضرور کہوں گا کہ بیٹی آپ کی بھی غلطی شامل ہے اس میں۔ آپ نے فیس بک سے ایک انجان شخص سے دوستی کی اور پھر ملنا اس حد تک کہ وہ آپ کو بلیک میل کر سکے۔ تین ماہ تک وہ یہ سب کھیل کھیلتا رہا۔ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ پہلے دن سے ہی ایسا اقدام کرتیں۔ وہ بچیاں جو گھر پر بیٹھی میری یہ بات سن رہی ہیں ان کے لیے میرا مشورہ ہے کہ بیٹا آپ جدید ٹیکنالوجی کا استعمال ضرور کرو لیکن اپنے آپ کو کسی کے ہاتھ کا کھلونا نہ بننے دو۔ آپ کسی انجان پہ بھروسہ کریں تو اپنی حفاظت کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ انجان شخص جو آپ کو بظاہر اچھا نظر آ رہا ہے۔ کیسا بھی ہو سکتا ہے۔ سوشل میڈیا پر ہر کوئی ہی اپنا اچھا عکس سامنے رکھتا ہے۔" سحرش کو یہ باتیں سن کر اپنی غلطی کا احساس بہت شدت سے ہو رہا تھا۔

اس کو ایک غلطی کرنے کے بعد وہی غلطی دوبارہ نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ کسی سے بھی مدد لے سکتی تھی ٹی وی کو آف کرنے سے پہلے اس نے نبیل کی والدہ کو دیکھا تھا جو نبیل کی گرفتاری کے بعد رو رہی تھیں۔ ان کا بھی اکلوتا بیٹا تھا وہ۔

"کیا ہوا ہے سحری کیوں پریشان ہو؟" حماد نے آفس سے آتے ہی سحرش کا بجھا چہرہ دیکھا تو پریشان ہو گیا۔

"کچھ نہیں، میں ایسے ہی، آپ کیسے ہیں کیسا رہا دن؟" سحرش نے حماد کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

"بتاتا ہوں لیکن ڈائننگ ٹیبل پر ابھی کھانا لگا دو بہت بھوک لگ رہی ہے اور میری گڑیا کہاں ہے۔" حماد کی نگاہیں کرن کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

"وہ سو گئی ہے۔ آپ چینج کریں میں کھانا لگاتی ہوں۔" بریف کیس حماد کے ہاتھوں سے پکڑ کر سحرش نے حماد کو اشارہ کیا۔

وہ اپنی زندگی سے بہت مطمئن تھی۔ یہ حماد ہی تو تھا جس نے اس کا انسانیت پر بھروسہ ٹوٹنے نہیں دیا تھا۔ اس کی زندگی کی پہلی کرن اور آخری سویرا صرف حماد تھا۔ سحرش حماد کو دیکھ کر فخر سے مسکرائی اور اس فخر نے نبیل کا چہرہ بری طرح مسخ کر دیا تھا۔

☆☆......☆☆......☆☆

چراغِ وفا جلاؤں کہاں

رئیسہ خالد

"تم نے مجھے پہنچانا ڈاکٹر۔"
"نہیں۔"

"کہیں مجھے دیکھا ہے۔"
"نہیں مجھے یاد نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

’’لیکن میں تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں۔ مجھے آج بھی تمہارا وہ معصوم چہرہ یاد ہے۔ تمہاری وہ بھولی باتیں یاد ہیں، جن میں عزم تھا۔ ہمت تھی، زمانے کی ناسازگاری کا شکوہ تھا۔ تم نے کہا تھا نا، مجھ سے مریضوں کی پریشانی، تکلیف، اور بے چارگی دیکھی نہیں جاتی۔ نرس میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور پھر مجبوروں، بے کسوں اور ناداروں کی خدمت کروں گا۔ ان کے دکھ درد بانٹوں گا۔ ان کی بے بسی میں سہارا بنوں گا۔ ان کے غم میں شریک رہوں گا۔ جب یہ باتیں تم کہتے تو بہت جذباتی ہو جاتے تھے اور تمہارا چہرہ سرخ ہو جاتا۔‘‘

’’ہاں۔ مگر تم یہاں کہاں۔‘‘

’’میرا یہیں تبادلہ ہو گیا ہے۔ لیکن تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے ڈاکٹر؟‘‘

’’مجھے اچھی طرح یاد ہے۔‘‘

’’تم کہاں رہتی ہو۔ ممی سے ملیں؟‘‘

’’میں تمہاری ممی سے نہیں ملوں گی۔ انہوں نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ میں کبھی بھول نہیں سکتی۔‘‘

’’یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ چلو مجھے یہاں کوئی اپنا تو ملا۔ اچھا ابھی تو میں ایک ضروری کال پر جا رہا ہوں۔ واپس آ کر اطمینان سے باتیں کروں گا۔‘‘

ڈاکٹر ارشاد گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ لیکن میں اب تک ماضی میں نہ جانے کیا دیکھ رہی ہوں۔

☆......☆......☆
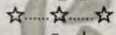
آپریشن بہت سیریس تھا۔ اسے بے ہوش کر کے آپریشن کیا گیا تھا اور جب اسے اسٹریچر پر لٹا کر اپنے بیڈ پر لایا گیا تو گھنٹوں بعد اسے ہوش آیا تھا۔ وہ درد کی شدت سے لوٹنے لگا تھا۔ میں نے اس کے سارے جسم پر اپنا وزن دیا تھا تاکہ وہ حرکت نہ کر سکے۔ لیکن وہ ٹھہرا ایک نوجوان مرد اور میں ایک کمزور عورت۔ آخر میں نے اس سے التجا کی کہ وہ چپ چاپ لیٹا رہے۔ پاس بیٹھی اس کی ممی اور بہن اب تک رو رہی تھیں، لیکن پھر وہ ایسا بے حس و حرکت سا ہو گیا تھا کچھ ایسا بے حس و حرکت کہ میں گھبرانے لگی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر اس کی ماں اور بہن کے آنسو نہ تھم رہے تھے۔

رات کے تقریباً ساڑھے تین بجے اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے پوچھا۔

’’ممی کہاں ہیں۔‘‘

’’وہ سو گئی ہیں ابھی ابھی۔ رات بھر وہ جاگتی رہی ہیں۔‘‘

’’لیکن تم جاگ رہی ہو۔ تم کتنی اچھی ہو۔‘‘ اس نے فرطِ جذبات سے مارتھا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شاید وہ اس وقت رو پڑی تھی۔

’’تم رو رہی ہو نرس۔ مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ میں اچھا ہو جاؤں گا۔‘‘

مارتھا کو اس کے پاس بیٹھنا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر ایک طرف جانے لگی۔ وہ جانتا تھا کہ مارتھا اب بھی رو رہی ہوگی۔ شاید اس کے دل میں ایک ٹیس سی اُٹھی تھی۔ اس نے مارتھا کو بہت نحیف آواز میں پکار لیا۔ شاید میں کوشش کر کے اس کے پاس نہ جاؤں تو بھی میں ایسا نہیں کر سکتی تھی اور میں اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔

’’تم روتی ہو میرے لیے۔ تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے۔ میں تمہیں کبھی نہ بھول سکوں گا۔‘‘ وہ مزید بولا۔ ’’تم نہ روؤ نرس! تم روتی ہو تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ مسکراؤ، ہنسو میرے لیے۔‘‘

پھر مجھے سچ مچ ہنسی آ گئی اور وہ مجھے بہت غور سے دیکھنے لگا۔

’’کیا دیکھ رہے ہو؟‘‘

’’کچھ نہیں نرس۔‘‘

’’نرس نہیں مجھے کچھ اور کہو۔‘‘

’’کچھ اور کیا کہوں؟‘‘

’’میرا نام ہی سہی، میرا نام مارتھا ہے۔‘‘

’’اور میں ارشاد ہوں۔‘‘

پھر رفتہ رفتہ وہ مجھ سے مانوس ہو گیا۔ اکثر وہ مجھ سے کہتا۔

’’مجھ سے مریضوں کی یہ پریشانی، تکلیف اور بے چارگی نہیں دیکھی جاتی۔ میں ڈاکٹر بنوں گا اور مجبوروں، بے کسوں اور ناداروں کی خدمت کروں گا۔ ان کے دکھ درد بانٹوں گا۔ ان کی خوشی میں شریک ہوں گا۔‘‘

یہ کہہ کر اس نے بڑی سختی سے اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ لیں، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس کی آنکھیں انگارے برسانے لگیں۔ ایک روز وہ اپنے دوستوں سے کہنے لگا۔

’’مارتھا کی والہانہ محبت، خلوص و ایثار اور بے پناہ خدمت نے مجھے بہت جلد تندرست کر دیا ہے۔‘‘

پھر ایک دن میں اُسے اشک بار آنکھوں سے رخصت

گر رہی تھی اور اس کی آنکھیں چھلکتا ساغر بن گئی تھیں۔

میرے اندر جذبات کا ایک طوفان سا اُمڈ رہا تھا۔ میں نے ارشاد کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر فرطِ جذبات سے دبایا پھر اس کا دامن تھام لیا اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

"مجھے بھول تو نہ جاؤ گے ارشاد۔ تم جا رہے ہو بہت دور، پھر نہ جانے کب ملو گے۔ میں چاہتی ہوں، میں چاہتی ہوں کہ ہمیشہ......" اور پھر اس نے نچلے ہونٹ اس زور سے دانتوں سے دبائے کہ خون نکل آیا، جیسے میں جذبات پر قابو پانے کی انتہائی جدوجہد کر رہی تھی۔

"تم ڈاکٹر بنو گے۔"

"ہاں۔"

یسوع مسیح تمہیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے، لیکن مجھ سے ایک وعدہ کرو۔"

"کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"تم مجھ سے وعدہ کرو کہ جب تم ڈاکٹر بن جاؤ گے تو مجھے اپنے ساتھ ہی رکھو گے۔"

"ایسا ہی ہو گا مارتھا! میں وعدہ کرتا ہوں اور پھر زندگی کے کسی بھی لمحے میں تمہیں نہ بھول سکوں گا۔" اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے کہا۔

وہ اپنے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے اب بھی اپنا وعدہ یاد ہے، لیکن سوچو تو، اس اکیلے مکان میں میرے ساتھ تمہارا رہنا کہاں تک مناسب ہو گا۔ زمانے کی نگاہیں بدل جائیں گی۔ ان کے دلوں میں ہماری وہ عزت، وہ وقار نہ رہے گا، جو پہلے تھا۔"

"کیا تم میں اتنی طاقت ہے کہ تم سماج کی گندے ذہن کی پہنچ سے دور جا سکو۔ سماج کی تیز نگاہوں سے بچ سکو۔" مارتھا کہہ رہی تھی۔

"ہمیں سماج میں رہنا ہے۔ سماج کی نفرت مول لے کر ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ ہماری کچھ عزت ہے، وقار ہے۔ کیا تمہارے گھر کے لوگ اس بات کو پسند کریں گے۔" اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تم صرف اپنی بات کرو۔ میرا اب اس دنیا میں ہے ہی کون؟" وہ یاس انگیز نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتی رہی۔

"ٹھیک ہے مجھ سے تمہاری حالت نہیں دیکھی جاتی۔ اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے بڑی چاہ سے کہا اور مارتھا کا ہاتھ اپنے نرم و گرم ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس طرح وہ ہم دونوں ذہنی آمادگی اور ملی یگانگت کے ساتھ ایک دوسرے کے ہمراہ چلنے لگے۔

کچھ ہی عرصہ گزرا کہ انہیں لوگوں کے طعنے ملنے لگے۔ لوگوں کی انگلیاں اُن کی طرف اٹھنے لگیں۔ لیکن وہ ان تمام باتوں سے بے پروا اور بے نیاز رہے۔ کیونکہ یہ تو زمانے کا دستور ہے کہ وہ کسی کو ہنستا مسکراتا برداشت نہیں کرتا۔

"اُف آج کل تمہاری خوراک بہت کم کیوں ہو گئی ہے۔ یہ پھل کھاؤ، یہ مٹھائی میں نے خود تمہارے لیے بنائی ہے۔" ناشتے کی میز پر مارتھا ڈاکٹر سے کہتی۔

ایک رات جب ڈاکٹر کسی مریض کے ہاں جانے کے لیے گاڑی نکال رہا تھا تو مارتھا اس پر برس پڑی۔

"تمہیں کسی وقت سکون نہیں، کبھی آرام نہیں، مریض مریض، بس ہر وقت مریض...... کھانا، پینا، سونا کچھ وقت پر نہیں۔"

"آخر تمہیں کیوں میرا اتنا خیال ہے مارتھا۔" ڈاکٹر چڑ کر بولا۔ تو وہ اچانک خاموش ہو گئی اور اُس کی آنکھیں اُبل پڑنے کو تیار ہو گئیں۔

"ارے ارے پھر وہی آنسو...... نہیں...... خدا کے لیے...... ارے میں تو مذاق کر رہا تھا اور تم برا مان گئیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تمہارا دل اتنا نازک ہے۔ اب کبھی میں تم سے ایسی باتیں نہیں کروں گا۔ اب ہنس دو ایک بار میرے کہنے سے تا کہ میں سمجھ سکوں کہ تم مجھ سے خفا نہیں ہو۔"

مارتھا کو اس کی معصومیت پر ہنسی آ گئی، اس کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"تم کتنی اچھی ہو مارتھا، کتنی معصوم۔ اب میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"اچھا...... تو پھر ٹھیک ہے، لیکن آج کے بعد تم اب رات کے دس بجے کے بعد مریض کے یہاں نہیں جاؤ گے۔"

"اوہ...... یہ کیسی شرط لگا دی تم نے، حالانکہ تم خوب اچھی طرح جانتی ہو مارتھا کہ ہماری زندگیاں دوسروں کے لیے ہیں۔ ہمارا آرام دوسروں کی خوشیاں لوٹ لے گا۔ خدا نے ہمیں دوسروں کی خدمت کے لیے بنایا ہے۔ خدمت ہمارا اولین فرض ہے۔ کیا تم چاہتی ہو ہم اپنے فرض سے منہ موڑ لیں۔ بولو جواب دو۔" اور وہ اس کی دلیلوں کے آگے

لاجواب ہوگئی۔

پھر جب وہ مریض کے یہاں سے کافی رات گئے واپس آیا تو اس کا جسم درد سے چور چور ہو رہا تھا۔ اس کے جوڑ جوڑ میں اینٹھن تھی۔ جب وہ بستر پر لیٹا تو اسے اپنی کچھ سدھ بدھ نہ رہی۔ جانے رات کا کون سا پہر تھا۔ ڈاکٹر یکدم اُٹھ بیٹھا۔

''کون مارتھا۔''

''ہاں۔''

''لیکن اتنی رات گئے تم کیا کر رہی ہو۔''

''تم بہت تھک گئے تھے نا۔''

''لیکن تم میری نوکرانی تو نہیں ہو اور پھر اس طرح تنہائی میں تمہارا میرے کمرے میں آنا اچھا بھی نہیں ہے۔''

''آخر کیوں۔''

''کیوں کا جواب میں نہیں دے سکتا۔ جاؤ اپنے کمرے میں جاؤ۔'' اور مارتھا خاموش بھاری بھاری قدم اٹھائے جانے لگی۔

''اچھا سنو!'' ڈاکٹر نے نہایت دھیمی آواز میں کہا۔ وہ رُک گئی۔

''میرے قریب آؤ۔'' اور وہ اس کے قریب چلی آئی۔ ڈاکٹر نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے دبایا۔

''یہ آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

''تم نے مجھے بھی کچھ نہیں کہا۔ مگر تم نے میری خاطر اپنا آرام سکون سب تباہ کر رکھا ہے، جاؤ اب آرام کرو۔ تمہیں بھی اتنی رات تک نہیں جاگنا چاہیے۔'' اس نے روہانسی آواز میں کہا۔ اور اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

پھر نہ جانے کیوں اُس کے آنسو بہہ نکلے۔ وہ پریشان سا کمرے میں ٹہلتا رہا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس نے مارتھا پر بہت ظلم کیا ہے۔ اسے اس کے جذبات کی قدر کرنی چاہیے۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور مارتھا کے کمرے کی طرف بڑھا۔ کمرہ بند تھا لیکن اندر روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے کھڑکی کے شیشوں سے اندر جھانکا۔ مارتھا خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے بال اُلجھے ہوئے تھے اور چہرہ جذبات سے یکسر عاری تھا۔ وہ کسی تصویر کو گھورے جا رہی تھی...... اور وہ تصویر ڈاکٹر کی تھی۔ اچانک اس نے اپنے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ آنکھیں وحشت ناک ہوگئیں۔ لب وا ہوئے۔

''اوہ گاڈ...... میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے، تُو نے کیوں مجھ پر اتنا ظلم کیا۔ یسوع مسیح تم میری مدد کرو۔ مجھے ضبط کی طاقت دو۔'' وہ بلبلا اُٹھی۔ پھر اچانک مسکرائی۔ چہرے پر وہی حوروں کا تقدس لیے وہ تصویر کی طرف بڑھی۔ اور پھر اس کے لبوں نے تصویر کو نم کر دیا۔

''اے یسوع مسیح تم میری مدد کرو۔ مجھے ضبط کی طاقت دو۔''

ڈاکٹر عجیب کشمکش میں تھا۔ وہ خاموش مبہوت سا لوٹ آیا۔ اس کے کانوں میں مارتھا کے الفاظ گونج رہے تھے اور نرس کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ مارتھا کا خیال اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔ اس نے مارتھا کے خیال کو دل و دماغ سے کھرچ کر نکال دینا چاہا لیکن وہ اور اُلجھتا گیا۔

رات میں وہ پھر دیر سے گھر لوٹا اور جب بستر پر گیا تو کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے کسی کا انتظار تھا اور پھر اس نے سوچا اب مارتھا نہ آئے گی۔ اس نے مارتھا کا دل دکھایا ہے۔ اُس کے دل میں انہونا سا خیال آیا۔ کاش مارتھا آجاتی۔

اسی وقت کسی نے دروازہ نہایت آہستگی سے کھولا۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا، وہ مارتھا ہی تھی۔ پھر اس نے آنکھیں موند لیں اور ایسا ظاہر کیا جیسے بہت گہری نیند میں ہے۔ مارتھا اس کے قریب آگئی۔ اس کے بستر کی شکن درست کی، چادر جسم سے نیچے ڈھلک آئی تھی، اس نے اچھی طرح جسم کو چادر سے ڈھک دیا۔ اس کے سرہانے آگئی۔ بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں پھیرنے لگی، اس طرح کہ اس کی نیند میں خلل نہ پڑے اور پھر اپنے چہرے کو ڈاکٹر کے بہت قریب لے آئی۔ اسے کسی کی گرم گرم سانسوں کا احساس ہوا۔ پھر کسی نے اس کی پیشانی پر جلتے ہوئے ہونٹ رکھ دیے۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی پیشانی پر دہکتے ہوئے انگارے رکھ دیے ہوں اور پھر اس کے چہرے پر ٹپاٹپ کچھ آنسوؤں کے قطرے گرے اور پھر کوئی دوڑتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

ڈاکٹر نے ایک لمبی سانس لی اور اُٹھ بیٹھا۔ کمرے میں اب کوئی نہ تھا۔ اس کی بھی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس نے بہت آہستہ سے پکارا۔

''مارتھا، میں تمہارے جذبات کو سمجھتا ہوں۔ میں اتنا ظالم بھی نہیں ہوں، لیکن میں تم سے شادی کیسے کر سکتا ہوں۔ تم ہی سوچو، تمہاری اور میری عمر میں کتنا فرق ہے۔ گو دیکھنے میں تم ایسی نہیں معلوم ہوتیں۔ تم کافی حسین بھی

ہو، جوان بھی...... لیکن میں کیا کروں۔ میں کیا کروں اور پھر تمہارے ان نازک جذبات کا کیا ہوگا۔''

ساری رات ڈاکٹر بے چین سا تڑپتا رہا۔ سوچتا رہا اور رات گزر گئی۔

دوسری رات پھر مارتھا معمول کی طرح آئی۔ اس نے جانا کہ ڈاکٹر سو رہا ہے۔ اس نے ڈاکٹر کی چادر درست کی۔ بالوں میں انگلیاں پھیریں اور پھر جب جانے لگی تو ڈاکٹر کی پیشانی پر اُسی نمی کا احساس ہوا جس میں جلن بھی تھی اور ٹھنڈک بھی۔ اس نے بڑھ کر مارتھا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''مارتھا بیٹھو آج مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

مارتھا ایک مجرم کی طرح سہمی سہمی بیٹھ گئی۔ اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ نگاہیں جھکی ہوئی اور سینے میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔

''تم نے میری راتوں کی نیند اُڑا دی ہے۔ میرا سکون، میرا چین، میرا آرام سب تم نے چھین لیا ہے، مارتھا اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، میں صرف تمہارے بارے میں سوچتا ہوں۔'' ڈاکٹر جذبات میں بہہ رہا تھا اور مارتھا خاموش تھی۔

''تم بولتی کیوں نہیں، خاموش کیوں ہوگئیں۔'' مارتھا کی آنکھوں سے گرم گرم آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے ٹپکے، لیکن وہ خاموش ہی رہی...... گویا آنسو ہی اس کا جواب تھے۔

اس نے مارتھا کے جھکے ہوئے چہرے کو اس کی تھوڑی پر اپنی ہتھیلی لگا کر اوپر کی طرف اٹھایا۔ مارتھا کی بند آنکھیں نم تھیں۔ ڈاکٹر نے اس کے چہرے پر اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں نے ایک فیصلہ کرلیا ہے۔'' ڈاکٹر یہ کہہ کر مسکرایا۔

''کیسا فیصلہ؟'' آخر مارتھا نے خاموشی توڑی۔

''میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''کس سے؟'' مارتھا نے حیرت سے پوچھا۔

''تم سے مارتھا...... تم سے، تم ہی میرا سکون...... تم ہی میری زندگی ہو۔''

''شادی مجھ سے۔'' مارتھا حیرت کا مجسمہ بن گئی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور دوسرا چلا گیا۔

''ہاں تم سے...... تم مجھ سے بڑی ہو تو کیا ہوا۔ میں نے تمہارے جسم سے نہیں، تمہاری روح سے محبت کی ہے۔''

''چٹاخ۔'' مارتھا نے ایک بھرپور طمانچہ ڈاکٹر کے گال پر جڑ دیا۔ ڈاکٹر تلملا اُٹھا۔ وہ حیران سا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ مارتھا جا چکی تھی۔ ڈاکٹر کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا، کچھ دیر وہ عجیب کشمکش میں کھڑا رہا۔ پھر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا مارتھا کے کمرے کی طرف بڑھا۔ کمرہ اندر سے بند تھا۔ اس نے اندر جھانکا۔ کمرے میں مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مارتھا کا چہرہ بہت خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔ اُس کے کٹے ہوئے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ آنکھیں وحشت زدہ ہو رہی تھیں۔

''شادی اور تم سے۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

ڈاکٹر کی تصویر اس کے ہاتھوں میں تھی، پھر اس نے ایک دوسری تصویر نکالی جو ڈاکٹر کی تصویر سے بہت ملتی جلتی تھی۔ اُس نے پھر کہا۔

''میرے جون...... میرے بیٹے...... شادی میں، شادی کیوں کروں گی تم سے۔ ہاہاہا۔'' اور ایک فلک شگاف قہقہہ کمرے میں گونج اُٹھا۔

ڈاکٹر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس کی تصویر کو بڑی حقارت سے دیکھ رہی ہو۔

''نہیں۔ ہرگز نہیں یسوع مسیح تم میری ہیلپ کرو۔ میں بہت پریشان ہوں۔'' مارتھا نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا دیے۔

ڈاکٹر کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا اور وہ بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

''میں سوچتی ہوں کہ ڈاکٹر ارشاد سے سب کچھ کہہ دوں۔ اسے سب کچھ بتا دوں لیکن میں یہ نہیں کرسکتی۔ اُف خدایا! میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ ڈاکٹر تو میرے بیٹے کا ہم شکل ہے۔ میرے دل میں ممتا کی محبت ہے۔ میں ممتا کے جذبے سے بے حال ہوں۔ میں تجھے ممتا کا پیار دینا چاہتی ہوں۔ مگر...... کیسے...... تُو یہ بات کیسے سمجھے گا، کیوں میں سمجھانے کی سکت نہیں رکھتی۔ میں کتنی مجبور ہوں۔ کتنی بے بس و بے کس ہوں۔ لاچار ہوں بے حال ہوں...... کہ میں کچھ بھی تو نہیں کہہ سکتی۔

☆☆......☆☆

سفرنامہ

برطانیہ میں خزاں

محمود شام
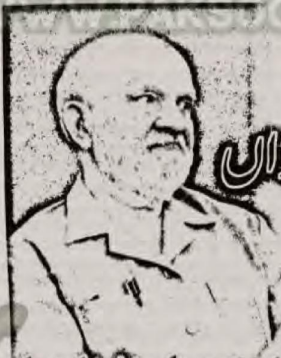
برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کی دعوت پر، عظیم صحافی اور شاعر محمود شام کے برطانیہ میں گزرے اُن لمحات کا ذکر جو امر ہو گئے

ایسا سفرنامہ جسے پڑھ کر قاری خود کو اُن ہی مناظر کا حصہ محسوس کرتا ہے

چوتھا حصہ

نائٹ کلب میں ویک اینڈ

سمندر دن بدن ایک دوسرے سے الگ ہو رہے ہیں۔
دل کی دھڑکنیں پورے مکان میں گونج رہی ہیں۔
میری اپنی سانسیں مجھے لپیٹ میں لے رہی ہیں۔
میں دھیرے دھیرے ہوش و حواس کھو رہا ہوں

عجائبات، حیرتوں، لذتوں، تفریحات، قہقہوں، مسکراہٹوں، رنگوں اور سواریوں کی اس دنیا کو اسی طرح ہنستے کھیلتے چھوڑ کر ہم اپنے دا کہال میں روانہ ہو رہے ہیں۔

جانے ہم پھر کبھی آسکیں گے یا نہیں۔ آنے والوں کو ضرور کہیں گے کہ وہ آلٹن ٹاورز کا دورہ ضرور کریں اور صاحبان جاگیر و باغات سے پھر کہیں گے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کے لیے ایسی تفریحات کا اہتمام کریں۔ کمائی کی کمائی نام کا نام۔ ثواب کا ثواب۔

واپسی میں ہمیں اتنی مشکل پیش آرہی ہے۔

راستے دیکھے بھالے ہیں A522 اور A52

اب ہماری منزل اسٹوک آن ٹورنیٹ میں دی نارتھ شیفرڈ ہوٹل ہے۔ سرسبز وادیاں اور تنگ راستوں پر دو طرفہ صنوبر اور دیودار کے درخت اپنی بانہوں میں لیے لیے ہمیں بڑی شاہراہ پر لے آئے ہیں۔ شہر کے مضافات اور پھر شہر کے بازاروں سے ہوتے ہوئے ہم اسٹوک آن ٹرینٹ کے ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے ہیں، جس کے عین سامنے یہ ہوٹل موجود ہے۔ یہ پرنسپل ہوٹلز کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ہوٹل زیادہ کشادہ نہیں ہے لیکن یہ اس علاقے کے روایتی ہوٹلوں میں سے ہے۔

سنہری بالوں، سفید اسکرٹ، سرخ ہونٹوں پر کھلتی مسکراہٹ کے ساتھ استقبالیہ پر مارگریٹ ہمارا خیر مقدم کر رہی ہے۔ اس کے پاس ہمارے نام موجود ہیں۔

”کیسا رہا آلٹن ٹاورز کا دورہ۔“

اسے ہمارا پروگرام بھی معلوم ہے۔

کارڈ بھرے جا رہے ہیں۔

”آپ صبح اخبار کون سا پڑھنا چاہیں گے۔ صبح کس وقت جاگیں گے۔“

وہ کمپیوٹر کو سب کچھ بتا رہی ہے۔

آج بھی دن کافی طویل ہو گیا ہے۔ اب کچھ آرام اور پھر شہر سے آشنائی۔

کمرے بہت چھوٹے ہیں اور سب سہولتیں انہی میں فراہم کرنے کی کوشش میں یہ اور تنگ ہو گئے ہیں۔

نارتھ شیفرڈ ہوٹل کو پرنسپل ہوٹلز نے ابھی اپنی تحویل میں لیا ہے۔ 60 کمرے ہیں جنہیں حال ہی میں از سرنو آراستہ کیا گیا ہے۔ پرنسپل ہوٹلز برطانیہ کے اکثر علاقوں میں ہوٹل کا انتظام سنبھالے ہوئے ہیں۔ برطانیہ کے باہر بھی کچھ ہوٹل دوسرے ملکوں میں موجود ہیں۔

مٹی کے برتنوں کے لیے یہ علاقہ برطانیہ بھر میں مشہور ہے۔ اسی تجارت کے سلسلے میں تاجروں اور صنعتکاروں کی آمد اس شہر میں رہتی ہے۔

ہوٹل کے باہر شام بھیگ رہی ہے۔ اسٹیشن ہمارے اسٹیشنوں کی طرح ہے۔ بھاگتے دوڑتے لوگ ملازمت کا ایک مہینہ پورا کر کے اپنے گاؤں جاتے جوڑے اکیلی عورتیں، ساتھ ہی یونیورسٹی ہے۔ نوجوان طلبہ و طالبات گھوم رہے ہیں۔ یہاں یہ عجیب بات دیکھنے میں آرہی ہے۔ لڑکیوں کے جھرمٹ الگ ہیں۔ لڑکے الگ چل رہے ہیں۔ کہیں جوڑے دکھائی نہیں دیتے۔ طالب علموں کے علاوہ بھی عام خواتین، عام مرد بھی الگ الگ گھوم رہے ہیں۔ شہر پر رات اترنے والی ہے۔ ویک اینڈ کی رات کی مناسبت سے اس ہوٹل میں کلب بینگر بار ہے میزبان خاتون کی آنکھوں میں کتنی چمک ہے۔ سوسن نام ہے۔

''آپ کہاں سے آئے ہیں۔ پاکستان تو بہت ہی خوبصورت جگہ ہے۔ وہاں سنا ہے بڑے اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ برف پوش چوٹیاں ہیں۔ کبھی میں ضرور جاؤں گی۔''

''آپ کہاں رہتی ہیں؟''

''میں ایک دوسرے شہر میں رہتی ہوں۔ ہفتے بعد گھر جاتی ہوں۔''

''لندن دیکھا ہے۔''

''ابھی تو نہیں۔ کچھ پیسے جمع کرلوں۔ پھر کبھی جاؤں گی۔''

''میں ابھی آتی ہوں۔ دوسرے مہمانوں سے پوچھ لوں۔''

''ہوٹل میں نائٹ کلب ہے۔''

''نہیں۔ آپ نائٹ کلب جانا چاہتے ہیں۔''

''دیکھنا تو چاہیے۔''

سوسن اپنے کاؤنٹر کی دراز سے ایک کارڈ لے کر آئی ہے۔ ہنلے میں ایٹروفیا روڈ پر 'ویلنٹینوز' کا رعایتی کارڈ۔ ساتھ والی بار سے دوسری میزبان خاتون آگئی ہے۔ وہ اس سے مشورہ کررہی ہے۔ یہ برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کے مہمان ہیں۔ میں انہیں ویلنٹائنز بھیج رہی ہوں۔

''بہت اچھا رہے گا۔ جیکی کے نام ایک سطر بھی لکھ دو۔''

ٹیکسی ڈرائیور پاکستانی ہے۔ جہلم سے آیا ہوا۔

''ویلنیڈز، چلنا ہے۔''

''بیٹھیے۔''

جب پتا چلتا ہے کہ ہم اس کے ہم وطن ہی ہیں۔ تو وہ پہلے اردو پھر پنجابی میں بات شروع کردیتا ہے۔

''بہت اچھے لوگ ہیں یہاں کے۔ ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔''

''کیا حالات ہیں پاکستان میں۔''

''بڑے اچھے حالات ہیں۔ امن وامان ہے۔''

''میاں نواز شریف نے سنا ہے کوئی ٹیکسی اسکیم شروع کی ہے۔''

''ڈیوٹی فری ٹیکسی قسطوں میں ملتی ہے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہے۔ اپنا کام اپنی ملکیت۔ کیا خیال ہے۔ ہم بھی وطن واپس چلیں۔''

''اچھا رہے گا۔''

''لو جی آپ کا نائٹ کلب آگیا۔ جاؤ تے بھنگڑا پاؤ۔''

''کتنے پاؤنڈ بنے ہیں۔''

''نہیں جی۔ میں آپ سے کرایہ نہیں لوں گا۔ آپ میرے وطن سے آئے ہیں۔ اخبار والے بھی ہیں۔''

نائٹ کلب کے باہر لمبے لمبے مسلح سیاہ فام گارڈ

کھڑے ہیں۔
اور ایک قطار ہے جوانوں کی۔ جوڑے بھی ہیں، اکیلے بھی۔ ان میں عمر رسیدہ بھی ہم ہی ہیں اور اجنبی بھی۔
کاؤنٹر پر پہنچتے ہیں۔ ہم جیکی کا پوچھتے ہیں۔ لمبے والوں والی مسکراتی ہوئی کہتی ہے۔ وہ آپ کو اندر ریستوران میں ملے گی۔''
''تین ٹکٹ۔''
''9 پاؤنڈ''
ٹکٹ کٹ جاتے ہیں۔ ادائیگی بھی کر دی ہے۔ ہمیں اس ایک سطر کا خیال آیا ہے جو سوسن نے دی تھی۔ ہم وہ چٹ نکال کر اس مسکراتی ہوئی حسینہ کے حوالے کرتے ہیں۔
وہ پڑھ کر مزید مسکراتی ہے اور زور سے کہتی ہے۔
''آئی ایم سوری۔''
''لائیے ٹکٹ واپس کریں۔'' پھر وہ کیشیئر سے پونڈ بھی واپس لے کر دیتی ہے اور ہمیں اعزازی ٹکٹ دیتی ہے۔
آپ ہمارے مہمان ہیں۔ جائیے پلیز انجوائے۔
''ایک اور سیاہ فام ٹکٹ دیکھتا ہے۔ پلیز انجوائے۔''
اندر تو بالکل ہی ایک مختلف دنیا ہے۔ ایک طرف ایک چھوٹی سی بار ہے، دوسری طرف بہت بڑا ہال ہے۔ جس میں جانے کتنے جسم ہیں جو تھرک رہے ہیں۔ کسی کو کسی کی پروا نہیں ہے کسی کی فکر نہیں ہے۔ روشنی بہت کم ہے۔ بتیاں جلتی ہیں، بجھتی ہیں۔ ایک ہنگامہ ہے، ایک شور ہے۔ اسٹیج پر آرکسٹرا اپنی دھنیں تخلیق کرنے میں مگن ہے۔ کچھ نوجوان زیادہ جوش میں آجاتے ہیں۔ وہ اسٹیج پر جا کر ناچنے لگتے ہیں۔ ہال کے چاروں کونوں میں اونچے پلیٹ فارم ہیں۔ یہاں ایک ایک حسینہ محو رقص ہے۔ موسیقی کی دھنیں تیز ہو رہی ہیں۔ جسم تیزی سے تھرک رہے ہیں۔ اس ہجوم رقص میں کوئی بھی داخل ہو سکتا ہے۔

یہاں سب اکیلے اکیلے رقص کر رہے ہیں۔ یہ سب اکیلے ہیں۔ یہ تو جوانوں کی رقص گاہ ہے۔ صرف لطف اندوز ہونے، زندگی کا مزا لینے کے لیے رقص ہو رہا ہے۔ اس لیے رقص کی کسی تکنیک قدم ملانے یا دھنوں سے جسم تھرکنے کی ہم آہنگی کی کوئی پابندی نہیں۔ دھنیں بلند ہو رہی ہیں، فضا میں پھیل رہی ہیں۔ پورا ہال ہل رہا ہے۔ دنیا تھرک رہی ہے۔ آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں۔ نہ کوئی جاننا چاہتا ہے نہ کوئی بتانا چاہتا ہے۔

زندگی رقص ہے
رقص ہے زندگی۔
سرخوشی، مستیاں۔
کوندتی، بجلیاں۔
رات ڈھلتی رہے۔
مے اچھلتی رہے۔
من مچلتا رہے۔
دل سنبھلتا رہے۔

'یہاں ہر شب ایسا ہوتا ہے۔'
''یقیناً لیکن آج تو ویک اینڈ ہے۔ آگے دو چھٹیاں ہیں۔''
''ہر ویک اینڈ پر یہی رونقیں رہتی ہیں۔''
''جی ہاں! رات دو اڑھائی بجے تک محفل یونہی جمی رہے گی۔ پھر سب گھر جا کر لمبی تان کر سو جائیں گے۔ ہفتے کی دو پہر اٹھیں گے اور باہر جائیں گے۔ ہفتے کی رات اتوار کا دن کھلی فضا میں گزاریں گے۔''
اس نوجوان کے پاس ہمارے لیے اپنا ہی وقت تھا۔ وہ پھر رقص کرنے والوں کے ہجوم میں کھو گیا ہے۔ لگتا ہے جیسے ہمارے سامنے ایک سمندر ہے، جس میں لہریں ابھرتی ہیں مر بیٹھ جاتی ہیں۔ ہم ساحل کی ریت پر کھڑے ہیں۔ کبھی کبھی پانی ہمارے قدموں تک آجاتا ہے۔ ہم اور پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔
اب دھنیں بدل گئی ہیں۔ اسٹیج پر روشنیوں کی ترتیب بھی تبدیل ہو گئی ہے۔ اب یہ پرانے ناچنے والوں سے خالی ہو گیا ہے۔ ایک خوبصورت اناؤنسر

نے مائیک سنبھالا ہے۔ رقص کرنے والی لہریں رُک گئی ہیں۔

اب آج کا مقبول ترین نغمہ "آسمانوں پر رقص کریں گے۔"

ہال میں خوشیاں بکھر گئی ہیں۔ سب چیخ رہے ہیں اور پھر ڈرم تیزی سے بجنے لگے ہیں۔ دھنیں تیز تر، گانے والی مائیک کے سامنے تو نہیں ہے آواز آرہی ہے۔ اور سب ایک وجد میں آگئے ہیں۔ دنیا پھر ہلنے لگی ہے۔

آسمانوں پر رقص کریں گے۔
ہاں ہم بادلوں سے قدم ملائیں گے۔
آسمانی بجلیاں جلتی بجھتی بتیاں بنیں گی۔
کہکشاں فرش رقص ہوگی
کیا مزا آئے گا۔
آسمانوں پر رقص کریں گے
ستاروں کی کمر پر ہاتھ ہوگا
چاند ہمارے بوسے لے گا۔
خلا ہمارے گیتوں سے گونجیں گی۔
راکٹ ہمارے لیے ہم رقص لے کر پہنچیں گے۔
چاند گاڑی ملکہ رقص کو لے کر آئے گی۔
فضا میں خوشبوئیں پھیل جائیں گی۔
آسمانوں پر رقص کریں گے۔
زمین آواز دیتی رہ جائے گی۔

"اوہ۔ ہمیں تو جیکی سے ملنا ہے۔ سوسن نے کہا تھا جیکی آپ کو کمپنی دے گی۔"

بارکاؤنٹر سے پوچھتے ہیں۔

"جیکی کدھر ہوگی۔"

"وہ کہتی ہے کہ یہاں تین جیکیز ہیں۔ آپ نے کس سے ملنا ہے۔"

"کوئی بھی ہو۔"

"وہ بتاتی ہے کہ اندر کے ہال میں چلے جائیں۔ وہاں بار کاؤنٹر پر ایک جیکی ہوگی۔ اندر ایک اور دنیا آباد ہے۔ ایک اور ریستوران، ایک اور بار ایک اور ڈانسنگ ہال۔

"ہمیں جیکی سے ملنا ہے۔"

انتہائی نرم دھیما برطانوی لہجہ۔ کھلی کھلی نیلی آنکھیں۔ کچھ کچھ کالے بال۔

"ہمیں سوسن نے آپ کی طرف بھیجا ہے۔"

"کون سوسن۔"

"ہوٹل نارتھ اسٹیفرڈ والی۔"

"اوہ۔ اس کی دوست جیکی۔ وہ سامنے کھڑی ہے۔"

سرو قامت، کھلے بالوں والی۔ کریم کلر کا اسکرٹ۔

"ایکسکیوزمی۔"

"آپ جیکی ہیں؟"

"ہمیں سوسن نے بھیجا ہے۔"

"ہوٹل نارتھ اسٹیفرڈ سے۔"

"یہ سوال ہم سے ہے۔"

"جی۔"

"میں کیا خدمت کرسکتی ہوں۔ آپ نے ٹکٹ تو نہیں خریدا۔"

"نہیں ہمیں اعزازی ٹکٹ ملے ہیں۔"

"اوہ گڈ۔"

جیکی اپنے رفیق کار سے معذرت کرتے ہوئے ہمیں ریستوران میں لے آئی ہے۔

"کیسا لگا آپ کو یہ۔"

"بہت خوبصورت ہے۔ ہم نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ آپ تو خوش قسمت ہیں کہ ہر شام یہاں گزارتی ہیں۔"

"خوش قسمتی کس بات کی۔ یہ تو نوکری ہے۔ ایک معمول بن گیا ہے ہمارے لیے۔"

"آپ کچھ لیں۔ یہ میری دوست سوسن کے نام پر ہوگا۔"

"سوسن۔ اچھی لڑکی ہے۔" "نہیں بہت دکھی لڑکی ہے۔

"وہ بہت دور ایک گاؤں میں رہتی ہے۔ جہاں اس کے بوڑھے ماں باپ ہیں۔ ان سے اس کی ہفتے بعد ملاقات ہوتی ہے۔ اسے یہاں بڑی لمبی ڈیوٹی

کرنی پڑتی ہے۔ میں بھی ایک گاؤں سے ہی آتی ہوں۔ یہ چمک دمک سب ظاہری ہے۔ اندر بہت اندھیرا ہے۔“

”آپ خود بھی دکھی لگتی ہیں۔“

”اسی لیے تو میری اور سوسن کی دوستی ہے۔ ہم دونوں ویک اینڈ اکٹھے گزارتی ہیں۔“

”آپ دونوں کے بوائے فرینڈ نہیں ہیں۔“

”تھے اب نہیں ہیں کہ بہت زیادہ کمرشل ازم ہو گیا ہے۔ دوستی خلوص نہیں ہے۔ پیسہ ہی سب کچھ ہو گیا ہے۔“

”آپ لوگ کتنے دن ہیں یہاں۔“

”بس آج کی رات۔ کل صبح چلے جائیں گے۔“

”بہت مختصر قیام۔ اسٹوک اون ٹرینٹ میں تو تین چار دن رُکنا چاہیے تھا۔ آلٹن ٹاورز تو گئے ہوں گے۔“

”بہت خوب صورت تفریح گاہ ہے۔“

ہم جیکی کا کافی وقت لے چکے ہیں، وہ اس وقت ڈیوٹی پر ہے۔ ہم اجازت لیتے ہیں، وہ کہہ رہی ہے۔ کچھ خدمت ہو تو بتائیں۔ یہ اندر والی رقص گاہ بھی دیکھیں۔ یہاں باہر کی نسبت کچھ سکون ہے۔ یہاں دھیمے سروں والی موسیقی ہے اور رقص بھی کچھ ہلکی رفتار سے ہے۔

ہم اس دکھی لڑکی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

دوسری رقص گاہ کے ساحل پر آ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہاں سمندر جیسا شور تھا۔ یہاں ایک دھیمے دھیمے بہنے والی ندی کی آوازیں ہیں۔ یہاں بھی جوڑے رقص نہیں کر رہے ہیں۔ اکیلے اکیلے، لڑکے اکیلے۔ رقص میں مستی ہے۔ محویت ہے۔ وہ سب ندیاں ہمیں یاد آ رہی ہیں۔ جن کے کنارے چلتے چلتے ہم وادیوں سے گزر کر آئے ہیں۔ نیلے پرنٹ کی اسکرٹ پہنے جو لڑکی ناچ رہی ہے۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ہیں۔ لیکن وہ رقص میں مگن ہے۔ کان دھنوں پر ہیں۔ قدم نپے تلے ہیں۔ شاخ گلاب سا بدن ہوا کے جھونکوں کے ساتھ لہرا رہا ہے۔ جانے کتنی دیر سے رقص کر رہی ہے۔

خاموش پانی گہرائیوں میں رواں رہتے ہیں
میں اپنی محبت کا شور نہیں مچاتی ہوں

یہاں بھی مغنیہ نظر نہیں آ رہی ہے۔ آواز آ رہی ہے۔ روشنیاں یہاں بھی باہر کے ہال کی طرح ہلکی ہیں اور گھوم رہی ہیں۔ رقص کرنے والے پورے کبھی بھی دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ کبھی آنکھیں، کبھی پاؤں، کبھی پنڈلیاں، کبھی گردن، کبھی مرکز وجود، ایک آئیڈیل کی تلاش میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ کہیں وہ آنکھیں مل جاتی ہیں۔ جن کی تلاش میں آپ صدیاں گزار چکے ہوتے ہیں۔ کبھی وہ ہونٹ نظر آ جاتے ہیں۔ جن کی پیاس میں آپ کتنے دشت چھان چکے ہوتے ہیں۔ کہیں وہ قامت مل جاتی ہے۔ جس کی خواہش میں کتنی قیامتیں آپ برداشت کر چکے ہوتے ہیں۔ سب چیزیں یکجا تو خوابوں میں ہی ملتی ہیں۔

میرے بھی کچھ خواب ہیں۔
جاگتے کے خواب مجھے اچھے لگتے ہیں۔
ان کے پورے ہونے کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔
خاموش گہرائیوں میں بہت تیز ہوتے ہیں۔
کبھی تو میرے اندر اتر، دیکھ دنیا کتنی حسین ہے۔
خواب کتنے رنگین ہیں۔
میری محبت کتنی بھرپور ہے۔

نیلے اسکرٹ والی تھک گئی ہے۔ وہ ادھر ہمارے قریب آ کر بیٹھی ہے۔ اس کی سانسیں ابھی ہلکورے لے رہی ہیں۔

”کتنی دیر سے رقص کر رہی ہیں آپ؟“

”جب سے کلب کھلا ہے۔“

”تھک گئی ہوں گی۔“

”تھکن تو اتارنے آتی ہوں۔ یہاں تو میں تازہ دم ہوتی ہوں۔“

”وہ کیسے؟“

”ہفتے بھر کام کرتی ہوں۔ پڑھتی ہوں۔ ایک مشین بنی رہتی ہوں۔ پورے پانچ دن دوسروں کے لیے جیتی ہوں۔ ایک آج کی رات میری اپنی ہوتی

ہے۔"

"معاف کیجیے۔ میں آپ سے اپنا آپ شیئر کرنے لگی ہوں۔"

"کافی اکیلی دکھائی دیتی ہو۔"

"سب اکیلے ہیں۔ جو اکٹھے ہیں وہ سب سے زیادہ اکیلے ہیں۔"

"معاف کیجیے۔ میں پھر جا رہی ہوں۔ جب میں رقص میں مگن ہوتی ہوں۔ تو یوں لگتا ہے کہ سب مسئلے، سارے دکھ میرے بدن سے جھڑ جھڑ کر نیچے گر رہے ہیں۔ اور میں انہیں اپنے قدموں تلے روند رہی ہوں۔"

اس کی ساتھی ابھی ادھر ہی بیٹھی ہے۔

وہ کہہ رہی ہے۔ میں تھک جاتی ہوں۔ یہ نہیں تھکتی۔ ہر ہفتے یہ سب سے پہلے نائٹ کلب میں داخل ہوتی ہے۔ سب سے بعد میں جاتی ہے۔ میری

برطانیہ کی فلیٹ اسٹریٹ کل اور آج، آج بھی اس کی رونقیں جواں ہیں

دوست ہے۔ اس لیے مجھے ساتھ دینا پڑتا ہے۔"

ہمارے ایک ساتھی بھی جوش میں آ گئے ہیں۔ وہ بھی یہ سوچ کر کہ کچھ مسئلے تو جھڑ جائیں گے۔ وہ ابھی اس ہجوم میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہاں سب سے زیادہ آسانی یہ ہے کہ کوئی یہ نہیں دیکھتا قدم مل رہے ہیں یا نہیں۔ ناچ آتا ہے یا نہیں۔ سب اپنی اپنی دنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کسی کو دوسرے کا رنگ تک دیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ پتا نہیں۔ یہ رات پھر آئے نہ آئے، آج کی رات۔ زندگی کا لطف اٹھاؤ۔ یہ سب جزیرے ہیں۔ اپنی اپنی جگہ ان کے چاروں طرف سمندر ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے سے کٹے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے سے بہت دور دور ہیں۔ کبھی آپس میں ملتے بھی ہیں تو بہت مختصر وقت کے لیے ان کے ہاں علیحدگی کی زیادتی ہوتی ہے۔ ملاپ بہت کم، اپنے اپنے اپارٹمنٹ میں وہ انتہائی خوفناک تنہائی میں عمر بسر کرتے ہیں۔

سمندر دن بدن ایک دوسرے سے الگ ہو رہے ہیں۔

میں ہوش وحواس کھو رہا ہوں۔ رفتہ رفتہ
تمہاری آواز مجھے فون پر سنائی دے رہی ہے۔
لیکن اس سے درد تھمتا نہیں ہے۔
دل سنبھلتا نہیں ہے۔

تنہائیاں طوفان بن گئی ہیں۔
ہوائیں سائیں سائیں کر رہی ہیں۔
بادلوں کی گرد سے دریچوں کے شیشے بول اٹھے ہیں۔
دل کی دھڑکنیں پورے مکان میں گونج رہی ہیں۔
میری اپنی سانسیں مجھے لپیٹ میں لے رہی

ہیں۔

سمندر دن بدن ایک دوسرے سے الگ ہو رہے ہیں۔

میں دھیرے دھیرے ہوش و حواس کھو رہا ہوں۔

نغمہ بہت اُداس ہے۔ رقص کرنے والے بھی اُداس اُداس دکھائی دے رہے ہیں۔ قدم ہلکے ہلکے اُٹھ رہے ہیں۔

ماحول غمگین ہو رہا ہے۔ ہمارے ساتھی اپنے دکھ جھاڑ کر آ جائیں تو ہم چلیں۔ یہ جو رونق نظر آ رہی ہے۔ اندر سے کتنے سناٹے ہیں اس میں۔ یہ جو مسکراہٹیں، قہقہے ہیں۔ ان کے اندر کتنے دکھ ہیں۔

سوسن بھی اُداس ہے۔ جیکی بھی اُداس ہے۔ نیلے اسکرٹ والی بھی۔

تو یہاں خوش کون ہے۔

ہم خوش ہیں جو باہر کی دنیا دیکھ رہے ہیں۔ برطانیہ دیکھ رہے ہیں۔ ہماری دنیا کتنی وسیع ہے۔ ان کی دنیا کتنی سمٹ گئی ہے۔

ہم باہر آ رہے ہیں۔

جیکی راستے میں کھڑی ہے۔ ہم شکریہ ادا کر کے چل پڑتے ہیں۔

بالآخر لندن

خزاں کے رنگ کتنے پُرکشش ہیں۔
یہاں آ کر احساس ہوا کہ خزاں بھی خوبصورت ہوتی ہے۔

نائٹ کلب کے باہر اب جانے والوں کا ہجوم ہے۔ رات کا پچھلا پہر شروع ہو گیا ہے۔

ٹیکسی والا اب کے بھی اپنے دیس کا ہے۔ یہ گوجر خان سے آیا ہے۔ طفیل کو یہاں پندرہ سال ہو گئے ہیں۔ اس شہر میں پاکستانی کم ہیں۔ زیادہ تر ٹیکسی چلانے والے ہیں۔ طفیل بتا رہا ہے کہ یہاں لوگ اچھے ہیں۔ جھگڑا بہت کم ہوتا ہے۔ زیادہ سواریاں اسٹیشن سے ہی ملتی ہیں جو ہمارے ہوٹل کے سامنے ہے۔

ہوٹل کا دروازہ بند ہے۔ گھنٹی بجانی پڑتی ہے۔ ایک صاحب آنکھ ملتے ہوئے آ رہے ہیں۔

اسٹوک آن ٹرینٹ میں ہم نے برطانیہ کی جوانی دیکھی ہے۔ برطانیہ کا شباب کتنا اُداس ہے۔

اسٹوک آن ٹرینٹ کی صبح بہت خوبصورت ہے۔

خزاں کے رنگ کتنے پُرکشش ہیں۔

یہاں آ کر احساس ہوا ہے کہ خزاں بھی خوبصورت ہوتی ہے۔

ہوٹل کے باہر "جوسیا ویج وڈ" ہاتھ میں ایک صراحی لیے کھڑے ہیں۔

1730ء سے 1795ء تک ان کا دور تھا۔ یہ مجسمہ شہریوں کے چندے سے استوار کیا گیا۔

اسٹیشن کے باہر ایک دو ٹیکسیاں کھڑی ہیں۔

ہفتے کی صبح ہے تعطیل ہے۔ اس لیے خاموشی ہے۔

ایک راستہ Heritage Trail کی طرف جا رہا ہے۔ کیا خوبصورت نام ہے۔ "میراث کی پگڈنڈی"۔

یہ اسٹیفرڈ شائر یونیورسٹی ہے۔ دور تک پھیلی ہوئی۔ ساتھ ہی ہوسٹل بھی ہیں۔ مختلف شعبوں کے نام بورڈوں سے عیاں ہیں۔ اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آ رہا ہے۔ سوشل سائنسز، فلسفہ، نفسیات، سوشیالوجی۔

چھوٹے چھوٹے گھر کتنے خوبصورت ہیں۔ ہر دروازے کے ساتھ دو تین سیڑھیاں، ایک طرف چھوٹا سا لان، دریچوں میں خوبصورت پردے۔ ہر کھڑکی میں رکھے ہوئے گلدان۔

ایک ترتیب سے آتی ہوئی گلیاں۔

نزار یو کا چرچ۔

"خدا کو تلاش کر۔ جہاں بھی وہ ملے"۔

اسے آواز دو۔ جہاں بھی اس کی قربت محسوس ہو۔

چرچ کے باہر بورڈ پر لکھے یہ جلی حروف اللہ کی عظمت اور قدرت کا احساس دلا رہے ہیں۔ شہر ابھی تک سو رہا ہے۔

دودھ کی بوتلوں والے ٹرک کبھی کبھی گزر جاتے ہیں۔ یا جوگنگ کرنے والے دکھائی دے رہے ہیں۔ دکانیں سب بند ہیں۔ صرف اخبارات والے

موجود ہیں۔

فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ سورج مکھی کے پھول ہیں۔ کہیں کہیں گلاب سر اٹھا رہے ہیں۔ گھروں میں زیادہ تر گیندے کے پھول لگے ہیں۔ ہر گھر کے پھول اہل شہر کے باذوق ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔

ایک گلی مجھے ایک بڑے پارک کے سامنے لے آئی ہے۔ ''میوسن گرود۔'' دور دور تک پھیلا ہوا ہے سبزہ زار۔ پارک کے باہر ''میوسن گرو'' کی تختی کے ساتھ یہ بھی درج ہے۔ زیر اہتمام سٹی آف اسٹوک اون ٹرینٹ۔ لیو رانیڈ دی کری ایشن ڈیپارٹمنٹ (محکمہ تفریح و سکون) میسن گرود کے اندر ہی ہنلے پارک ہے۔ جس میں ایک پرسکون جھیل مجھے اپنے کنارے بینچ پر بیٹھنے کی دعوت دے رہی ہے۔ فیکٹریوں اور تجارتی علاقوں کے درمیان یہ وسیع وعریض پارک بڑے اہتمام سے محفوظ کیا گیا ہے۔ سبزے میں گھری یہ جھیل ایک آئینہ لگ رہی ہے اور اس میں تیرتی بطخیں کتنی خوبصورت ہیں۔ رنگ رنگ کے پھولوں سے بھری روشیں۔ سیر کرنے والوں کی پگڈنڈیاں۔

جوگنگ کرنے والے بہت کم ہیں۔ شاید چھٹی کی وجہ سے زیادہ لوگ باہر گئے ہوئے ہوں گے۔

گلیاں کوچے صاف ستھرے ہیں۔ ہر مکان کا نمبر بہت نمایاں۔ سرخ کھپریل کی جھکی چھتیں۔ ہر گھر کے باہر ایک لیٹر بکس، ویان بس اسٹاپ، ناشتے کے بعد ہمیں لندن روانہ ہونا ہے۔

برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کی میزبانی کا آخری مرحلہ لندن میں دو راتیں۔

ایک طویل سفر درپیش ہے۔

ایم 6۔ ہمیں لندن لے کر جائے گی۔

کھلی شاہراہ کے دونوں طرف کھیت پھیلے ہوئے ہیں۔ کہیں مشینوں سے کٹائی ہو رہی ہے۔ کہیں سرسبز کھیت لابنے لابنے پیڑوں کے حصار میں لہلہا رہے ہیں۔

برمنگھم چند میل پر ہے۔ لیکن وہ ہمارے پروگرام میں نہیں ہے۔ پہلے ایک بار لندن آیا تھا۔ تو اپنے صحافی ساتھی حبیب الرحمان کے ہمراہ برمنگھم میں جانا ہوا تھا۔ یہاں ہمارے قونصل جنرل متعین ہیں۔

برطانیہ کی مشہور زمانہ اسٹیفرڈ شائر یونیورسٹی کا بیرونی منظر

موٹر وے تیزی سے ہمیں لندن کے قریب لے جا رہی ہے۔

یہ اشارہ ہے واروک شائر کی طرف جو تاریخ، ادب کے شہرہ آفاق ڈرامہ نگار ولیم شیکسپیئر کی کاؤنٹی کہلاتی ہے۔ برطانیہ والے اپنے بادشاہوں کی طرح اپنے اہلِ قلم کو بھی اسی احترام اور عزت سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی رہائش گاہیں بھی شاہی قلعوں کی طرح محفوظ اور عام پبلک کے لیے کھلی ہیں۔

اس طویل سفر میں جگہ جگہ ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں کے نام نظر آتے ہیں۔ جن سے شاہراہیں منسوب ہیں۔ یا پوری کاؤنٹی ان کے نام پر ہے۔

موٹر وے نے لندن کے قریب آنے کا اعلان کر دیا ہے۔

برٹش ریل رواں دواں ہے۔
اب ریلیں زمین کے اندر چلی جائیں گی۔
خالد عزیز ایک بار پھر کسی غلط راستے پر چلے گئے ہیں۔ یہ ہمیں کیمبرج لے جائے گا۔ اور ہمیں جانا ہے لندن۔ لندن کے اندر بھی آپ آسانی سے لندن نہیں جاسکتے۔ اب بہتر یہی ہے کہ جہاں کوئی گلی ملے۔ اُدھر مڑ جائیں اور مشورہ کر کے صحیح راستہ اختیار کریں۔ یہ ایک خوبصورت رہائشی علاقہ ہے۔ گھروں کے سامنے پارک میں بچے کھیل رہے ہیں۔ سہ پہر کی دھوپ دم توڑ رہی ہے۔ ایک جوڑے سے ہم سب بیک وقت راستہ پوچھتے ہیں۔ روجہ جوڑے میں سے ایک کی خوبصورتی۔ خاتون کہتی ہے کہ آپ سب کو ایک جگہ ہی جانا ہے۔ ہم سب کہتے ہیں جی۔ وہ کہتی ہے تو آپ میں سے ایک یہ ذمہ داری کیوں نہیں ادا کرلیتا۔ ہم سب کے منہ لٹک جاتے ہیں۔ یہ حسین ذمہ داری ہم فاروق معین کے سپرد کرتے ہیں کہ وہ لندن میں پہلے کئی سال رہ چکے ہیں۔ وہ اچھی طرح راستہ سمجھ لیتے ہیں تو ہم ان کی راہنمائی میں روانہ ہوتے ہیں۔

کئی جانے پہچانے راستے۔
کرکٹ اسٹیڈیم۔ پرانا لندن۔ نیا لندن۔
کنگز کراس قریب سے ہوتے ہوئے ہمیں البانی اسٹریٹ پہنچنا ہے۔ جہاں وائٹ ہاؤس ہوٹل واقع ہے۔ اب لندن کے نقشے کی تلاش ہے۔ جو ہم سب کے پاس جیب میں نہیں تھے۔ اٹیچی کیس میں تو ضرور ہوگا کیونکہ خالد عزیز نے کراچی سے روانہ ہوتے وقت سب کو برطانیہ کے الگ اور لندن کے الگ نقشے دیے تھے۔ لندن آتے وقت اور داخل ہوتے وقت یہ نقشہ ضرور کسی کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ ہم تجربہ کار تورسٹ نہیں ہیں اس لیے بھٹک رہے ہیں۔

مادام تساؤ کا موی عجائب گھر تو ہر لندن آنے والے نے دیکھا ہے۔ البانی اسٹریٹ اس کے ہی کہیں آس پاس ہے۔
وائٹ ہاؤس نہ سہی وائٹ ہاؤس ہوٹل ہی سہی۔

اپنے کمرے سنبھالنے کے بعد ہمیں کیٹنگ کی وا کہاں واپس کرنی ہے۔ طے یہی ہوا تھا کہ لندن پہنچتے ہی گاڑی کنگز کراس میں واقع کیٹنگ کے ڈپو میں پہنچادی جائے گی۔ باقی ساتھیوں کو وہیں چھوڑ کر ہم خالد عزیز کے ساتھ کنگز کراس کا رُخ کرتے ہیں۔ کیٹنگ کا ڈپو بند ہے۔ آج ہفتہ ہے۔ سامنے ایک گیس اسٹیشن ہے۔ وہاں ایک صاحب یہ مشورہ دیتے ہیں گاڑی یہیں گلی میں پارک کردیجیے۔ کیٹنگ کی اور گاڑیاں بھی یہاں کھڑی ہیں۔ گیٹ کے ساتھ کیٹنگ والوں نے ایک پائپ لگایا ہوا ہے۔ اس میں چابی پھینک دیجیے۔ پیر کے روز انہیں یہ مل جائے گی۔

یہ مرحلہ کافی آسان ہوگیا ہے۔
ہلکی ہلکی بارش ہورہی ہے۔ زیرِ زمین ریلوے اسٹیشن۔ کنگز کراس۔ پورٹ لینڈ اسٹریٹ کے لیے ٹرین۔ اور چند منٹ بعد اپنے ہوٹل۔ ہوٹل خالص کاروباری ہے، بے حد آمد و رفت۔ کسی کو آپ سے بات کرنے کی فرصت نہیں ہے۔

شاپنگ ایریا میں ایک گفٹ شاپ پر ایک ویت نامی خاتون فروخت کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ وہ ویت نام کو بالکل یاس نہیں کرنا چاہتی۔ یہ ایک بھیانک خواب تھا جسے بھول جانا ہی بہتر ہے۔ لندن نے اسے اور اس کے خاندان کو قبول کرلیا ہے۔ وہ عزت اور سکون سے رہ رہے ہیں۔ یہی کچھ انہیں چاہیے۔ نہ بمبار طیاروں کی آوازیں آتی ہیں۔ نہ بموں کے دھماکے۔

ایک دوسری شاپ پر ملائشیا سے آئی ہوئی ایک مسلمان خاتون ہے۔ جس نے اپنا سر ڈھک رکھا ہے۔ مختلف تحائف، سوغاتیں موجود ہیں۔ اپنے وطن کی چیزیں بھی ہیں۔ اسے اپنا وطن بہت یاد آتا ہے۔ سال بھر میں ایک مرتبہ وہ ضرور ملائشیا جاتی ہے۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ یہاں رہتی ہے۔ لیکن پیچھے ملائشیا میں اس کے بہت سے رشتہ دار موجود ہیں۔
ایک طرف خوبصورت گارڈن کے لیے ہے۔ لندن کی روایتی کافی۔ اسنیکس۔ اتوار کی دوپہر لذیذ

کھانے۔

وائٹ ہاؤس ریستوران ۔ گرم۔ کثیر الذائقہ کھانے۔ مشروبات۔

دی بار ۔ وائن پریس۔ دو الگ الگ بادہ کدے۔

بیٹھیے۔ لذتیں۔ اور مستیاں آپ کی منتظر ہیں۔

لندن کے عین قلب میں واقع۔ وائٹ ہاؤس ہوٹل تمام تفریحات کے بھی نزدیک ہے۔ اور اہم ترین سرکاری دفاتر کے بھی قریب ہے۔ اس اعتبار سے برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کا یہ انتخاب لائق تحسین ہے۔

رات کو ہماری منزل وائسرائے آف انڈیا ہے۔ گلیبٹ ورتھ اسٹریٹ میں واقع اس ریستوران میں جناب میل منٹگمری ہمارا استقبال کریں گے۔ وہ ہمارے میزبان ہیں۔ اس دورے کی دعوت بھی انہوں نے دی تھی۔ اور برطانیہ میں تمام انتظامات بھی ان ہی کی طرف سے تھے۔

میل منٹگمری سے ہماری ملاقات پاکستان میں تو کئی بار ہوئی ہے۔ وہ ایشیا کے ممالک سے متعلق شعبے کے سربراہ ہیں۔ برطانیہ میں سیاحت کے فروغ کے لیے وہ خود بھی ایشیائی ممالک کے دورے کرتے رہتے ہیں۔ مطبوعات محمود کے دفتر بھی آچکے ہیں۔ جب ہم نے انہیں سندھ کی روایتی سوغات اجرک بھی پیش کی تھی۔

میل منٹگمری ہم سب کا فرداً فرداً خیر مقدم کررہے ہیں۔ ہر ایک سے پوچھ رہے ہیں کہ دورہ کیسا رہا۔ کہیں انتظامات میں کوئی کمی، کوئی کوتاہی...... راستے صحیح صحیح ملتے رہے یا نہیں۔

" وائسرائے آف انڈیا۔" کبھی یہاں سے انڈیا جاتا تھا۔ اب یہ انڈیا سے لندن آیا ہے۔ انڈین کھانے، برطانوی انداز کے ساتھ۔ کافی کشادہ ریستوران ہے۔ ایشیائی خاندان آرہے ہیں۔ بچے بھی ہیں۔ انگریز بھی آرہے ہیں۔ انگریزوں نے بھی ایشیائی کھانوں کے لیے ذوق تعمیر کرلیا ہے۔

میل منٹگمری بھی مرچوں والے کھانے انتہائی شوق سے اور انہماک سے کھاتے ہیں۔

جہاں چار صحافی موجود ہوں۔ وہاں پریس کانفرنس ہوجانا لازمی ہے۔

ٹاور آف لندن کی شان اور تمکنت آج بھی عروج پر ہے

سوال ہمارے۔ جواب برٹش ٹورسٹ اتھارٹی میں شعبہ ایشیاء کے سربراہ میل منٹگمری کے۔

" کتنے پاکستانی برطانیہ میں بطور سیاح آتے ہیں۔"

1990ء میں 75000 کے قریب آئے تھے۔ ان میں صرف سیاح شامل ہیں۔ ان لوگوں کی آمد و رفت اس میں شمار نہیں کی گئی، جو یہاں سلسلۂ روزگار آتے جاتے رہتے ہیں۔

ایک اور سوال کے جواب میں ان کا کہنا ہے کہ 1990ء میں کل سیاح ایک کروڑ 70 لاکھ آئے تھے۔ جن میں سب سے زیادہ تعداد امریکہ سے آنے والوں کی تھی۔ جاپان سے آنے والے سیاحوں کی تعداد 6 لاکھ رہی۔ یہ تعداد کم رہی کیونکہ خلیج کی جنگ بھی شروع ہوگئی تھی پھر کچھ کساد بازاری

بھی رہی۔

برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کے دفاتر صرف لندن میں ہیں۔ یورپ اور جنوبی امریکہ کے 23 ممالک میں اس کے نمائندے موجود ہیں۔ لندن ہمیشہ سے دنیا بھر کے سیاحوں کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کے تاریخی مقامات، تھیٹرز، تفریح گاہیں دنیا بھر کے لوگ ان سے آشنا ہیں۔ وہ انہیں بذاتِ خود دیکھنا چاہتے ہیں۔ برٹش ٹورسٹ اتھارٹی پابندی سے معلوماتی لٹریچر شائع کرتی ہے اور دنیا بھر میں تقسیم کرتی ہے۔

وہ بتا رہے ہیں کہ برطانیہ کو جزیرہ ہونے کی وجہ سے کچھ نقصانات بھی رہے ہیں۔ لیکن اب دوبارہ انگلستان کے نیچے 23 میل لمبی سرنگ بن رہی ہے۔ اس کی تعمیر کے بعد جب ہمارا راستہ خشکی سے سارے یورپ کے ساتھ ہو جائے گا۔ پھر سیاحوں کی آمد و رفت مزید بڑھ جائے گی۔

متحدہ یورپ کے قیام کے لیے پیش رفت جاری ہے۔ اس سلسلے میں برطانیہ کے شہریوں کی اپنی رائے ہے۔ ذہنی تحفظات ہیں۔ اکثریت نہیں چاہتی کہ دوسرے ملکوں کی طرح اس کی سرحدیں بھی پوری طرح کھول دی جائیں۔ اس سے بہت کچھ ناپسندیدہ بھی برطانیہ میں داخل ہو جائے گا۔ ہم اپنی شناخت ختم نہیں کرنا چاہتے۔

لیکن متحدہ یورپ کے قیام کے بعد سیاحت کو جو فروغ حاصل ہوگا۔ اس سے ہم یقیناً فائدہ اٹھانا چاہیں گے۔ اس سلسلے میں آئندہ 5 سال کے ہدف طے کر رہے ہیں۔ جب یورپ میں سفر اور زیادہ آسان ہو جائے گا۔ پابندیاں کم ہو جائیں گی۔ وہ بتا رہے ہیں کہ اس وقت برطانیہ میں ہوٹلوں میں سخت مقابلہ جاری ہے۔ ٹورسٹوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دینے کے لیے بہت سی جدتیں کی جا رہی ہیں۔ اضافے کیے جا رہے ہیں۔ آپ نے اپنے قیام کے دوران مختلف ہوٹلوں میں دیکھا ہوگا۔ لندن میں اس کا اتنا زور نہیں ہے۔ البتہ دوسرے مقامات پر وادیوں میں قائم ہوٹل سیاحوں کی دلچسپی کے لیے بہت کچھ کر رہے ہیں۔ ان سہولتوں کی بنیاد پر ہی انگلینڈ ٹورسٹ بیورو ہوٹلوں کو 'ستارے' دیتا ہے۔

لندن میں اتوار

انہیں علم ہے کہ ہم وادیوں کی تصویر کشی کریں گے۔
حسن افرنگ کی دل ربائیوں کے قصے چھیڑیں گے۔
عارض و لب کی باتیں کریں گے۔
تو اور پاکستانی بھی کچے دھاگے سے بندھے آئیں گے۔

بہت دنوں بعد اپنا ایشیائی کھانا ملا ہے۔ اس لیے سب بڑی رغبت سے کھا رہے ہیں۔

لندن کی رات بھیگ رہی ہے۔

سردی اتنی زیادہ نہیں ہے۔

کرسمس ابھی دور ہے۔ لیکن کرسمس کی قربت کا احساس بموں کے دھماکوں سے ہو رہا ہے۔ آئرلینڈ والے اپنی آزادی کے لیے کب سے کوششیں کر رہے ہیں۔ اس اثناء میں نہ جانے کتنے ملکوں کو یورپی سامراج سے آزادی مل گئی۔ پاکستان، ہندوستان، چین، براعظم افریقہ، الجزائر اور نہ جانے کس کس نے غلامی کی زنجیریں کاٹ ڈالیں۔ پھر ان ملکوں کے اندر علیحدگی کی تحریکیں چلیں۔ جنہیں خود برطانیہ، امریکہ نے ہوا دی۔ پاکستان میں بنگلہ دیش، پھر روس کی ساری ریاستیں روس سے آزاد ہو گئیں۔ لیکن بے چارے آئرلینڈ والے اپنی منزل مراد نہیں پا سکے۔ کیونکہ انہیں بیرونی دنیا سے کوئی مدد حاصل نہیں ہو رہی ہے۔ اس لیے وہ اب ہر سال کرسمس سے پہلے کچھ دھماکے کر لیتے ہیں اور بس۔ دھماکوں سے پہلے وہ پولیس کو اطلاع دے دیتے ہیں۔ پولیس علاقے کے لوگوں کو خبردار کر دیتی ہے۔ اس طرح جانی نقصان اکثر نہیں ہوتا ہے۔

ہوٹل واپس آتے ہیں تو ہفت روزہ 'آزاد' کے مالک و مدیر اور سینئر صحافی حبیب الرحمان۔ 'جنگ لندن' کے نامور اخبار نویس زیڈ یو خان۔ سابق طالب علم لیڈر، اب برطانیہ کے مشہور قانون دان، ملکہ برطانیہ کے وکیل سبغت اللہ قادری۔ مسلم پارلیمنٹ کے ممبر اکرام خان، کشمیر کی آزادی کے لیڈر شیر شاہ قریشی، تمام لوازمات کے ساتھ ہماری

خاطر تواضع کے لیے موجود ہیں۔

لندن کے یہ ساتھی اپنے سب کام چھوڑ کر پاکستان سے آنے والے صحافی دوستوں کی میزبانی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں۔ حبیب الرحمان تو عجیب و غریب شخصیت کے مالک ہیں۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد سے وہ عملی صحافت سے منسلک ہیں۔ اب بھی اسی طرح سرگرم ہیں۔ جنگ جب صرف کراچی سے نکلتا تھا تو حبیب الرحمٰن پنڈی میں جنگ کے نمائندے تھے۔ جب کراچی خبریں لکھوانے کے لیے کئی کئی روز تک ٹرنک کال نہیں ملتی تھی۔ پنڈی دار الحکومت بن گیا تھا۔ اس لیے اس کی اہمیت بڑھتی جارہی تھی۔ خبریں وہیں ہوتی تھیں۔ حبیب الرحمان اس لیے جنگ کے ایک اہم کارکن بن گئے تھے۔ اسکندر مرزا، ایوب خان سے ان کا براہ راست دست پنجہ رہتا تھا۔ 1965ء کی جنگ کے بعد وہ لندن چلے آئے۔ یہاں سے انہوں نے جنگ نکالنا شروع کیا۔ پھر میر خلیل الرحمان مرحوم لندن پہنچے۔ حبیب صاحب سے بات چیت ہوئی۔ اور جنگ والوں نے جنگ لندن کو اپنا لیا۔ حبیب صاحب جنگ کے لیے وقف ہوگئے۔ اخبارات سے وابستہ رہے۔ جب پاکستان کا آغاز ہوا تو یورپ میں پاکستان کا بیورو ان کے حوالے کیا گیا اور انہوں نے اپنی مقامی خبروں سے پاکستان کو خوب سجا دیا۔ میر خلیل الرحمٰن کے انتقال سے قبل وہ پھر میر صاحب کے کافی قریب آگئے تھے۔ غلط فہمیاں دور ہوگئی تھیں۔ میر صاحب کے انتقال کے بعد جب جنگ لندن میں تبدیلیاں آئیں۔ انہی دنوں میں

ہیری چرچ ٹرائل کا ایک بیرونی منظر

میر شکیل الرحمان نے جناب حبیب الرحمان کو پھر یاد کیا اور اب ان کی ملاقاتیں جاری ہیں۔

ان ملاقاتوں کی دلچسپ روداد موضع مشترک ہے۔

لندن کے قصے، پاکستان پیپلز پارٹی کے لیڈروں کی باتیں۔ پاکستانی سفارتخانے کے اسکینڈل۔ آج بہت دنوں بعد ہم پھر سیاست اور صحافت کے گردبادوں میں اُلجھ گئے ہیں۔ پورے ایک ہفتے سے ان تمام آلودگیوں سے پاک رہے ہیں۔ خوبصورت لوگ، حسین وادیاں، سبزہ، دریا پہاڑ ہماری توجہ کے مرکز رہے ہیں۔ تازہ ہواؤں میں سانس لے لے کر ہمارے ذہن تر و تازہ ہوگئے ہیں۔ آج پھر سیاست اور صحافت کی کثافتوں کا حملہ ہوگیا ہے۔ اب یہ حملہ جاری رہے گا۔

برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کی میزبانی کا ایک دن اور ایک رات باقی رہ گئی ہے۔

ہم کالوں پر گوروں نے کافی پیسہ خرچ کیا ہے۔ یہ ان کی اپنے وطن کے ساتھ لگن کا جذبہ ہے۔ انہیں علم ہے کہ یہ لکھنے والے لوگ ہیں۔ ان کے دیس کے بارے میں لکھیں گے۔ وادیوں کی تصویر کشی کریں گے۔ حسن افرنگ کی دلربائیوں کے قصے چھیڑیں گے۔ عارض و لب کی باتیں کریں گے۔ تو اور پاکستانی بھی کچے دھاگے سے بندھے آئیں گے۔

اتوار کی صبح ہے۔ لندن بالکل خاموش ہے۔ کوئی ایک گاڑی گزر جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد طویل خموشی۔ میں لندن کی صبح بڑے انہماک سے دیکھنے نکلا ہے۔ وہاں ایک سکوت ہے۔ لیکن پارک اپنی جگہ

سر سبز ہیں۔ مادام تساؤ کا عجائب گھر۔ شرلاک ہومز کا میوزیم۔ ٹیمز ٹیلی ویژن۔

ناشتے کا ارادہ کرتے ہیں۔ ہوٹل کے ریستوران کے باہر ایک طویل قطار لگی ہے۔ جو ہوٹل کی لابی میں پھیل رہی ہے۔ لندن کی سیاحت پر آئے ہوئے جوڑوں خاندانوں کے لیے اتوار کا دن بہت اہم ہوتا ہے۔ پورا دن لندن سیاحوں کی زد میں رہتا ہے۔ پیدل، ڈبل ڈیکر بسیں، کوچز، کوسٹرز، اسپیشل بسیں، جو دوسرے ملکوں سے شہروں سے سیاحوں کو لے کر آ رہی ہوتی ہیں۔ وہ سب جلد جلد ناشتہ کر کے لندن کے ٹور پر نکلنا چاہتے ہیں۔

ریستوران کا عملہ بڑے غور سے مہمانوں کو دیکھتا رہا ہے کہ اکیلے ہیں۔ دو کا گروپ ہے، تین کا یا چار کا۔ وہ ایک ایک سے پوچھتے ہیں اور خالی ہونے والی میزوں پر بٹھاتے رہتے ہیں۔ یہ دو تین گھنٹے کی مشق ہوتی ہے۔ ایک عجیب ہنگامہ رہتا ہے۔ سب خاموشی سے قطار میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔

ان میں ارب پتی بھی ہوتے ہیں، لکھ پتی بھی اور ہم جیسے تہی مایہ بھی۔ لیکن کوئی شور نہیں مچاتا۔ کوئی ہوٹل کی انتظامیہ پر رعب نہیں جماتا۔ کوئی اپنے کسی بڑے کا حوالہ دے کر کرسیوں پر قبضہ نہیں کرتا۔ سب ہوٹل کے عملے سے تعاون کرتے ہیں۔ اور جیسے جیسے جتنوں جتنوں کے میز خالی ہوتے ہیں۔ بیٹھتے رہتے ہیں۔

میل منٹگمری آ چکے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد آج کی ہماری گائیڈ کیٹی لدکاس بھی آ گئی ہیں۔ ڈھلتی ہوئی عمر، سفیدی مائل بالوں والی یہ خاتون اب بھی پرکشش چہرے اور باوقار چال رکھتی ہیں۔ میل منٹگمری ہم سب کا تعارف کروا رہے ہیں۔ کیٹی کا تعلق گرد سونیر گائیڈ سروسز سے ہے۔ آج کا پورا دن ان کے ساتھ گزرے گا۔ میل بھی ساتھ رہیں گے۔

کیٹی اپنی گاڑی لائی ہیں۔ وہ خود ہی چلا رہی ہیں۔

یہ زیجبٹ پارک ہے۔ یہ گلابوں سے بھری کیاریاں، کوئین میری روز گارڈن۔ زیجبٹ کالج، زیجبٹ کینال۔

اس پارک میں گھاس سال بھر سبز رہتی ہے۔

شرلاک ہومز کے حوالے سے مشہور ہونے والی بیکر اسٹریٹ۔

ہائیڈ پارک کے گرد ایک چکر۔ وقت نہیں ہے۔ اس لیے ہائیڈ پارک کا گشت نہیں کر سکتے ہیں۔ جو ویسے لندن کے دورے کا ایک اہم جزو ہے۔ مختلف مقررین کی خطابت کے انداز۔ یہی پارک آزادئ تقریر کا ایک شہرہ آفاق مرکز ہے۔ یہاں آپ آ کر اپنے دل کا پورا غبار نکال سکتے ہیں۔ کسی پر تنقید کر سکتے ہیں۔ کسی سے بھی بے تکلف ہو سکتے ہیں۔ مذہب، سیاست، حکمران، بیوروکریسی سب زیر بحث آ سکتے ہیں۔ صرف ملکہ اور شاہی خاندان پر حرف زنی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اب سنا ہے کہ یہ سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے۔

سرپنٹائن لیک۔ (سانپ جھیل)۔ سائنس۔ جنرل ہسٹری اور ارضیات کے عجائب گھر، اہلِ برطانیہ اپنی تمام معلومات اور تاریخ ان عجائب گھروں میں ترتیب سے محفوظ رکھ رہے ہیں تاکہ کسی کو بھی اسے بیک وقت دیکھنے میں مشکل پیش نہ آئے۔ آج اتوار ہونے کی وجہ سے عجائب گھر اور ان سے ملحقہ پارک والدین اور بچوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

کیٹی کا کہنا ہے کہ بچوں کو اپنی تاریخ اور پس منظر سے باخبر رکھنے کے لیے ہر اتوار کو والدین بچوں کو کسی نہ کسی عجائب گھر میں لے جاتے ہیں۔ اور بڑے شوق سے چیزیں کھاتے ہیں تاریخ سے روشناس کرواتے ہیں۔

لندن ہمارے سامنے سے ایک منظر رواں کی طرح گزر رہا ہے۔ کیٹی گاری بھی چلا رہی ہے اور دونوں طرف آتی عمارتوں اور مقامات کے بارے میں بھی بتاتی جا رہی ہے۔ بکنگھم پیلس، جہاں ان دنوں کچھ تزئین و آرائش ہو رہی ہے۔ گارڈز کا میوزیم، بگ بین، پھر چند لمحے پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے، یہ دارالعلوم کا دروازہ ہے۔ یہ دار الامراء کا دروازہ ہے۔ یہ ویسٹ منسٹر ایبے ہے۔ منتخب نمائندوں کے مرکز کے ساتھ ہی پاپائیت کا مرکز بھی۔

لندن کے 34 میئر ہیں۔ اور ان سب کا نمائندہ

لارڈ میئر ہے۔ اس وقت لارڈ میئر اپنے مختصر سے قافلے۔ اور پائلٹ کے ساتھ گزر رہے ہیں۔ وہ گرجے میں حاضری دینے آئے ہیں۔ یہ شاہی چرچ ہے۔ شاہی خاندان کی شادیاں انہی کی آشیر باد سے ہوتی ہیں۔ ہم جب پہنچے ہیں تو یہاں پادریوں کی کوئی تقریب منعقد ہو رہی ہے۔ ایک طویل قطار ہے۔ پادریوں کی جو چلی آ رہی ہے۔ ان سے پہلے ان کے خدام ہیں۔ جو رستہ بنا رہے ہیں۔ پادری بالکل سیدھی قطار میں چل رہے ہیں۔ وہ ادھر ادھر نہیں دیکھ رہے ہیں۔ ان کی نظریں جھکی ہیں۔ اس لیے یہ ان کے چوبداروں کا فرض ہے یا حاضرین کا کہ وہ خود راستے میں نہ آئیں۔ انگلینڈ میں چرچ کا نظام بھی بہت مضبوط ہے اور بڑی محفوظ بنیادوں پر قائم ہے۔

وزیراعظم چرچل کو یہ اعزاز نصیب ہے کہ اس چرچ میں ان کی یاد میں ان کی پیدائش اور وفات کے سال کندہ ہیں۔ انگلینڈ کے لیے ان کی خدمات کو بھی خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔

پارلیمنٹ ہاؤس کے قریب ہی ایک بالکل جدید طرز تعمیر کا بین الاقوامی کانفرنس سینٹر تعمیر کیا گیا ہے۔ جس کے دروازے خود کار اور دیواریں پوری شیشے کی ہیں۔ یہ ہر اعتبار سے ظاہری اور اندرونی طور پر جدید ترین کانفرنس ہال ہے۔ اس کے دروازے کے عین سامنے اسی گلی میں ایک پرانی جیل ہے۔ جس کا دروازہ انتہائی قدیم اور لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ اس کی دیواریں بھی پرانی اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں۔ اس جیل کو اسی طرح محفوظ رکھا جا رہا ہے۔ یہ ہے قدیم و جدید کا تضاد۔ صرف چند قدم کا فاصلہ۔ لیکن پوری تین صدیاں درمیان میں گزر رہی ہیں۔

پھر وکٹوریہ اسٹریٹ ٹریفالگر اسکوائر۔ جہاں کبوتر آپ سے بے تکلف ہوتے ہیں۔ لوگ یہاں اپنی تصویر ضرور بنواتے ہیں۔ زندہ کبوتروں کے ساتھ، شہریوں کے مجسموں کے ساتھ۔ یہ کبوتر جانے کتنی صدیوں سے یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ دانہ دنکا چنتے ہیں۔ دنیا بھر سے آئے ہوئے سیاحوں کے ساتھ تصویریں بناتے ہیں۔ اور پھر اڑ جاتے ہیں۔ کتنی نسلیں ان کبوتروں کی یہاں گزر چکی ہوں گی۔ لیکن لگتا یہی ہے کہ وہی کبوتر ہیں۔ جو دوسری جنگ عظیم سے پہلے بھی تھے۔ اب بھی ہیں۔ پچھلے دورے میں بھی تھے۔ اب بھی ہیں۔ کتنے خوش قسمت ہیں یہ پرندے نہ جن کے نام ہیں نہ قبیلے، نہ ملک، انہیں نہ پاسپورٹ چاہیے نہ ویزا۔ نہ ان کے کوئی مسائل ہیں۔ نہ مصائب، نہ ایٹمی جنگ کا خطرہ۔ نہ ہمسایوں سے پنجہ آزمائی۔

ٹریفالگر اسکوائر اس وقت سیاحوں سے معمور ہے۔ نگر نگر کے، رنگ رنگ کے۔ ہر عمر کے ہر سائز کے۔ بچے اور کبوتر مل کر خوش ہو رہے ہیں۔ تصویریں کھنچ رہی ہیں۔ ہمارے پاس رکنے کا وقت نہیں ہے۔ میری درخواست پر گیتی ٹریفالگر اسکوائر کا ایک چکر اور لگاتی ہے۔ ایک بار اور ہم ان معصوم بچوں اور کبوتروں کو دیکھ لیتے ہیں۔ نہ جانے پھر آنا ہو یا نہیں۔

بی بی سی کے دفاتر۔ بینرز آویزاں ہے۔ عالمی سروس کے 60 سال۔

یہاں پھر آئیں گے۔ اندر بھی جھانکیں گے۔ ابھی تک تو ہم نے اپنے آپ کو بی بی سی پر پیش ہونے سے روکا ہے۔ ہمارے جو صحافی بھائی لندن آئے ہیں وہ ضرور بی بی سی سے پیش ہوئے ہیں۔ نظم پڑھ دی ہے۔ بات چیت کر لی ہے۔ ملکی سیاسی تضادات اور انتشار پر بات کی ہے۔ میں اپنے اندرونی معاملات پر باہر بات کرنے پر یقین نہیں رکھتا۔ ہمارے اپنے مسائل اپنی جگہ، باہر ہم صرف پاکستانی ہیں۔ اور اس وقت جو بھی حکومت پاکستان ہے۔ وہ پاکستان کا نمائندہ ہے۔ ہمیں حکومت پسند نہیں ہے۔ غیر قانونی ہے۔ دھاندلی سے آئی ہے۔ تو یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اس سے نجات حاصل کریں۔ غیر ملکی حکومتوں سے، غیر ملکی اخبارات سے، غیر ملکی دانشوروں سے اس سلسلے میں مدد حاصل کرنا اپنے امور میں غیر ملکی مداخلت کو دعوت دینا ہے۔

مارشل لاء کے دور میں ہم نے مارشل لاء کے غیظ و غضب کا مقابلہ وہیں کیا۔ ہمارے رسالے بند

ہوئے۔ خود بند ہوئے۔ لیکن ہم نے ملک نہیں چھوڑا۔ نہ انسانی حقوق کا واویلا کیا۔ نہ کہیں سیاسی پناہ کے لیے درخواست دی۔ وطن ہمارا ہے۔ لوگ ہمارے ہیں۔ اس کے حالات ہمیں درست کرنا ہیں۔ سارے غریب لوگ تو باہر نہیں جا سکتے۔ سب تو سیاسی پناہ نہیں لے سکتے۔ اپنے عزیز وطن سے، مصائب سے تنگ آ کر فرار کو ہجرت کا مقدس نام دینا زیب نہیں دیتا۔

کیٹی کی آواز آ رہی ہے۔ یہاں دوسری جنگ عظیم میں بہت تباہی ہوئی۔ یہاں اکثر عمارتیں دوبارہ بنی ہیں۔ لیکن سب اس چرچ سے پیچھے ہٹ کر بنائی گئی ہیں تاکہ اس کا تاریخی تشخص برقرار رہے۔ یہ چرچ جسے سینٹ پال کینڈرل کہتے ہیں، لندن کا سب سے بڑا چرچ ہے۔ اور یہ تقریباً 43ء عیسوی میں پہلی بار بنا تھا۔ بعد میں اس میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ یہاں بھی قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہے۔

یہ فلیٹ اسٹریٹ ہے۔ جو پہلے اخبارات کے دفاتر کی وجہ سے مشہور رہی ہے۔ مگر اب یہاں کوئی اخبار باقی نہیں رہا ہے۔ اب یہ سارے دفاتر ڈاک لینڈ میں نئی عمارتوں میں منتقل ہو گئے ہیں۔ اب ہم کوئین وکٹوریہ اسٹیشن سے گزر رہے ہیں۔ پہلے لوگ لندن میں رہتے تھے۔ جب جنگ میں بمباری زیادہ ہوئی تو پھر شہر سے دور رہنے لگے۔ اب بھی قدیم لندن سے زیادہ آبادی لندن سے باہر مضافات میں ہے۔

لندن کے مختلف مناظر اتنی تیزی سے ہمارے سامنے گزر رہے ہیں کہ سب کچھ گڈمڈ ہو رہا ہے۔ نئی عمارتیں پرانی عمارتیں۔ لائیڈز انشورنس کی بلڈنگ پوری لوہے کی بنی ہوئی ہے۔ فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ۔

ایسٹ اینڈ۔ اتنی رونق۔ اتنے ہجوم۔ یہ سنڈے بازار ہے۔ یہاں سب سے غریب لوگ رہتے ہیں۔ لندن کے مقامی باشندے بھی، بنگلہ دیشی بھی اور پاکستانی بھی۔ ارزاں اشیاء خریدنی ہوں تو یہاں ہر اتوار کو پہنچ جائیں۔ چلیے اگلے اتوار کو آئیں گے۔

ٹاور آف لندن۔ ایک تاریخی مقام۔ مگر ہمیں قریب سے دیکھنے اور اترنے کی فرصت نہیں ہے۔ رومیوں کی تعمیر کردہ فصیل شہر۔ ڈاک لینڈز۔ اب جہاں نئی نئی عمارتیں سر اٹھا رہی ہیں۔ بلند ترین عمارتیں، تجارتی مراکز اخبارات کے دفاتر بھی اب اس علاقے میں ہیں۔

کینری وارف۔ یہ یورپ کی سب سے بلند عمارت ہے۔ 800 فٹ بلند۔ 50 منزلہ۔

اس کے پیچھے چائنا ٹاؤن ہے۔ ہر شہر میں ایک چائنا ٹاؤن ہوتا ہے۔ کیوں۔ کیٹی بتا رہی ہے کہ جب ماضی میں بحری جہاز آیا کرتے تھے۔ تو ان کا چینی عملہ بندرگاہ سے کود کر ادھر پناہ لیتا تھا۔ اسی علاقے میں یہ چینی ملاح جمع ہوتے رہتے تھے۔ انہی میں سے کوئی چینی ریستوران کھول لیتا تھا۔ کچھ چینی یہاں ملازم ہو جاتے تھے۔

اب ہم دریا کے نیچے ایک طویل سرنگ سے گزر رہے ہیں۔ دریا کے اوپر بھی پل بنا ہوا ہے۔ دریا کے نیچے بھی سرنگ ہے۔ جدھر سے چاہے دریا کو عبور کر لیجیے۔ سرنگ میں ویسے بھی ٹریفک دھیرے دھیرے چلتا ہے۔ پھر جب ایک سائیکل والا سامنے چل رہا ہے۔ اور راستہ دینے کے موڈ میں نہ ہو۔ تو ٹریفک چیونٹی کی چال چلنے لگتا ہے۔

یہ سرنگ اسی رفتار سے ہمیں عبور کرنی پڑتی ہے۔ اب ہم رائل نیول کالج کے سامنے سے گزر رہے ہیں۔ کیٹی اور میل آپس میں زیادہ باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں کم بتاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو زیادہ تفصیلات بتاتے ہیں۔ اب ہم ایڈورڈ ہیتھر کے انتخابی حلقے سے گزر رہے ہیں۔ اور ہم ایم 25 پر پہنچ رہے ہیں۔ یہ سڑک پورے لندن کے گرد گھومتی ہے۔ تقریباً 100 میل کا قطر ہوگا اس کا۔

☆☆......☆☆

(لندن کے ویک اینڈ کے بعد اگلے ماہ ہم چرچل کی کالی بطخیں اور ہیور کیسل میں بے چین روحوں کی تصویر کشی اسی سفرنامے میں پیش کریں گے)

آپ بھی لکھاری بن سکتے ہیں!!

آیئے! سچی کہانیاں کے قلم قبیلے میں شامل ہوجایئے۔

یہ کارواں آپ کو خوش آمدید کہتا ہے......

خود کو منوایئے، اپنے قلم سے......

اگر آپ کا مشاہدہ اچھا ہے۔

اگر آپ کو اپنے آس پاس ہوئے، انہونے اور لرزا دینے والے واقعات یاد رہتے ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ ان واقعات سے دوسرے بھی سبق سیکھیں، تو پھر فوری طور پر ان واقعات و حادثات کو صفحہ قرطاس پر ڈھال کر ہمیں بھیج دیجیے۔

نوک پلک سنوار کر اُسے کہانی کی شکل ہم خود دے دیں گے۔

تو پھر قلم اٹھایئے اور کسی بھی عبرت ناک، اور سبق آموز سچ کو کہانی میں ڈھالنے کی صلاحیت کو آزمایئے۔

ماہنامہ سچی کہانیاں آپ کی تحریروں کو، آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔

تحریر بھیجنے کے لیے ہمارا پتا:

88-C II فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

سلاخوں کی دیواروں کے پیچھے سے جرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت سامان دل سوز تحریریں جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سسکتی ہوئی زندگی کے نوحے بھی

کس جرم کی پائی ہے سزا!..

جاوید راہی

اس معصوم مجرم کی کہانی جو کردہ گناہ کے بجائے ناکردہ گناہ کی سزا پاٹ رہا ہے

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”جی بلو“ میں نے اپنا نام بتایا!

”یہ بھی کوئی نام ہوا۔“ انہوں نے اپنا کیمرہ جو اسٹینڈ پر رکھا ہوا تھا اسٹینڈ سمیت اُٹھاتے اس کا رُخ تبدیل کیا اور میری طرف دیکھے بغیر سمندر میں گم ہوتے سورج کی ڈائریکشن کا جائزہ لیا۔

”جی نام تو منظور حسین ہے مگر شروع سے گھر والے مجھے بلو پکارتے آ رہے ہیں۔ یہ سارا نظام تمہارا ہے نہیں جناب میں تو ویٹر ہوں یہاں۔“ میں نے سمندر کی لہروں سے لڑھکنے والیں کرسیوں کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

اچھا بلو تم ادھر آؤ یہ بورڈ پکڑ کر کھڑے ہو جاؤ۔ جب میں تمہیں پکاروں تم اس کا سایہ میرے اور کیمرے کے اوپر کر دینا تا کہ میں ڈوبتے سورج کا منظر شوٹ کر سکوں۔

”جی اچھا۔“ میں نے وہ چمکیلا بورڈ جو اس کے سامان پر پڑا تھا اُٹھاتے ہوئے جواباً کہا۔

بورڈ اُٹھاتے میں اس کے اور اس کیمرے کے دوسری طرف آن کھڑا ہوا اور بورڈ کا رُخ دونوں کی طرف کرتے کھڑا ہو گیا اور وہ اپنے کیمرے سے بار بار تصویریں بنانے لگا۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہو گیا تو اس نے میری بھی دو چار تصویریں مختلف انداز میں بنائیں اور پھر سامان سمیٹنے لگا۔

”بلو یہ ذرا اُٹھاؤ اور اُدھر سڑک پر میری گاڑی کھڑی ہے۔ اس میں رکھنا۔“ میں وہ بیگ جس میں اس کا سامان بھرا ہوا تھا کندھے پر لٹکاتے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا اور پر گاڑی جو سڑک کے ایک طرف کھڑی تھی، تک آتے میں نے وہ بیگ اس کے قریب رکھ دیا۔ اس نے ڈگی کھولی اور میں اس کی مدد کرنے لگا۔

”کہاں رہتے ہو تم؟“

”جی رات کو یہاں سے فارغ ہو کر سامنے مزار پر۔“ میں نے عبداللہ شاہ غازی سرکار کے دربار کی طرف اشارہ کرتے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”یہاں کب سے ہو؟“

”جب سے یہاں کراچی بھاگ کر آیا ہوں۔“

میں نے ڈگی بند کرتے اُسے بتایا۔

''گھر سے کیوں بھاگے ہو؟''

''میرے پاس ان کے سوال کا جواب نہیں تھا۔''اس لیے میں خاموش رہا۔

''یہاں نوکری کر رہے ہو؟''

''نہیں جی نوکری کیسی ! سمندر دیکھنے آیا تھا،نفیس بھائی سے علیک سلیک ہوگئی۔ دن رات اسی کی چاکری کرتا ہوں۔ فیملی والے لوگ آتے ہیں جاتے ہوئے بل کے علاوہ مجھے بھی کچھ نا کچھ مل جاتا ہے۔''اُن سے میں نے حقیقت بیانی سے کام لیا۔

''نوکری کرو گے ہمارے کالج میں۔'' انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

''جی کرلوں گا۔''میں نے دور تک پھیلے سمندر کی لہروں کو آپس میں گلے ملتے دیکھتے ان کی بات کا جواب دیا۔

''تو وہ تمہارے نفیس بھائی؟''

''جی ان سے میرا رشتہ بس برتن اُٹھانے اور دھونے تک محدود ہے۔''

''جاؤ پھر اُن کو بتا آؤ تا کہ وہ ناراض نہ ہو جائیں۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' میں نے نیچے کی طرف قدم اُٹھاتے انہیں جواب دیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا نفیس بھائی کے ٹھیلے کی طرف آ گیا۔ نفیس بھائی نے میری بات سن کر کسی بھی ردعمل کا اظہار نہ کیا اور میں اُنہیں سلام کر کے اوپر کی جانب چل پڑا۔

''ہاں بلو آ گئے۔''

''جی صاحب جی۔''

''ٹھیک ہے بیٹھو میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور انہوں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔'' شہر کے پوش علاقہ میں کالج تھا۔ اُن کا خاصی بڑی بلڈنگ تھی گاڑی روکتے انہوں نے ڈگی کھولی اور مجھے سامان نکالنے کا اشارہ کیا۔ میں نے وہ بیگ اور چمکیلا بورڈ نکال کر ڈگی بند کر دی۔

''آؤ! میں ان کے پیچھے چل پڑا۔ کسی نے بھی میری طرف توجہ نہ دی۔ کئی ایک غیر ملکی لڑکے اور لڑکیاں بھی اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ کوئی مجسمہ بنا رہا تھا تو کوئی پینٹنگ اسٹینڈ پر رکھے بورڈ پر تصویر کشی کرنے میں لگا ہوا تھا۔ سیڑھیاں عبور کر کے وہ اپنے بڑے سے آفس میں آ گیا۔ بیگ اور بورڈ انہوں نے ایک طرف رکھواتے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں صوفہ پر بیٹھ گیا اور وہ کیمرہ اُٹھا کر باہر نکل گیا۔ میں دیواروں پر لگی طرح طرح کی تصویریں دیکھنے میں محو تھا کہ آہٹ پر میری توجہ ہٹی سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔

''تنویر صاحب کہاں ہیں؟''

''جی ابھی باہر گئے ہیں کیمرہ لے کر!''

''آئیں تو کہنا فیروزہ کے روم میں آئیں، کھانا لگ چکا ہے۔''

''جی میڈم!'' میں نے نظریں جھکائے جواب دیا۔

''پہلی بار مجھے ان کے نام کا علم ہوا تھا تھوڑی دیر بعد وہ آئے تو میں نے ان کا نام لے کر انہیں مخاطب کیا تو وہ چونکتے ہوئے بولے۔

''بلو تمہیں میرا نام کس نے بتایا۔''

''جی فیروزہ میڈم آئی تھیں اور کھانے کا بول کر گئی ہیں۔''

''اچھا تو آؤ پھر میرے ساتھ۔'' تنویر صاحب مجھے بھی اپنے ساتھ آفس سے باہر لے آئے بلڈنگ کے آخری حصہ میں برآمدہ پار کر کے سامنے والے مین دروازے کا پردہ ہٹاتے وہ اندر داخل ہو گئے۔

میں باہر ہی رُک گیا مگر ان کے بلانے پر میں بھی اندر آ گیا۔ وہ کمرہ بھی چاروں طرف لگی مکمل اور نامکمل تصویروں سے سجا ہوا تھا۔ ایک سائیڈ پر بڑی ٹیبل کے اوپر ادھورا مجسمہ رکھا ہوا تھا اور پاس ہی کئی قسم کے اوزار بھی۔

فیروزہ میڈم نے میری طرف استفہامیہ انداز سے دیکھا اور پھر تنویر کی طرف۔

''فیری یہ بلو ہے۔ آج سے ہمارا نجی ملازم اور اوپر چھت والے سٹور میں رہے گا۔ باقی باتیں کھانے کے بعد تنویر صاحب نے ایک پلیٹ میری طرف بڑھاتے فیروزہ میڈم کو بتایا۔

کھانے کے دوران تنویر صاحب میرے بارے میں بھی انہیں بتاتے رہے۔ کچھ ضروری کاموں کی ہدایات مجھے تنویر صاحب اور فیروزہ میڈم نے بتائیں کہ میرے ذمہ کیا کیا ہو گا۔ جنہیں میں اپنے ذہن میں بیٹھاتا رہا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے برتن اُٹھائے اور پیچھے بنے کچن میں آ کر انہیں دھونے کے لیے رکھا۔ اسی دوران فیروزہ میڈم کچن میں آئی اور مجھے کچن کا کام سمجھانے کے بعد چائے بنانے کا پوچھا، تو میں نے بتایا کہ میں چائے کوفی وغیرہ بڑی اچھی بنا لیتا ہوں۔ کیونکہ نفیس بھائی نے مجھے اس کام میں ماہر کر دیا تھا۔ وہ سامان والا

دراز بتا کر کچن سے نکل گئیں۔

میں نے برتن دھوئے اور ان کو رکھنے کے بعد چائے بنانے لگا۔ چائے لے کر میں کمرے میں آ گیا۔

''اپنا کپ بھی ادھر ہی لے آؤ۔'' فیروزہ میڈم نے مجھے کچن کی طرف مڑتے آواز دی۔

''جی میڈم!'' میں نے اپنا کپ اُٹھایا اور ان کے پاس آ بیٹھا۔ میرے چائے بنانے کے دوران دونوں نے میرے بارے میں کافی کچھ ترتیب دے دیا تھا۔ میرے سونے سے لے کر میری تنخواہ جو ایک ہزار مقرر کی تھی۔ میرا کام دونوں دفتروں کی صفائی اور اِدھر اُدھر کے چھوٹے موٹے کام تھے۔

اسٹور میں جو ٹوٹا پھوٹا سامان بکھرا ہوا تھا۔ اُسے میں نے اکٹھا کرتے ایک سائیڈ میں رکھا اور اپنی چارپائی کی جگہ بنالی۔ تنویر صاحب اپنے آفس کے ساتھ والے کمرے میں اور فیروزہ میڈم اپنے آفس کے آخری والے کمرے میں رہائش پذیر تھیں۔ دونوں مل کر وہ کالج چلا رہے تھے۔ مجھے پہلے پہل کام کے سلسلے میں اور سمجھنے میں ذرا دشواری ہوئی مگر تنویر صاحب اور فیری میڈم نے میری راہنمائی کرتے مجھے ٹرینڈ کر دیا۔ بازار سے سودا سلف لانے اور کھانا وغیرہ پکانے میں فیری میڈم نے کافی حد تک مجھے سمجھا دیا تھا۔ کالج کے سبھی سٹوڈنٹ خاص کر غیر ملکی دونوں لڑکیاں اور لڑکا میرا بہت خیال کرتے تھے۔

اپنا سامان والا بیگ جو میں نے دربار کے ساتھ ملحقہ تبرک فروخت کرنے والے کی دوکان میں رکھ چھوڑا تھا۔ لا کر اوپر اسٹور میں سجالیا۔

فیری میم اور تنویر صاحب ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف تھے۔ کالج چھٹی کے بعد وہ دونوں یا تو ایک دوسرے کے کمرے میں گھنٹوں گزار دیتے یا پھر گاڑی میں باہر نکل جاتے۔ کالج میں میرے اور چوکیدار شاکر علی کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا تھا۔ میں کام سے فارغ ہو کر یا تو اوپر اپنے بستر پر آ جاتا یا نیچے شاکر کے پاس بیٹھ کر گپ شپ کرنے لگتا۔ جب وہ دونوں واپس آ جاتے تو میرا کام شروع ہو جاتا۔

کھانا چائے اور اسی طرح کے دوسرے چھوٹے موٹے کام۔ یہ اتنے دنوں میں میرے ذہن میں جو بات آئی وہ تنویر صاحب اور فیری میڈم کا لوگوں سے چھپ چھپا کر رشتہ چل رہا تھا۔ اب دونوں مجھ سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ فیری میڈم مجھے تنویر صاحب پر کڑی نظر رکھنے کی تاکید کرتی رہتی۔ اگر کوئی لڑکی ان کے آفس میں کالج کی آ بھی جاتی میں فیری میڈم کو نہ بتاتا تھا کیونکہ تنویر صاحب اکثر میری مٹھی گرم کرتے رہتے تھے۔ ان کے آفس میں زیادہ تر آنے والی لڑکی 'اُوتھے' تھی جس کا تعلق آسٹریلیا سے تھا۔ تنویر صاحب ایک وقت میں دونوں کو الگ الگ بیوقوف بنا رہا تھا۔ اُوتھے انگریزی بولتی تھی جس کی بات میرے پلے نہ پڑتی مگر اس کا رویہ بھی میرے ساتھ تنویر صاحب جیسا تھا۔ دو چار بار میں اس کے ساتھ خریداری کے لیے مارکیٹ بھی گیا تھا۔ ہر بار وہ مجھے بھی کچھ نہ کچھ لے دیتی۔

☆......☆......☆

رات کا کوئی پہر تھا کہ مجھے تنویر صاحب کی آواز آئی جو اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ آواز ان کے آفس والے کمرے کی طرف سے آ رہی تھی۔ پہلے تو میں نے ان سنی کر دی پھر کمرے سے نکل کر نیچے کی طرف ہو گیا۔ ان کے آفس سے باہر رُک کر جب اندر سے آنے والی باتوں کا جائزہ لیا تو مجھے پتا چل گیا ان کے کمرے میں اُوتھے تھی اور فیری میڈم نے دونوں کو رنگے ہاتھوں دھر لیا تھا اور تنویر صاحب اس پر برس رہے تھے کہ میں تمہارا پابند نہیں ہوں۔ جو میرا دل کرے گا وہی کروں گا۔

جواب میں فیری میڈم بس روئے جارہی تھی۔ میں نے زیادہ دیر رُکنا مناسب نہ سمجھا اور واپس اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔

صبح جب میں ناشتا دینے فیری میڈم کے روم میں گیا تو ان کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اُجڑا چہرہ، بکھرے بال یوں دکھائی دے رہی تھیں جیسے تمام رات انہوں نے ایک پل بھی سو کر نہ دیکھا ہو۔ مجھے ٹرے رکھنے کا کہتے جانے کا اشارہ کیا اور میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔ کچن میں آ کر میں نے تنویر صاحب کے لیے ناشتا رکھا اور اُن کے روم میں آیا تو سامنے اُوٹھے اور سلوی میم بھی وہاں موجود تھیں۔ تنویر صاحب نے ان کے لیے کوفی لانے کا کہتے ٹرے ٹیبل پر رکھنے کا کہا۔

میں اُن کا ناشتا رکھتے دوبارہ کوفی بنانے کچن میں آ گیا۔ کوفی کے لیے دودھ رکھا اور اپنا رکھا ہوا ناشتا کرنے لگا۔ میرے ناشتا کرنے کے دوران دودھ اُبل گیا تھا میں نے کوفی بنائی اور اپنے لیے چائے کا پانی رکھتے تنویر صاحب کے کمرے میں آ گیا۔ کوفی دونوں کے سامنے رکھی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اپنے لیے چائے بنا کر کچن کے کونے میں پڑے اسٹول پر بیٹھتے چائے پینے لگا۔ میرا روز کا یہی معمول تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں فیروزہ میڈم کے کمرے میں آیا تو ناشتا اسی طرح پڑا تھا اور وہ بدستور بستر میں تھیں مجھ پر نظر پڑتے بولیں۔

''تنویر کو ناشتا دے دیا؟''

''جی فیری میڈم!'' میں نے نگاہیں نیچی رکھے جواب دیا۔

''اور کون تھا اُن کے پاس؟''

''جی سلوی میم اور اُوٹھے میم۔'' میرے منہ سے اچانک نکل گیا۔ وہ تیزی سے اُٹھی اور اپنے کمرے سے باہر نکل گئی۔ مجھے پتا تھا کہ وہ اب کیا کرے گی اور جب تنویر صاحب کو معلوم ہو گا کہ میں نے بتایا ہے تو میری کمبختی آ جائے گی۔ مشکل سے یہ آسان اور اچھی نوکری ملی تھی مجھے۔ اب پھر سے سمندر کے کنارے دھکے کھانے پڑیں گے۔ میں بھی دبے قدموں سے تنویر صاحب کے روم کی طرف ہو گیا سامنے سے وہ دونوں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ میں ایک سائیڈ پر ہو گیا وہ باہر نکل گئیں۔ پہلے تو میں نے سوچا واپس پلٹ جاؤں مگر تجسس کے ہاتھوں مجبور آفس کے باہر آ رکا۔

اندر سے دھیمی آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر سنائی دے رہی تھیں۔

''مجھے تو برباد کر چکے ہو اب اور کس کس کی زندگی سے کھیلو گے تم۔''

''فیری خوامخواہ شک میں پڑی ہوئی ہو۔ وہ دونوں کوئی نیا سبجیکٹ ڈس کس کرنے آئی تھیں میرے پاس۔ تو آفس آتیں، تمہارے کمرے میں کیوں؟ یار کمرہ بھی تو آفس کا حصہ ہے۔ اگر آ گئیں تو کون سی قیامت آ گئی ہے اور ہاں تم ہر بات میں ٹانگ اڑانا چھوڑ دو، ورنہ میرے اور تمہارے درمیان دیوار اُٹھ جائے گی۔

''تنویر وہ تو تم نے اُٹھا رکھی ہے۔'' مجھے پتا ہے تم اُوٹھے میں آج کل بہت دلچسپی لے رہے ہو۔''

''وہ تینوں سٹوڈنٹ ہیں ہماری اور پھر ہمارے ساتھ ہی ایک فیملی کی طرح رہ رہی ہیں۔ اگر وہ میرے پاس آ جاتی ہیں تو ضروری نہیں میرا ان سے کوئی اور بھی معاملہ ہے۔''

تنویر فیری میڈم کو وضاحتیں کر رہے تھے مگر ان کا پارہ ابھی تک اُسی ڈگر پر اٹکا ہوا تھا۔

اچھا آپ جاؤ اپنے روم میں اور مجھے تیار ہونا ہے۔ تنویر صاحب کے لہجہ کی لاپروائی بتا رہی تھی کہ وہ فیری میڈم سے جان چھڑانے کے چکر میں تھے۔

فیری میڈم تذبذب کے عالم میں چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کے ضبط کے باوجود آنسو جھلک پڑے۔ میں کچھ کہے بغیر دروازے سے ہی لوٹ آیا۔ مجھے تنویر صاحب سے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں وہ مجھ سے دونوں کے بارے میں سوال نہ کر ڈالیں کہ تم نے جا کر بتایا تھا فیری میڈم کو۔ مگر انہوں نے کوئی بات نہ پوچھی اور نہ ہی کوئی اُن کی طرف سے ردعمل ہوا۔

شام کے کھانے کا پوچھنے گیا تو فیری میڈم سو رہی تھی۔ میں اُن کو جگائے بغیر واپس پلٹ آیا اور اوپر اپنے کمرے میں آگیا۔ جب بھی اُن کو ضرورت پڑتی تھی وہ گھنٹی بجا دیتے۔ گھنٹی کے پاس دو الگ الگ رنگ کے چھوٹے بلب لگے ہوئے تھے ایک سبز اور دوسرا سرخ۔ سرخ والا تنویر صاحب کا اور سبز والا فیری میڈم صاحبہ کا۔

جو بھی رنگ روشن ہوتا مجھے پتا چل جاتا کہ دونوں میں سے کون بلا رہا ہے۔

لیٹتے ہی مجھے اپنے گھر کی یاد آگئی۔ ماں باپ بہن بھائی، دوست یار میری آنکھوں کے آگے گھوم گئے، مگر میں واپس نہیں جا سکتا تھا اگر واپس گھر جاتا تو سبھی مجھ سے اشرف کے بارے میں سوال کرتے جس کو میں مار کر زمین میں دفن کر آیا تھا۔

☆......☆......☆

میں اور اشرف دونوں اپنے اپنے مویشی چرانے جاتے تھے دن بھر نہر کے کنارے مال مویشی منہ مارتے مارتے جب تھک جاتے تو آرام کرنے درختوں کے نیچے بیٹھ جاتے۔ ہم دونوں بھی کوئی نا کوئی کھیل کھیلنے لگتے۔ اسی طرح ہم دونوں کھیل رہے تھے کہ میری اور اشرف کی منہ ماری ہوگئی۔ اشرف نے میرے منہ پر گھونسہ جڑ دیا جواباً میں نے بھی اس کی تھپڑ دے مارا۔ ہم دونوں ایک دوسرے پر زور آزمائی کر رہے تھے کہ قریب پڑا ڈنڈا اُٹھاتے میں نے اشرف کے سر پر دے مارا وہ چکرا کر گرا اور پھر دوبارہ نہ اُٹھ پایا۔

نہر کنارے آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے اشرف کو گھسیٹ کر میں نے ایک جھاڑی کی اوٹ میں کر دیا اور خود تیز تیز قدم اٹھاتا قریبی کھیتوں کے مالک کی جھونپڑی کی طرف چل دیا۔ اکثر گزرتے ہوئے جھونپڑی کے اندر پڑا کھیتی باڑی کا سامان نظر آ جاتا تھا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے اِدھر اُدھر اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ میں جھونپڑی کے پچھواڑے سے گھوم کر سب کی نظروں سے بچتا اندر داخل ہو گیا۔ کونے میں پڑے سامان میں سے ایک کدال اُٹھائی اور چپکے سے باہر آ گیا۔

اشرف کی لاش جھاڑی کے پیچھے پڑی تھی سر پر لگنے والے ڈنڈے کی چوٹ سے بہنے والا خون اس کے چہرے پر اور زمین پر جم چکا تھا میں نے نہر کے نشیبی حصہ میں اُتر کر کدال سے زمین کا ایک حصہ کھودنے کے بعد اشرف کے ساکت جسم کو اپنے دونوں بازوؤں میں بھر کر بڑی مشکل سے کھودے ہوئے حصہ تک لایا پھر اُسے اندر رکھتے اوپر سے مٹی ڈال دی۔ اس کام سے فارغ ہو کر کدال میں نے نہر میں پھینکی اور آخری نظر دور سے نظر آنے والے اپنے گاؤں پر ڈالی۔ حسرت بھری نظروں سے اپنے مال ڈنگر کو دیکھا۔ شہر کی طرف جانے والی کچی سڑک پر آ گیا۔

کئی دن دھکے کھانے سے بعد ٹرین میں چڑھتا اُترتا کراچی پہنچ گیا۔ اس سوچ میں گم تھا کہ تنویر صاحب کے بلب والی گھنٹی گونجی اور میں سب کچھ ذہن سے جھٹک کر نیچے کی طرف چل پڑا۔

ان کے کمرے میں فیری میڈم ان کے بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ دونوں نارمل تھے مجھ پر نظر پڑتے فیری

میڈم نے مجھے مخاطب کرتے کہا کہ کھانا اِدھر تنویر کے روم میں لے آؤ۔"

"جی میڈم!" میں نے واپس مڑتے جواب دیا اور کچن میں آ کر کھانا گرم کرنے میں لگ گیا۔ کھانا رکھ کر میں کمرے سے باہر نکل کر راہداری میں پڑے بینچ پر بیٹھ گیا۔ اسی دوران سامنے سے اُوٹھے میم تنویر صاحب کے کمرے کی جانب آتی دکھائی دی۔ میں نے فوراً اُٹھ کر اشارہ سے فیری میڈم کا بتایا تو وہ الٹے قدموں سے واپس پلٹ گئی۔ تنویر صاحب کے کمرے سے یکدم اونچی آواز میں باتوں کا تبادلہ سنائی دینے لگا۔ صاف سنائی دے رہا تھا کہ فیری میڈم اُوٹھے میم کے بارے میں بیخ پا ہو رہی تھیں۔ پھر برتن اُٹھا کر پھینکنے کی آواز آئی اور میں گھبرا کر وہاں سے اُٹھ گیا۔ کچن کی صفائی کے دوران تنویر صاحب نے آ کر مجھے کمرے سے برتن اُٹھانے اور صفائی کرنے کا کہا۔ فیری میڈم شاید اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔

میں نے اِدھر اُدھر بکھری چیزیں اکٹھی کرتے فرش پر کپڑا لگایا اور کچن میں آ گیا۔ ان کی آئے دن لڑائی نے کالج کا سارا ماحول برباد کر رکھا تھا۔ اُوٹھے میم کا رابطہ بدستور تنویر صاحب سے جاری تھا۔ ایک دو بار تو فیری کی دونوں سے خاصی تلخ کلامی بھی ہوئی تھی۔ کئی دن تک فیری میڈم اور تنویر صاحب کے درمیان بول چال بند ہو گئی۔ میں ان کو ناشتا دینے گیا تو ان کے روم میں جمی بیٹھا ہوا تھا۔

جمی بھی غیر ملکی اور غیر مذہب تھا۔ جمی کو یوں بے تکلفی سے ان کے روم میں بیٹھا دیکھ کر مجھے جھٹکا لگا کیونکہ میں نے کبھی بھی مرد سٹوڈنٹ کو فیری میڈم کے روم میں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ ماسوائے تنویر صاحب کے۔

بلو ایک کپ اور لاؤ کوفی کا۔ فیری میڈم نے مجھے ناشتا لگانے کے دوران کہا۔

"جی میڈم!" میں نے ٹرے ان کے سامنے پڑی ٹیبل پر رکھتے جواباً کہا اور کچن کی جانب آ گیا۔ کوفی کا کپ بنایا اور ان کے روم میں لے کر چل پڑا۔ جمی اپنے لیے بریڈ پر بیٹر لگا رہا تھا۔ جمی کے آگے کوفی رکھتے میں واپس جانے لگا تو فیری میڈم نے مجھے روکتے مخاطب کیا۔

"بلو تنویر سے جمی کا تذکرہ مت کرنا کہ وہ میرے روم میں بیٹھا تھا۔"

"جی میڈم!" کہتے میں واپس کچن میں آ گیا اب میرے ذہن میں بات آ گئی کہ تنویر صاحب کو جلانے کے لیے انہوں نے جمی سے راہ رسم بنایا تھا۔ کیونکہ تنویر صاحب اُوٹھے میم میں دلچسپی لے رہے تھے تو فیری میڈم نے جمی سے دوستی کر لی۔ یہ بات کب تک چھپتی۔ اس سلسلہ کا تنویر صاحب کو بھی علم ہو گیا تھا کیونکہ ایک آدھ بار فیری میڈم جمی کے ساتھ اس کی گاڑی میں شاپنگ کے لیے گئی اور مجھے سامان اُٹھانے کے بہانے آواز دے کر بلایا تا کہ میں یہ بات تنویر صاحب کے کان میں ڈال دوں۔ میں نے بھی دبی زبان میں ان سے کہہ دیا کہ آج کل فیری میڈم جمی صاحب میں بہت دلچسپی لے رہی ہیں۔ تو انہوں نے جواباً پریشانی سے کہا۔

"بلو میں کیا کر سکتا ہوں۔ وہ اپنی مرضی کی مالک ہے۔"

"سر اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں؟

ہاں بولو!"

"وہ یہ سب کچھ آپ کو دکھانے کے لیے کر رہی ہیں۔" "ان کو اُوٹھے میم سے آپ کا ملنا جلنا پسند نہیں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"اُسے پتا نہیں کیا کیا پسند ہے اور کیا نہیں۔" کہتے اپنے سامنے رکھے اسٹینڈ پر مٹی کے مجسمہ کے

نقوش کی کاٹ چھانٹ کرنے لگے۔

فیری میڈم نے سامنے سے آتے مجھے آواز دی۔ میں تنویر صاحب کے آفس کی طرف جاتے رک گیا۔ جی میڈم؟

''میرے کمرے کی صفائی کرو جا کر!''

''جی میڈم!'' کہتے میں اُسی قدم ان کے روم میں آ گیا۔ سامنے جمی واش روم سے نہا کر باہر نکل رہا تھا۔ میں بری طرح چونکا اس کا مطلب یہ تھا کہ فیری میڈم نے مجھے جان بوجھ کر اپنے روم میں صفائی کے بہانے بھیجا تھا تاکہ میں جمی کو دیکھوں اور جا کر تنویر صاحب کو بتاؤں۔ جب دونوں کے درمیان اونچ نیچ چل رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے آفس اور روم میں نہیں آ رہے تھے۔ میں ہی رہ گیا تھا اِدھر اُدھر کے حالات کی رپورٹنگ کے لیے۔ تنویر صاحب براہِ راست مجھ سے پوچھ لیتے جبکہ وہ بہانے سے اپنی اور جمی کی قربت کے بارے میں میرے تھرو تنویر صاحب تک آنکھوں دیکھا حال پہنچا دیتی۔ میرے لیے یہ سارا کچھ باعث پریشانی تھا۔ دونوں کے درمیان اُوٹھے میم اور جمی صاحب اچھی خاصی دیوار اُٹھا چکے تھے۔

میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح دونوں پھر ایک دوسرے کے لیے وہی احساس اپنے اندر واپس لے آئیں۔ مگر دونوں طرف سے مایوس ہو گیا تھا۔

اُوٹھے میم مزاج کی بہت دھیمی اور قناعت پسند تھی اور فیری میڈم سے زیادہ خوبصورت بھی۔ مردوں کے حالات تو کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہوتے۔ تنویر صاحب کی خواہش تھی کہ وہ ایک تیر سے دو شکار کرتے رہیں۔ مگر فیری میڈم اس صورتِ حال سے دور بھاگتی تھی۔

تنویر صاحب اُوٹھے میم کے ساتھ اب کھلم کھلا آتے جاتے تھے۔ اپنی گاڑی میں جبکہ فیری میڈم جمی کے چکر میں پوری طرح گم تھی۔ ایک دو بار میں جب اُن کے بلانے پر روم میں گیا تو کمرے سے ناگوار سی بدبو کا احساس ہوا، جیسے کوئی زہریلا دھواں کمرے کی فضا میں موجود ہو۔ فیری میڈم کی آنکھیں سرخ اور چہرہ بجھا ہوا دکھائی پڑتا تھا مجھے۔

جمی اور فیری میڈم کا افیئر بھی زوروں پر تھا ادھر تنویر صاحب اور اُوٹھے میم بھی خاصے مصروف تھے۔ میں دونوں جانب اپنی ڈیوٹی نبھا رہا تھا۔ میرے اندر کا خوف مجھے باہر کی دنیا سے دور رکھے ہوئے تھا۔ اس لیے میں فارغ وقت اپنے اسٹور نما کمرے میں گزارتا۔

☆......☆......☆

فیری میڈم نے صبح کچھ سامان منگوایا تھا مجھ سے۔ ان کو بقایا پیسے دینے یاد نہ رہے تھے۔ جب میں ان کے روم کی طرف گیا تو باہر سے تالا لگا ہوا تھا، شاید وہ باہر گئی تھیں۔

میں واپس آ گیا اور کچن میں آ کر رات کے کھانے کا انتظام کرنے میں لگ گیا۔ رات کو تنویر صاحب اور فیری میڈم کھانا لیٹ نائٹ کھاتے تھے۔ اس لیے میں کچن بند کر کے صبح ناشتے کا سامان لینے مارکیٹ کی طرف چل پڑا۔ ٹیلر ماسٹر کے پاس تنویر صاحب کا کوٹ مرمت کے لیے پڑا تھا، اُسے کئی روز ہو چلے تھے۔ سامان لے کر میں کوٹ کا پوچھنے اس کی دوکان کی طرف ہو گیا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا کہا اور کوٹ کو مرمت کرنے لگ گیا۔ تنویر صاحب نے ایک دو بار مجھے کوٹ کی بابت پوچھا تھا۔

زیادہ دیر نہ لگی اور میں کوٹ لے کر واپس کالج کی طرف ہو گیا۔

فیری میڈم کے روم کی بتی جل رہی تھی۔ وہ واپس آ گئی ہو گی۔ سوچ کر میں اُس طرف بڑھ گیا دروازے پر دستک دینا ہی چاہتا تھا کہ میرے ہاتھ

رُک گئے۔ روم کے اندر جمی اور فیری میڈم کی آواز کے ساتھ ساتھ تنویر صاحب کی آواز بھی سنائی دی جو انگلش میں کچھ کہہ رہے تھے۔ جواب میں فیری میڈم نے انہیں ڈانٹنے والے انداز میں کہا کہ تم کون ہوتے ہو میرے معاملہ میں دخل دینے والے جو میرا دل چاہے گا میں کروں گی۔''

اس بار جمی نے بھی فیری میڈم کی طرفداری کی۔ وہ بھی اونچی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ انگریزی کی مجھے تو سمجھ نہیں تھی مگر میں نے اندازہ لگالیا کہ دونوں کے درمیان فیری میڈم زیر بحث ہے۔ میں جلدی سے مڑتا ہوا اوپر اپنے سٹور کی طرف چل پڑا۔

اُدھر میم اور تنویر صاحب کے درمیان روز بروز بڑھتی دوستی اور فیری میڈم کے آگے بڑھتے معاملہ کو دیکھتے میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں اب اس کالج کو خیر باد کہہ دوں۔ سو میں اپنا سامان سمیٹ کر ایک رات چپکے سے وہاں سے نکل کر دوبارہ نفیس بھائی کے پاس آگیا۔ انہوں نے کوئی سوال جواب پوچھے بغیر مجھے دوبارہ کام پر رکھ لیا۔ میں نے اپنا سامان پھر سے کسی ڈھابے والے کے پاس رکھ دیا اور دربار پر ڈیرہ ڈال لیا۔ وہاں کے کئی ایک لوگ میرے واقف کار بن چکے تھے۔ اس لیے میں ان کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔

☆......☆......☆

میرے پاس کچھ پیسے جمع ہو چکے تھے۔ اس سے اپنے لیے کپڑے جوتے خریدے اور باقی بچی پونجی میں نے حاجی ڈھابے والے کے پاس امانتاً رکھ دی۔

میرا ٹھکانہ دربار اور دن ڈوبنے سے پیشتر نفیس بھائی کے چائے والے اڈے پر پہنچ جانا تھا۔ مگر میری یہ مصروفیت چند روز ہی جاری رہ سکی۔

میں سمندر کے کنارے چائے وغیرہ دے رہا تھا گاہکوں کو کہ تنویر صاحب پولیس کے ہمراہ وہاں آئے اور میری طرف اشارہ کرتے کہا۔

''یہی ہے وہ۔'' میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرانگی سے ان سب کی طرف دیکھ رہا تھا کہ کیا ماجرا ہے۔ پولیس والے مجھے پکڑ کر اوپر کھڑی پولیس وین میں لے آئے اور لاک اپ میں بند کر دیا۔ میں اپنا جرم پوچھ رہا تھا کہ پڑنے والی ڈانٹ پر خاموش ہوگیا۔ تنویر صاحب کافی دیر انچارج کے کمرے میں رہے۔ لاک اپ سے انچارج کا کمرہ صاف نظر آرہا تھا پھر وہ میرے سامنے تھانے سے باہر نکل گئے۔

رات کو مجھے نکال کر بے دردی سے مار پیٹ کرتے پوچھا گیا کہ تم نے فیری میڈم کا قتل کیوں کیا ہے؟'' یہ سب کچھ تو میرے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا۔ جو قتل کر کے میں کراچی بھاگ آیا تھا۔ اس کے بارے میں مَیں نے قدرت کا انصاف جانتے اُس کا اعتراف کرلیا مگر مجھے فیری میڈم کا گلا دبا کر قتل کرنے جیسے بے بنیاد قتل کے جرم میں زیر دفعہ 302 ت۔پ کا مقدمہ درج کرلیا گیا۔

میں نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی زبان پر قفل لگالیا اور اشرف کے قتل کا تو میں اعتراف کر ہی چکا تھا اور مجھ پر فیری میڈم کو گلا دبا کر قتل کرنے کا بھی مقدمہ درج ہوگیا۔

اس طرح اس معصوم کی زندگی کی کہانی بھی ختم ہوگئی۔ وہ سب کچھ بتا کر میرے سامنے یوں بیٹھا تھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ صاحب جی! اللہ کی سزا سے بچنا آسان تو نہیں ہوتا لیکن کیا میری زندگی کا انجام اشرف کے بجائے فیروزہ میڈم کے قتل کے ناکردہ جرم سے ہوگا۔''

اور میں خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

☆......☆......☆

پلیٹ فارم

تاوان زندگی کا

اُس نوجوان کی داستان جسے خوشیوں اور غم کے لمحات ایک ہی پلیٹ فارم پر ملے تھے

ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم میری زندگی میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے نہ صرف میری بلکہ میرے پورے گھرانے کی زندگی اس طرح بدل گئی جیسے اندھیرے سے روشنی میں آگئے ہوں اور پھر یہیں سے ایک..... ٹھہریے! پہلے میں اپنا اور اپنے گھرانے کا تعارف کروادوں۔

میرا نام آصف ہے۔ میری فیملی میں ہم دو بھائی دو بہنیں، والدہ اور والد ہیں۔ ہمارے والد صاحب ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں سیلز مین تھے، جن کی بہت قلیل تنخواہ تھی۔ ہماری رہائش ایک بہت ہی پسماندہ اور سہولیات سے عاری علاقے میں تھی۔ یہ ایک غریبوں کی بستی تھی۔ جہاں پر رکشہ چلانے والے، چھابڑی فروش، ریڑھی چلانے والے، رنگ وروغن کرنے والے، مستری، مزدور اور اس طرح کے دوسرے پیشوں سے منسلک محنت مشقت اور حق حلال کی کمائی کرنے والے لوگ رہتے تھے۔ گو یہ سب لوگ انتہائی مفلسی اور غربت کی زندگی گزار رہے تھے۔ مگر دل کے بہت امیر تھے۔ آپس میں سب ایک خاندان کی طرح مل جل کر رہتے، ایک دوسرے کا دکھ درد اپنی حیثیت سے بڑھ کر بٹاتے اور ایک دوسرے کے کام آتے تھے۔

میرے ابا خود تو صرف پرائمری پاس تھے مگر اپنی اولاد کو پڑھانے کا شوق رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہماری خاطر سولہ سولہ گھنٹے کام کرتے تھے۔ میری امی بھی گھر کی غربت کو کچھ کم کرنے کے لیے دو تین کوٹھیوں میں ماسی کا کام کرتی تھیں۔ مگر اس کے باوجود گھر میں غربت نے ڈیرے جما رکھے تھے۔

میں ایف اے میں پڑھ رہا تھا۔ مجھ سے چھوٹی بہن سلطانہ دسویں میں تھی، اُس سے چھوٹا بھائی ریاض آٹھویں میں تھا اور سب سے چھوٹی بہن رضوانہ ساتویں میں تھی۔

انتہائی تنگدستی، غربت اور افلاس کے باوجود ہمارا پورا گھرانہ صابر اور شاکر تھا۔ گھر کے تمام افراد نماز روزے کے پابند تھے۔ ابا صبح سویرے سوکھی روٹی چائے کے ساتھ کھا کر کام پر چلے جاتے اور اسی طرح کا ناشتا ہمارا بھی تھا۔ امی بھی کوٹھیوں میں کام کرنے کے لیے چلی جاتی تھیں اور ہم سب بہن بھائی بھی سرکاری اسکول، کالج چلے جاتے۔ ہمارے دیگر رشتے دار بھی غربت کی چکی میں پس رہے تھے۔

انہی معمولات میں وقت گزر رہا تھا کہ ایک دن ہماری زندگی میں بھونچال آ گیا۔ ہوا یہ کہ ابا کو ایک عرصے سے گھریلو فکروں اور پریشانیوں کی وجہ سے ہائی بلڈ پریشر اور شوگر کا مرض لاحق تھا۔ مناسب علاج نہ ہونے کی وجہ سے ابا کے گردے فیل ہو گئے۔ انہیں سرکاری سول اسپتال میں لے کر گئے۔ مگر یہاں غریبوں، ناداروں کی کون سنتا ہے؟ کون پوچھتا ہے؟ نہ ہمارے پاس پیسے تھے اور نہ وسائل تو دیکھتے ہی دیکھتے چند دنوں میں ابا کا انتقال ہو گیا۔

جب ابا کی میت گھر لائی گئی تو ہم سب بہن بھائی اُن کی میت سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر روئے۔ امی پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے اور وہ بار بار یہی کہتی تھیں کہ آصف کے ابا! ہمیں کس کے سہارے چھوڑ گئے ہو۔'' اِسی آہ وبکاہ میں ابا کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

☆......☆......☆

ابا کی وفات کے بعد ہم پر مشکلوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ چونکہ بہن بھائیوں میں، میں سب سے بڑا تھا تو اب گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ میرے کاندھوں پر آن پڑا تھا۔ میں نے فوراً فیصلہ کیا اور تعلیم کو خیر باد کہہ دیا، کیونکہ اب گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی تھی۔ مجھ سے اب بھائی بہنوں کے فاقہ زدہ چہرے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ میری عمر اُس وقت سترہ سال تھی۔ اب سب سے بڑا مسئلہ روزی کمانے کا تھا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ بہت ہاتھ پیر مارے مگر کام کا کوئی وسیلہ نہ بنا۔ جس ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں ابا سیلز مین تھے وہاں رابطہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ اُن کے پاس سرِ دست کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ ابا کی بیماری کے بعد اگلے ہی دن انہوں نے ایک نیا سیلز مین رکھ لیا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں۔

ہماری بستی میں ایک بزرگ رہتے تھے جو ریلوے اسٹیشن پر پھل فروٹ بیچا کرتے تھے۔ انہی کی وساطت اور کوشش سے مجھے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اخباروں، کتابوں اور رسالوں کے اسٹال پر یومیہ اجرت کی بنا پر نوکری مل گئی۔ چونکہ یہ ریلوے اسٹیشن جنکشن تھا تو یہاں سے بہت سی ٹرینیں آتی جاتی تھیں۔

جب بھی کوئی ٹرین آ کر رُکتی تو میں فوراً اخبار، میگزین اور مختلف کتابیں رسالے لے کر ڈبے میں جاتا تو اس طرح کچھ سیل ہو جاتی۔ پھر میں نے ایک دکان سے اُدھار چھوٹی موٹی چیزیں مثلاً گولی، ٹافی بسکٹ، پنسلیں، غبارے بچوں کے چھوٹے چھوٹے کھلونے وغیرہ بھی

اخباروں رسالوں کے ساتھ بیچنے شروع کر دیے جن سے تھوڑی بہت معمولی سی زائد آمدنی ہو جاتی۔

☆......☆......☆

عدت کے دن پورے ہونے کے بعد امی کوٹھیوں میں کام کرنے کی غرض سے صبح سویرے گھر سے نکل جاتی تھیں اور بعد از دوپہر گھر آتیں اور نڈھال ہو کر چارپائی پر گر جاتیں۔

سلطانہ نے دسویں کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ ایک واقف کار کی مدد سے قسطوں پر ایک سلائی مشین لے کر میری بہن سلطانہ نے گھر میں کپڑوں کی سلائی کا کام شروع کر دیا۔

امی کی صحت دن بدن گر رہی تھی، اُن کو مسلسل کھانسی کے دورے پڑتے۔ کھانستے کھانستے اُن کا برا حال ہو جاتا تھا۔ اب تو کھانسی کے ساتھ خون بھی آنے لگا تھا اور اُن کو بخار رہنے لگا۔ ایک دن جب اُن کی حالت بہت بگڑی تو انہیں ایک خیراتی اسپتال میں لے گیا۔ جہاں پر چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے انکشاف کیا کہ امی کو ٹی بی کا مرض ہے۔

اپنی بساط کے مطابق ہم نے اُن کا علاج شروع کروایا مگر کوئی خاص افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ کیونکہ یہاں تین وقت کی روٹی پوری نہیں ہو رہی تھی تو اسپیشلسٹ ڈاکٹر سے علاج کیسے کرواتے۔

امی کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھیں۔ جب کوٹھی والی بیگمات کو پتا چلا کہ امی کو ٹی بی کا مرض ہے تو انہوں نے امی کو کام سے منع کر کے فارغ کر دیا۔ اب امی سارا دن چارپائی پر پڑی رہتیں۔ دن رات کھانستی اور خون تھوکتی رہتیں۔

سلطانہ کھانا پکانے اور گھر کے کاموں کے ساتھ رات گئے تک کپڑوں کی سلائی بھی کرتی۔ رضوانہ بھی اُن کی پوری پوری مدد کرتی اور امی کی دیکھ بھال بھی کرتی۔

☆......☆......☆

ایک دن اسٹیشن پر ایک ٹرین آ کر رُکی تو میں سارے ڈبوں میں باری باری چیزیں بیچنے گیا۔ جب ٹرین کے آخری ڈبے سے اُترا تو ٹرین چل پڑی۔ میں پلیٹ فارم کے آخری حصے سے چل کر اسٹال کی طرف آ رہا تھا تو اچانک میری نظر ریلوے لائن کے پاس پڑے ہوئے ایک مردانہ ہینڈ بیگ پر پڑی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو وہ ہزار ہزار کے اور پانچ ہزار کے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں کچھ ضروری کاغذات بھی تھے۔ وہ پرس یقیناً کسی مسافر کا ہی گرا ہوگا کیونکہ ٹرین چند منٹ پہلے ہی یہاں سے روانہ ہوئی تھی۔

اب ہوا یہ کہ نوٹوں سے بھرے ہوئے اس بیگ کو دیکھ کر میں ایک کشمکش میں مبتلا ہو گیا کہ اس بیگ کا کیا کروں۔ اب مجھے ایک طرف اپنے گھر کے حالات، امی کی بیماری، غربت، افلاس اور بھائی بہنوں کے فاقہ زدہ چہرے نظر آ رہے تھے۔ حالات کی بے رحمی بھی نظر آ رہی تھی۔ ہمیں پیسوں کی اشد ضرورت تھی۔ ان سے میں کوئی کاروبار شروع کر سکتا تھا۔ بہنوں کی شادی کر سکتا تھا اور امی کا علاج بھی...... تو دل یہ کہتا تھا کہ آصف کون دیکھ رہا ہے بس چپکے سے اس بیگ کو چھپا کر گھر لے جاؤ اور نئی خوشحال زندگی شروع کرو۔ مگر دوسری طرف اُس مسافر کا خیال بھی آ رہا تھا کہ جس کا یہ بیگ تھا۔ پتا نہیں اُس بے چارے پر کیا بیت رہی ہوگی۔ اب میرے دل و دماغ اور ضمیر کے درمیان ایک جنگ چھڑ گئی۔ میں وہاں کافی دیر اسی کشمکش میں بیٹھا رہا۔ دل و دماغ اور ضمیر کی اس جنگ میں بالآخر فتح ضمیر کی ہوئی۔ میں ایک فیصلہ کر کے اٹھا۔ اُس بیگ کو اخباروں میں لپیٹا اور سیدھا اسٹیشن ماسٹر صاحب کے دفتر چلا گیا۔

اسٹیشن ماسٹر صاحب بہت اچھے اخلاق کے مالک ایک نیک اور دیانت دار انسان تھے۔ میں نے اُن کو جا کر سارا ماجرا سنایا اور بیگ اُن کے حوالے کر دیا کہ کوئی ایسی صورت نکالیں کہ جس سے یہ بیگ اُس کے اصل حقدار تک پہنچ جائے۔ انہوں نے بیگ کو الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا اور کچھ دیر سوچ کر کہنے لگے کہ یہ بیگ یقیناً جو ٹرین ابھی گئی ہے اُس میں سوار کسی مسافر کا گرا ہے۔ اور ٹرین ابھی اگلے اسٹیشن پر نہیں پہنچی ہوگی۔ تو انہوں نے فوراً اگلے اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر کو فون کیا کہ جو ٹرین آ رہی ہے اُس کے آتے ہی لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کروا دیں کہ کسی مسافر کا کوئی قیمتی سامان یا چیز گم ہوئی ہو تو وہ پچھلے ریلوے اسٹیشن پر آ کر نشانی بتا کر اسٹیشن ماسٹر سے لے سکتا ہے۔''

چنانچہ جیسے ہی ٹرین اگلے اسٹیشن پر جا کر رُکی تو وہاں کے اسٹیشن ماسٹر نے چار پانچ مرتبہ اعلان کروایا تو تھوڑی

دیر کے بعد وہاں سے فون آ گیا کہ ایک مسافر کا بیگ گم ہو گیا ہے اور اُس نے فلاں فلاں نشانی بتائی ہے۔ تو اسٹیشن ماسٹر صاحب نے کہا کہ آ کر اپنی امانت لے لو۔ تو اُس نے کہا کہ وہ مسافر آ رہا ہے جس سے مجھے تسلی اور خوشی ہوئی کہ چلو حق دار تک اُس کی امانت پہنچ جائے گی۔

پھر میں واپس اپنے اسٹال پر آ گیا۔

بس کوئی ایک گھنٹے کے بعد اسٹیشن ماسٹر صاحب نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا۔ جب میں وہاں گیا تو دیکھا کہ پچاس سال کی عمر کے ایک نہایت ہی نفیس اور اچھی پرسنالٹی والے صاحب بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر اسٹیشن ماسٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ یہ اقبال صاحب ہیں اور انہی کا بیگ گرا تھا۔"

پھر انہوں نے میرا تعارف کروایا کہ یہ آصف ہے اور یہی وہ لڑکا ہے جسے آپ کا بیگ ملا تھا۔"

یہ سن کر اقبال صاحب کرسی سے اُٹھے، مجھ سے مصافحہ کیا اور اپنے گلے لگا لیا۔ پھر میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھا لیا۔

اسٹیشن ماسٹر صاحب نے اُن کا بیگ الماری سے نکال کر اُن کے حوالے کیا اور کہا کہ اچھی طرح چیک کر لیں کہ رقم اور ہر شے پوری ہے۔"

تو اقبال صاحب نے فوراً کہا چیک کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یقیناً اس میں ہر چیز اور رقم پوری ہو گی۔" پھر انہوں نے بیگ میں سے کچھ رقم نکال کر مجھے انعام کے طور پر دینا چاہی تو میں نے لینے سے انکار کر دیا کہ یہ میرا فرض تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ کی امانت آپ تک پہنچ گئی ہے اور یہی میرا انعام ہے۔"

پھر اسٹیشن ماسٹر صاحب نے اقبال صاحب کے لیے اور میرے لیے چائے منگوائی اور باتوں باتوں میں اقبال صاحب کو میرے حالات بتائے کہ بچہ بہت ضرورت مند ہے۔ گھر میں انتہائی غربت اور افلاس ہے۔ ماں ٹی بی کی مریضہ ہے مگر اس نے ایمانداری، دیانت داری سے فرض شناسی کا مظاہرہ کیا تو آپ کا گم شدہ بیگ آپ تک پہنچ گیا۔" جب میرے حالات سُنے تو اقبال صاحب گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

چائے پینے کے بعد انہوں نے اپنا مکمل تعارف کروایا کہ وہ بزنس مین ہیں۔ لاہور کے رہائشی ہیں۔ ایک فیکٹری ہے اور کاروبار کے سلسلے میں اکثر مختلف شہروں میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ اگر اُن کا بیگ نہ ملتا تو اُن کا بہت بڑا نقصان ہو جاتا اور کاروباری ساکھ بھی بُری طرح متاثر ہوتی۔ انہوں نے مزید بتایا کہ اُن کا وسیع کاروبار ہے۔ اور انہیں مجھ جیسے محنتی، ایماندار دیانت دار ورکر کی ضرورت ہے۔

انہوں نے مجھے آفر دی کہ میں اپنی امی، بھائی اور بہنوں کو ساتھ لے کر لاہور آ جاؤں۔ تو وہ مجھے معقول تنخواہ پر ملازمت دے دیں گے۔ رہائش بھی دیں گے اور میری امی کا علاج بھی اسپیشلسٹ سے کروائیں گے۔ انہوں نے اپنا ٹیلی فون اور گھر کا ایڈریس دیا اور کہا کہ اپنے گھر والوں سے مشورہ کر کے جلد از جلد لاہور آ جاؤ اور آنے سے ایک دن پہلے مجھے فون کر دینا۔ پھر وہ شکریہ ادا کر کے دعا سلام کے بعد چلے گئے۔

"اُن کے جانے کے بعد اسٹیشن ماسٹر صاحب نے بھی مجھے یہی سمجھایا کہ اقبال صاحب کی آفر قبول کر لو۔"

چنانچہ گھر آ کر میں نے امی، بھائی، بہنوں کو سارا ماجرا سنایا اور کافی سوچ بچار صلاح و مشورے کے بعد اور گھر کے موجودہ حالات اور مستقبل کو دیکھتے ہوئے یہی فیصلہ کیا کہ اقبال صاحب کی آفر معقول ہے اور قبول کر لینی چاہیے۔

چند دن کے بعد اسٹیشن ماسٹر صاحب نے اُن کو فون کر کے بتایا کہ ہم لاہور آنے کے لیے تیار ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ لہٰذا تین دن کے بعد لاہور آ جاؤ۔

الغرض تیسرے دن میں اپنی امی، بھائی اور دونوں بہنوں کے ساتھ مختصر ضروری سامان لے کر بذریعہ ٹرین لاہور پہنچ گیا۔ زندگی میں پہلی بار ہم کسی دوسرے شہر میں جا رہے تھے۔ تھوڑی بہت پریشانی بھی تھی مگر اللہ کی ذات پر پورا بھروسہ اور توکل تھا۔

☆......☆......☆

لاہور پہنچ کر میں نے امی، بھائی، بہنوں کو ایک بینچ پر بٹھایا اور لاہور کے اسٹیشن ماسٹر کو ملا کیونکہ ہمارے شہر کے اسٹیشن ماسٹر صاحب نے اُن کو فون کر کے ہمارے بارے میں بتا دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اقبال صاحب کو فون کیا کہ

آپ کے مہمان آچکے ہیں اور لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر بیٹھے ہیں۔ اقبال صاحب نے ہمیں وہیں رُکنے کو کہا اور بتایا کہ اُن کا ڈرائیور گاڑی لے کر ہمیں لینے کے لیے آرہا ہے۔

تقریباً پونے گھنٹے کے بعد اُن کا ڈرائیور آگیا اور ہمیں گاڑی میں بٹھا کر اقبال صاحب کی کوٹھی میں لے آیا۔ اپنے گھر میں اقبال صاحب نے بالکل اپنوں کی طرح ہمارا والہانہ استقبال کیا اور ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اپنی بیگم شاہدہ کو بلایا اور ہمارا تعارف کروایا۔

اقبال صاحب خود تو اچھے تھے ہی مگر شاہدہ بیگم تو اُن سے بھی اچھی نکلی تھیں۔ وہ بڑی محبت، اپنائیت اور پُرتپاک طریقے سے ہمیں ملیں۔ ہماری مشروبات، پھلوں، چائے اور دیگر لوازمات سے تواضع کی گئی۔ پھر کوٹھی کے ساتھ ہی بنے ہوئے دو کمروں، باورچی خانہ باتھ روم پر مشتمل کوارٹر میں ہماری رہائش کا پہلے سے بندوبست کیا ہوا تھا۔ اور تمام ضرورت کا سامان موجود تھا۔ کوارٹر میں بجلی، پانی اور گیس وغیرہ کی ہر سہولت موجود تھی۔ انتہائی صاف ستھرا کوارٹر تھا۔

شاہدہ بیگم جن کو ہم آنٹی شاہدہ کہنے لگے تھے انہوں نے ہمیں آرام کرنے کا کہا اور ہم کوارٹر میں آگئے۔

اگلے روز ناشتے کے بعد اقبال صاحب نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مجھے اور میری امی کو ساتھ لیا اور ٹی بی اسپتال میں لے جا کر مکمل چیک اپ کروایا۔ ایکسرے اور دیگر ضروری ٹیسٹ کروائے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اُن کا مسلسل چھ ماہ علاج ہوگا۔ دوائی میں ناغہ نہیں کرنا۔ ہر ہفتے چیک اپ کروانا ہے اور اچھی خوراک کے ساتھ مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہم دوائیوں کا مکمل کورس لے کر انہیں گھر لے آئے اور اُن کا علاج شروع ہوگیا۔

☆......☆......☆

آنٹی شاہدہ کا اپنا ایک بہت بڑا بوتیک تھا۔ جب اُن کو پتا چلا کہ سلطانہ ٹیلر کا کام جانتی ہے تو وہ بہت خوش ہوئیں اور سلطانہ کو اپنے ساتھ بوتیک کے کام میں لگا لیا۔

ریاض کو نویں کلاس اور رضوانہ کو آٹھویں میں داخل کروادیا گیا۔ دونوں کے اسکول قریب ہی تھے۔ سلطانہ امی کی دیکھ بھال بھی کرتی اور بوتیک کا کام بھی۔ رضوانہ اسکول سے آکر کھانا وغیرہ بناتی اور گھر کے دیگر کام بھی کرتی۔

اقبال صاحب کی بہت بڑی فیکٹری تھی جہاں مختلف پراڈکٹس تیار ہوتی تھیں اور دوسرے شہروں تک اُن کی سیل تھی۔ مجھے چونکہ کسی بھی کام کا کوئی تجربہ نہیں تھا تو اقبال صاحب نے پہلے پیکنگ کے شعبے میں معقول معاوضے پر ملازمت پر رکھا پھر کچھ عرصہ بعد میری ڈیوٹی اسٹور پر لگادی، جہاں فیکٹری کی تیار شدہ مصنوعات رکھی جاتی تھیں اور سیل کے شعبہ سے جاری شدہ سلپ کے مطابق ان مصنوعات کی ترسیل کی جاتی۔

امی کا علاج باقاعدگی سے ہو رہا تھا اور وہ دن بدن صحت یاب ہوتی جارہی تھیں۔

سلطانہ بہت محنت اور لگن سے بوتیک کا کام کررہی تھی۔ وہ محنتی ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ذہین بھی تھی اور نت نئے ڈیزائن کے ملبوسات تیار کرتی جو کہ بہت خوبصورت ہوتے اور پسند کیے جاتے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آنٹی شاہدہ کے بوتیک کے تیار شدہ ملبوسات کی دھوم دور دور تک پھیل گئی۔ اور آمدنی پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی۔ ریاض اور رضوانہ پڑھائی میں ٹھیک جارہے تھے۔

پلک جھپکتے ہی سال بھر کا عرصہ بیت گیا۔ امی اب مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی تھیں۔ انہوں نے کوٹھی کا سارا انتظام سنبھال لیا تھا۔

اقبال صاحب کا بزنس دن بدن خوب پھل پھول رہا تھا اور پھر انہی معمولات میں دو سال گزر گئے۔ مجھے فیکٹری کے مختلف شعبوں میں کام کا کافی تجربہ ہوگیا تھا۔ اقبال صاحب مجھ پر بہت بھروسا کرتے اور میں بھی خوب محنت سے کام کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ میرے کام سے بہت مطمئن اور خوش تھے۔

ریاض نے میٹرک کرلیا تو اُس کا داخلہ کالج میں کروا دیا، اسی طرح رضوانہ اب دسویں کلاس میں تھی۔ میں صبح فیکٹری جاتا اور رات گئے واپس آتا، میری طرح سلطانہ بھی صبح سے لے کر رات تک بوتیک میں رہتی۔ رضوانہ اسکول سے آکر کھانا وغیرہ بناتی۔ ہم سب اپنی اپنی روٹین میں مگن تھے۔

☆......☆......☆

ریاض نے جب کالج میں داخلہ لیا تو وہاں اُس کی دوستی کچھ آوارہ لڑکوں سے ہوگئی۔ پہلے اُس نے سگریٹ

پینے شروع کردیے۔ پھر چرس کے کش بھی لگانے لگا اور رفتہ رفتہ پڑھائی سے دور ہوتا گیا۔

ہمیں پتا اُس وقت چلا جب وہ ایف اے کے بورڈ کے سالانہ امتحان میں بری طرح فیل ہوگیا۔ تمام مضامین میں اُس کی سپلی آئی تھی۔ اُس کا رزلٹ دیکھ کر ہم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اُسے بہت سمجھایا اور سپلیمنٹری امتحان کی تیاری کے لیے اُسے کوچنگ سینٹر میں داخل کروادیا، مگر یہاں بھی اُس کی یہی روٹین رہی اور وہ ایف نہ کرسکا۔ نتیجتاً اُسے بھی فیکٹری میں کام پر لگادیا گیا تھا مگر وہ اپنی ساری تنخواہ نشے میں اُڑا دیتا تھا۔ فیکٹری کا کام بھی دلچسپی اور دلجمعی سے نہ کرتا بس یوں لگتا تھا جیسے اُس کو صرف اپنے نشے سے دلچسپی ہو۔

میں خوب محنت اور لگن سے فیکٹری کا کام کررہا تھا۔ اقبال صاحب کا کاروبار خوب پھیل رہا تھا اور وہ بہت مصروف رہنے لگے تھے۔ اقبال صاحب کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ بڑا بیٹا فیکٹری کے تمام معاملات کو دیکھتا۔ دوسرا بیٹا سیل آفس ہوتا تھا۔ پروڈکٹس کی تیاری کے لیے خام مال اور میٹریل کی خریداری اقبال صاحب خود کرتے تھے۔ اب میری ڈیوٹی مستقل اقبال صاحب کے ساتھ تھی۔ وہ اکثر میٹریل کی خریداری کے لیے کراچی اور دیگر شہروں میں جاتے اور مجھے ساتھ لے کر جاتے۔ اس طرح مجھے میٹریل کی خریداری اور اچھے میٹریل کی پہچان کا بھی کافی تجربہ ہوگیا۔

سال بعد جب فیکٹری کا حساب کتاب ہوتا تو وہ منافع میں سے تمام ملازمین کو بونس بھی دیتے تھے۔

اقبال صاحب بہت اچھے انسان تھے۔ تمام ملازمین کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے اور ہر طرح کا خیال رکھتے تھے، جس کا نتیجہ تھا کہ تمام ملازمین خوب محنت سے ایمانداری اور دیانت داری سے کام کرتے تھے۔

اب اکثر میٹریل کی خریداری کے لیے میں اکیلا ہی جاتا تھا اور پوری توجہ سے ذمہ داری اور مکمل چھان بین سے خام مال خریدتا تھا، جس کی وجہ سے میٹریل کی بھی شکایت نہ آئی تھی تو اسی لیے اقبال صاحب اور اُن کے دونوں بیٹے مجھ پر بہت اعتماد کرتے اور مطمئن ہونے کے ساتھ ساتھ خوش بھی تھے۔

بس اسی مصروفیات اور روٹین میں وقت گزرتا رہا اور پانچ سال کا عرصہ بیت گیا۔ سلطانہ کپڑوں کی سلائی کٹائی، کڑھائی وغیرہ میں بہت ماہر ہوگئی تھی۔ رضوانہ اب یونیورسٹی میں ماسٹرز کررہی تھی جبکہ ریاض اپنی سرگرمیوں میں مشغول رہا میں اپنی بے پناہ مصروفیت میں ریاض کو تقریباً بھول ہی گیا تھا، بس یہی میری زندگی کی سب سے بڑی بھول تھی۔

مکمل آزادی ملنے کی وجہ سے ریاض جہاں نشہ کرتا تھا وہیں اس کا چال چلن بھی خراب ہوگیا تھا۔ اسی دوران سلطانہ کا رشتہ بھی طے ہوگیا اور ہم نے اُس کی شادی کردی۔

اقبال صاحب کی فیکٹری کی تیار شدہ مصنوعات بہت معیاری تھیں، اب انہوں نے ٹی وی پر کمرشل اشتہارات چلائے تو اُن کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ کئی شہروں سے کاروباری پارٹیاں اِن اشیاء کی ڈسٹری بیوشن مانگ رہی تھیں۔ تو اقبال صاحب اور اُن کے بیٹے مناسب چھان بین اور سکیورٹی لے کر ڈسٹری بیوشن دے رہے تھے۔

میں بزنس کے تمام اسرار و رموز سے بخوبی آگاہ ہوچکا تھا تو ایک دن اقبال صاحب نے میری محنت، لگن، ایمانداری، خلوص کو دیکھتے ہوئے اپنے دونوں بیٹوں سے صلاح و مشورے کے بعد مجھے میرے آبائی شہر میں ڈسٹری بیوشن دینے کا فیصلہ کیا کیونکہ منافع کی شرح بہت معقول تھی۔

مجھے اُن کے اس فیصلے سے بہت خوشی ہوئی اور کچھ دنوں کے بعد اپنے آبائی شہر آیا اور مارکیٹ کا سروے کیا تو مجھے گودام کے لیے اور بزنس آفس کے لیے اچھی لوکیشن پر مین روڈ کے فرنٹ پر جگہ مل گئی۔ پراپرٹی کے مالک سے تمام معاملات کرایہ وغیرہ طے کرکے دس سال کے لیے وہ جگہ میں نے کرائے پر لے لی۔ پھر اقبال صاحب نے مجھ پر ایک خاص مہربانی یہ کی کہ مجھ سے کوئی ایڈوانس اور سکیورٹی نہیں لی اور لاکھوں کی مالیت کا سامان بھجوادیا۔ میں نے اپنے شہر آکر سامان کو گودام میں رکھوایا، آفس سیٹ کیا، پھر ایک پوش علاقے میں ایک مکان کرائے پر لیا اور اپنی امی، رضوانہ اور ریاض کو ساتھ لے آیا۔

سلطانہ کا سسرال لاہور میں ہی تھا تو وہ وہیں رہ گئی۔ اب مجھے کاروبار چلانے کے لیے کچھ بندوں کی ضرورت تھی تو میں اُسی غریبوں کی پسماندہ بستی میں گیا جہاں ہم رہتے تھے، تو وہاں کے مکین مجھ سے مل کر بہت خوش

ہوئے۔ امی، رضوانہ اور ریاض بھی ساتھ تھے۔ سب گھروں سے ہمیں بہت پیار، عزت احترام اور چاہت ملی۔ پھر وہیں سے میں نے کچھ بندوں اور لڑکوں کو جو بے روزگاری کے باعث غربت اور افلاس کی چکی میں پس رہے تھے اپنے ساتھ کام پر لگایا، شہر میں کاروبار کی ایڈور ٹائزمنٹ کی اور پھر اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا۔ چونکہ مصنوعات بہت ہی معیاری اور اعلیٰ تھیں، بہت مانگ تھی۔ اُن کی تو دھڑا دھڑ سیل ہونے لگی۔ جتنا مال فروخت ہو جاتا میں اُس کی رقم فوراً لاہور بھجوا دیتا اور ساتھ ساتھ مال آتا رہتا۔ منافع بہت معقول تھا جس کی وجہ سے میرے پاس بھی کافی رقم جمع ہونے لگی۔

دوسری طرف ریاض یہاں آکر بالکل لاپروا ہو گیا اور اُس کی آوارہ گردیاں دن بدن بڑھتی جا رہی تھیں۔ اب وہ ہیروئن بھی پینے لگ گیا تھا۔ اُس کو جتنے پیسوں کی ضرورت ہوتی وہ پوچھے بتائے بغیر آفس ٹیبل کے دراز سے نکال کر لے جاتا۔ میں اپنے نئے کاروبار کو سیٹ کرنے کی دھن میں اتنا مگن تھا کہ ریاض کے معمولات سے بالکل بے خبر ہو گیا۔

☆☆......☆☆......☆☆

کوئی ایک سال بعد میں ایک دن اپنے بزنس آفس میں تھا۔ ریاض صبح سے غائب تھا۔ دوپہر کو مجھے پولیس اسٹیشن سے فون آیا کہ ریاض حوالات میں ہے۔ میں بھاگم بھاگ تھانے پہنچا تو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ریاض نے شراب پی کر غل غپاڑہ کیا تھا اور ایک دو بندوں سے ہاتھا پائی بھی کی اور ایک بندے کو زخمی کر دیا تھا تو اس جرم کی پاداش میں اُسے پولیس نے پکڑا تھا اور اس کے خلاف پرچہ کاٹ دیا تھا۔ وہ رات اُس نے حوالات میں گزاری۔

میں نے گھر آکر امی کو بتایا تو وہ اپنا سر پیٹ کر رہ گئیں۔ پھر اگلے روز بڑی مشکل سے اُس کی ضمانت کروائی اور اسے لے کر گھر آیا۔ امی نے اور میں نے اُسے مل کر بہت سمجھایا کہ اپنی عادتوں سے باز آجاؤ۔

اب اُس کے خلاف کیس عدالت میں چلا گیا تھا۔ 307 کا کیس تھا۔ اُسے جیل کی سزا ہو سکتی تھی۔ تو کافی بھاگ دوڑ کے بعد وہ آدمی جو زخمی ہوا تھا اُسے اور اُس کے ورثاء کو بھاری رقم دے کر صلح نامہ کیا پھر وکیل کر کے بڑی مشکل سے اُسے عدالت میں پیش کر کے صلح اور معافی کی بنا پر کیس سے چھٹکارا دلوایا۔ اب میں ریاض کو اپنے ساتھ لے کر بزنس آفس آجاتا مگر وہ کسی نہ کسی بہانے کچھ دیر کے لیے غائب ہو جاتا۔

پھر اُسے ایک ترک منشیات کے اسپتال میں داخل کروا دیا کہ اُس کی ہیروئن اور شراب کے نشہ سے مکمل جان چھوٹ جائے مگر وہ وہاں سے ایک دن بھاگ گیا اور گھر جا کر امی سے نشے کے لیے پیسے مانگے۔ جب انہوں نے پیسے دینے سے انکار کیا تو اُس نے گھر میں ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ خوب توڑ پھوڑ کی اور امی سے لڑ کر گھر سے چلا گیا۔

میں جب رات کو گھر آیا تو امی نے اور رضوانہ نے مجھے ساری بات بتائی۔ ریاض پوری رات گھر نہیں آیا۔ ہم ساری رات پریشان رہے اور اُسے اِدھر اُدھر تلاش کیا۔ پھر صبح ہمیں پتا چلا کہ ریاض نے خودکشی کر لی ہے اور اُس کی لاش ریلوے اسٹیشن پر پڑی ہے۔

میں فوراً وہاں پہنچا تو دیکھا ریاض کی لاش دو ٹکڑے ہو چکی تھی۔ اُس نے ٹرین کے آگے آکر خودکشی کر لی تھی اور دکھ اور صدمے کی بات یہ تھی کہ ریاض نے عین اس جگہ خودکشی کی تھی جس جگہ سے مجھے نوٹوں کا وہ بیگ ملا تھا۔ یہی وہ پلیٹ فارم اور ریلوے لائن ہے کہ یہاں سے مجھے اندھیرے میں روشنی ملی اور یہیں سے ایک دو ٹکڑے لاش ملی جو کہ میرے سگے بھائی کی تھی، جو میرا ماں جایا تھا۔

پولیس اور دیگر کارروائی کے بعد جب بھائی کی لاش کو لے کر گھر پہنچا تو امی دیکھ کر برداشت نہ کر سکیں اور اُن کو شدید ہارٹ اٹیک ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا اور امی اُسی وقت اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ گھر میں کہرام برپا ہو گیا۔ پھر آہوں سسکیوں میں امی کو اور ریاض کو ابا کی قبر کے ساتھ سپرد خاک کر دیا گیا۔ بیک وقت دو اموات کے صدمے نے مجھے اور رضوانہ سلطانہ کو نڈھال کر دیا۔

کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مرہم ہے اور پھر رفتہ رفتہ زندگی معمول پر آنی شروع ہو گئی۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ زندگی نے کتنا بڑا تاوان ہم سے لیا۔ اسی پلیٹ فارم سے خوشحالی کی زندگی کی نئی کرن ملی اور اسی پلیٹ فارم نے اس زندگی کا تاوان ہم سے وصول کیا۔

☆☆......☆☆......☆☆

تحریر: مرزا

تحریر: گوجرانوالہ

پیارے قارئین! سلسلہ
جس میں سچی کہانیاں ... کے اس معاشرے میں
... واقعات ہمارے پاس پہنچ سکتی ہیں

وہ میرا طبیب خاص

مجید احمد جائی

اُس طبیب کی کہانی جسے قدرت نے مسیحائی بخش دی تھی، ملتان سے

گرمیاں جوبن پر تھیں۔ سورج کے چڑھتے ہی چرند پرند اپنے اپنے ٹھکانوں میں گھس جاتے تھے۔ حتیٰ کہ کوئی بشر نظر نہیں آتا تھا۔ گلیاں سنسان تھیں۔ سڑکیں مسافروں کا راہ تکتی تھیں۔ محلے میں ایسی خاموشی تھی جیسے پورے محلے کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ میں حویلی کے باہر لگے کیکر کے گھنے درخت کے نیچے چارپائی پر پڑا درد سے تڑپ رہا تھا۔ رو رو کر میری ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ کوئی بھی تو نہیں تھا جو میری آواز سن پاتا۔ بھوک سے میں بلبلا رہا تھا۔ پانی کی پیاس سے حلق خشک۔

میری امی جان گھر پر تھیں۔ انہوں نے بھی میری خبر نہیں لی تھی۔ شاید رات بھر جاگنے کی وجہ سے نیند نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ ورنہ ضرور خبر لیتیں۔ میرے تکیے کے ساتھ آدھا کتا مالٹا پڑا میرا منہ چڑھا رہا تھا۔ درد سے میری چیخیں نکل رہی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے میرا دشمن مجھے بجلی کے جھٹکے لگوا رہا ہو۔ آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر گالوں پر اپنے نشان چھوڑ چکے تھے۔ کپڑے پسینے اور آنسوؤں سے تربتر تھے۔ جسم ساکت، زندہ لاش تھا۔ حرکت تھی اور نہ حلق سے آواز نکل رہی تھی۔ عین اسی لمحے موٹر سائیکل پر میرے چاچا اور ان کا دوست (پٹواری) آر کے۔ میرے چاچا کے لئے میرا رونا، چیخنا، چلانا فریاد کرنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ سلسلہ تو پچھلے چار سال سے چل رہا تھا۔ روز کیپسول، گولیاں میرے حلق سے اتاری جاتیں، کڑوے شربتوں کے بڑے بڑے گلاس میرے اندر انڈیلے جاتے تھے۔ مگر مرض تھا کہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ پیر، فقیر کے جادو، ٹونے، منتر بھی آزمائے گئے تھے۔ کبھی تعویذ نکالے جاتے، کبھی گلے میں پہنائے جاتے۔ کوئی دم کر چلا تھا تو کوئی میٹھی روٹی پڑھ کر دے گیا تھا۔

حیرت کی بات ہے ایک مریض اور ہزاروں حکیم، پیر، فقیر اپنے اپنے نسخے آزما رہے تھے۔ مریض روز بروز موت کی طرف سفر کر رہا تھا۔ تقریباً تمام بڑے سرکاری، نیم سرکاری ہسپتالوں کی ہوا کھا چکا تھا۔ نام نہاد پروفیسروں، ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ سفید وردیوں میں من کے کالے یہ ڈاکٹر نوکریوں کے لیے منت سماجت، رشوت دیتے نظر آتے ہیں۔ جب نوکری ان کی چوکھٹ کی زینت بنتی ہے تب ان کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھ جاتی ہے۔

میری طرح ہزاروں مریض ان کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔

یہ مسیحا نہیں انسانوں کے روپ میں حیوان ڈنڈناتے پھرتے ہیں۔ پاگل ہیں وہ جو ان کو مسیحا کا لقب دیتے ہیں۔

وہ پٹواری اس حقیقی مسیحا کا دوست تھا۔ ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا جس کا نام تھا۔ اللہ تعالیٰ اسے ہر خوشی عطا کرے، جو میرے لیے وسیلہ بن کر آیا تھا۔ پٹواری نے میرے چاچا سے پوچھا۔

''یہ کس کا لخت جگر ہے۔ اس کا کوئی نہیں ہے کیا چاچا؟ اس کی یہ حالت۔''

میں جو سوکھ کر لکڑی بن چکا تھا۔ تن پر کپڑا ڈالنے، ہٹانے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ پاس پڑے پانی کے جگ سے دو گھونٹ پانی نہیں لے سکتا تھا۔ بازوؤں تھے کہ کندھوں کے ساتھ مل گئے تھے۔ جبڑے جڑ گئے تھے۔ رگوں میں خون خشک ہونے کو تھا۔ رنگت زردی مائل ہو چکی تھی۔ ٹانگیں کولہوں کے ساتھ لگ رہی تھیں۔ دیکھنے والے یہی کہتے تھے آج مرا کل مرا۔

''دوست یہ میرا بھتیجا ہے۔ چار سال سے بستر مرگ پر موت کا مسافر ہے۔ کوئی دوا سود مند نہیں آتی۔ کوئی دعا اثر نہیں کرتی، کوئی منتر نہیں چلتا۔ لاکھوں گولیاں، ہزاروں کیپسول اب تک حلق سے اُتار چکا ہے۔ درجنوں خون کی بوتلیں اس کی رگوں میں جا چکی ہیں۔ مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ گھر کے جانور بک گئے۔ بوڑھے باپ کا چھابہ ختم ہو گیا۔ اب تو گھر کے برتن بکنے لگے ہیں۔ بیچارہ باپ سانس کی تکلیف میں مبتلا رہتا ہے۔ اس نے اپنی دوائی نہیں لی، تمام بچت، تمام جمع پونجی بیٹے پر لگا دی۔ اب تو ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دے کر گھر بھیج دیا ہے۔ پیروں، فقیروں نے آسیب بتایا ہے۔ سب ہی ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے ہیں۔ لنگر بانٹے گئے، منتیں مانگی گئی، بکرے قربان کیے، صدقے دیے مگر سب بے کار۔

''میرے یار، رب تعالیٰ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں، اسے میرے دوست ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کے پاس لے چلو۔ امید پہ دنیا قائم ہے۔ صبر کی لاٹھی کو مضبوطی سے پکڑے رکھو۔ میرے رب نے چاہا تو ضرور صحت ملے گی۔ میرا دوست حکیم بھی ہے اور روحانی علاج بھی کرتا ہے۔ کئی مریض روتے آئے ہیں اور ہنستے گئے ہیں۔ انسان کے روپ میں فرشتہ ہے فرشتہ۔ خدمت خلق میں ہر وقت محو رہتا ہے۔ اُسے اپنی فکر تو ہے ہی نہیں۔ سوچتا ہے تو دوسروں کے لیے، جیتا ہے تو دردمندوں کے لیے، خدا تعالیٰ کی طرف سے مسیحا ہے۔ جسے لوگ حقیقی مسیحا کہتے ہیں۔ کتنے سہاگ بچائے ہیں۔ کئی ماؤں کی گودیں اجڑنے سے بچائی ہیں۔ کئی بہنوں کے بھائی ٹھیک ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر خادم حسین پر رب تعالیٰ کی خاص رحمت کا نزول ہے۔ اس مہربان کے پاس اسے لے چلو، میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔

نہیں میرے دوست، اب یہ زندگی کی آخری اسٹیج پر ہے۔ اس کا ٹھیک ہونا ناممکن ہے اور نہ ہی ہمارے پاس اب رقم ہے جو اس پہ لگا سکیں۔''

''مختیار! ناامیدی کفر ہے۔ میری مانو! اسے ایک بار صرف ایک بار ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کے پاس لے چلو۔ آپ بے شک دوائی کے پیسے نہ دینا۔ لیکن ایک بار اسے وہاں لے چلو۔ مجھے امید ہے اللہ تعالیٰ ضرور صحت دے گا۔''

پٹواری حساس دل والا تھا۔ قسمت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ جہاں انسان کی سوچ ختم ہوتی ہے اس سے آگے رب رحمان کے جلوے شروع ہو جاتے ہیں۔ رب تعالیٰ اپنے جلوے، اپنے رحمت کا خاص نزول فرماتا ہے۔

☆......☆......☆

چچا مختیار بجھے دل کے ساتھ پٹواری کے ہمراہ مجھے گاڑی میں ڈال کر ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کے کلینک کے طرف روانہ ہوئے۔

موٹر گاڑی مجھے لیے کھیتوں، باغوں، ندی نالوں، درختوں، چھوٹی بڑی گاڑیوں کو پیچھے چھوڑتی منزل کی طرف گامزن تھی۔ میں درد سے کراہ رہا تھا۔ زخموں کو ہوا لگ رہی تھی۔ زندگی کا دھاگا ٹوٹنے کو تھا۔ موت اپنے پر پھیلائے کھڑی تھی۔ میں دو کشتیوں کا مسافر تھا۔ سوچوں کی یلغار تھی اور میں تھا۔ چچا اور پٹواری اپنی باتوں میں محو تھے۔

گھر سے تیس کلومیٹر دور بدھلہ سنت کی جانب چاہ

رجب والا گاؤں ہے۔ جہاں ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کا کلینک تھا۔ آج بھی قائم و دائم ہے۔ اللہ کرے ہمیشہ قائم رہے۔

ہماری گاڑی اپنی مسافت مکمل کر چکی تھی۔ رجب والا آ گیا تھا۔ گاڑی پکی انیٹوں سے بنے مکان سے سامنے رک چکی تھی۔ مکان کے سامنے انگوروں کی بیلیں جو بن پر تھیں۔ گلاب کے پھول ہوا سے لہلہا رہے تھے۔ ساتھ ہی آموں کے درخت آموں سے لدے ہوئے جھوم رہے تھے۔ آموں کے درختوں کے نیچے گائے اور بھینسیں باندھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف کدو کی فصل تیار تھی۔ کلینک کے دوسری طرف چند گھر تھے۔ شاید یہ ڈاکٹر صاحب اور اس کے برادری والے رہتے تھے۔ خوبصورت نظارہ تھا۔ مگر میں کیا کرتا۔ جو موت کے سرہانے بیٹھا ہو وہ ان نظاروں سے کیسے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

گاڑی کے دروازے کھل گئے۔ مجھے چار مردوں نے کندھوں پر اٹھا لیا۔ جیسے مرنے والے کے جنازے کو لیے پھرتے ہوں۔ میری آنکھیں تمام منظر اپنی میموری میں سیو کر رہی تھی۔

کلینک کا دروازہ کھلا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ اندر کا ماحول دوائیوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ خوبصورت چھوٹا سا کلینک تھا۔ جس کے در و دیوار مختلف پوسٹروں سے سجے ہوئے تھے۔ بیماریوں سے آگاہی، ان کا تدارک، بچاؤ کے طریقے لکھے تھے۔ ایک طرف ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کی تمام اسناد آویزاں تھی۔ وہ اسناد چمک رہی تھی جو انہوں نے حاصل کی تھیں۔ یہ ان کی انتھک محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

کلینک کے ایک کونے میں دوائیوں کے لیے الماری بنی ہوئی تھی۔ جس میں دوائیاں سلیقے سے رکھی تھیں۔ لیڈیز کے لیے پردے کا خاص انتظام تھا۔ ایک طرف آنے والے مریضوں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں رکھی تھیں۔ دو لڑکے ہیلپ کرنے پر معمور تھے۔ جن کو ڈاکٹری زبان میں ڈسپنسر کہتے ہیں۔ گھومنے والی کرسی پر سفید لٹھے میں ملبوس ایک خوبرو صحت مند، دل کش نین نقش والا شخص، بال سنوارے براجمان تھا۔

شام کا وقت تھا، کلینک پر مریضوں کا رش تھا۔ حالانکہ کافی اندھیرا ہو گیا تھا۔ نجانے دن بھر کیا سلسلہ رہا

انمول موتی

☆ انسان کا دل توڑنے والا شخص اللہ کو تلاش نہیں کر سکتا۔

☆ حضور اکرمؐ کی بات پر کسی اور بات کو فوقیت دینا ایسے ہے جیسے شرک۔

☆ انسان جتنی محنت خامی چھپانے میں کرتا ہے اتنی محنت سے خامی دور کی جا سکتی ہے۔

☆ بہترین کلام وہ ہے جس میں الفاظ کم اور معنی زیادہ ہوں۔

☆ عروج اُس وقت کو کہتے ہیں، جس کے بعد زوال شروع ہوتا ہے۔

☆ بچہ بیمار ہو تو ماں کو دعا مانگنے کا سلیقہ خود بخود آ جاتا ہے۔

مرسلہ: غلام رسول گل۔ جیکب آباد

ہوگا۔ سامنے ٹیبل پر لیپ ٹاپ اور ڈاکٹری آلات پڑے تھے۔ ایک کونے میں پڑے موبائل کی لائٹ بار بار جل ہو رہی تھی۔ لیکن اس شخص کو فرصت ہی نہیں تھی کہ موبائل کی طرف دیکھ پائے۔

مجھے تو یہ دوسرے حکیموں، ڈاکٹروں جیسا لگا۔ جن سے میں زخم کھا چکا تھا۔ میری نظریں اسے تکے جا رہی تھیں۔

مجھے دیکھتے ہی اس نے سب ہی مریضوں کو باہر ویٹنگ روم میں بھیج دیا اور مجھے ساتھ پڑی ٹیبل پر لٹا دیا۔ حکم صادر کرتے میرے چچا سے مخاطب ہوئے۔

''اس کے کپڑے اتارو''۔ میں مرضرور رہا تھا۔ لیکن سب ہی کے سامنے کپڑے اتارنا شرمندگی کا باعث تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ تب ہی ڈاکٹر صاحب نے صرف قمیض اتارنے کو کہا۔

میرے چچا نے میری قمیض اتار دی۔ اندر سے چینٹیوں کا پہلوان نکل آیا۔ ہڈیاں آسانی سے گنی جا سکتی تھیں۔ پسلیوں کی شرارتیں بخوبی دیکھی جا سکتی تھیں۔ کالی چمڑی ہڈیوں کے ساتھ چمٹ گئی تھی۔

ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا مجھے دیکھتے ہی پریشان سے ہو گئے۔ مایوسی کے بادل ان کے چہرے کا طواف کرنے لگے۔

"اُف! یہ حالت! یہ نوجوان تو موت کی گود میں بیٹھا ہے، ٹھوڑی پہ دائیں ہاتھ کی انگلیاں دبائے قدرے خلا میں گھورنے لگا۔ چند ساعتیں یونہی گزر گئی تھیں۔ پھر یکدم مخاطب ہوئے۔

"اللہ بہتر کرے گا۔ وہ بڑا کارساز ہے۔" ایک دم اس کے تاثرات ناامیدی سے امید میں بدل گئے۔ جیسے رب تعالیٰ کی طرف سے پیغام مل گیا ہو۔ جیسے کوئی الہام ہوا ہو۔ کہنے لگے۔

میں دوائی دے رہا ہوں۔ اسے کھلاؤ۔ اللہ تعالیٰ شفا دے گا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے گولیوں، کیپسول کڑوے شربتوں سے شاپر بھر دیا۔ ساتھ ہی پندرہ پڑیاں بنادی۔ ہر پڑی میں دو ننھی ننھی گولیاں رکھی گئی تھی۔ کہنے لگے ان میں سے ایک پڑی تب لینی ہے جب درد اٹھنے لگے۔ درد نہ ہو تو نہیں کھانی۔"

جو حکم جناب کا، میرے چچا نے جواب دیا۔

پھر ڈسپنسر کو آواز دی کہ پانی کا گلاس لاؤ۔ ڈسپنسر حکم ملتے ہی تعمیل کر آیا۔ اپنے ہاتھوں سے دو ننھی گولیاں پانی کے ساتھ میرے حلق سے بمشکل اتاروائیں۔ کیونکہ جبڑے ایک دوسرے کے ساتھ ایسے جڑے تھے جیسے ایلفی سے جوڑ دیے گئے ہوں۔ میں تو خوراک بھی مشروب کی صورت لیتا تھا۔

قدرت خدا کی دیکھو! دو ننھی گولیاں جسے میں حقیر سمجھ رہا تھا۔ کام کر گئیں۔ میں بھی ٹھیک تھا۔ اتنی بڑی بڑی گولیاں کچھ نہ کر پائی تھیں یہ کیا کرتیں۔ مگر یہ میری سوچ تھی، حقیقت کچھ اور تھی۔ جہاں بڑے بڑے پروفیسر ناکام ہو گئے تھے۔ بڑے بڑے کیپسول گولیاں کام نہ کر سکے، وہاں دو ننھی سے گولیاں بازی لے گئیں۔ اسی لیے تو کہتے ہیں جہاں میں رب تعالیٰ نے کوئی چیز بے کار نہیں بنائی۔

وہ شام میرے لیے باعث مسرت تھی۔ میرے لیے نجات کی رات تھی۔ غموں سے، دکھوں سے، تکلیفوں سے، عذاب مسلسل سے۔ رب تعالیٰ نے میرے امی جان، میرے عزیزوں کی دعائیں قبول کر لی تھیں۔ قبولیت ہو چکی تھی۔ رب تعالیٰ نے انسانی روپ میں مسیحا بھیج دیا تھا۔ حقیقی مسیحا۔

آپ یقین کریں یا نہ کریں ان دو گولیوں کے بعد میں نے آج تک درد کی گولیاں نہیں کھائیں اور نہ کھانے کی ضرورت پیش آئی۔ باقی دوائی کھاتا رہا۔ لیکن وہ چودہ پڑیاں واپس کر دی گئیں۔ آنے والا سورج میرے لیے خوشیاں لیے کھڑا تھا۔ وہ رات، میں نے سکون سے گزاری۔ میں جو چار سال سے مسلسل درد سے تڑپ رہا تھا، چیخ رہا تھا۔

آج میری امی جان نے بھی شکرانے کے نفل ادا کیے تھے۔ بڑی خوش تھی، ڈاکٹر کو دعائیں دے رہی تھیں۔ صبح ہوتے ہی محلے کے بچوں کو اکٹھا کیا اور مٹھائی اور ٹافیاں بانٹیں۔ وہ رات ایسی گزری کہ جیسے کبھی کوئی تکلیف تھی ہی نہیں۔

محلے والے صبح صبح خبر لینے آ گئے۔ پتا تو کریں رات مجید کا شور نہیں سنائی دیا۔ کہیں دم تو نہیں توڑ گیا۔ زندگی کی بازی ہار کر موت کی آغوش میں تو نہیں چلا گیا۔ خاموشی چھائی ہے ورنہ ساری رات رونے، چیخنے کی آوازیں ہی کانوں میں گونجتی رہتی تھیں۔

جو بھی آتا مجھے پُرسکون دیکھ کر رب تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر بجالاتا۔ سبھی کی خوشی دیدنی تھی۔ اُمیدیں جاگ اٹھی تھیں۔ میں موت کے منہ سے نکل کر زندگی کی طرف لوٹنے لگا تھا۔ رب تعالیٰ کی کرم نوازی تھی کہ مجھے نئی زندگی عطا کر دی۔ اس دن کے بعد سے میں کبھی نہیں رویا۔ ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کے کہنے پر میں نے علاج جاری رکھا۔ اخراجات کی سکت نہیں تھی۔ لیکن اس حقیقی مسیحا کی شاباش تھی کہ اس نے کہہ دیا۔

"مجید! میں دوائی کے پیسے تب لوں گا جب تم خود کما کر مجھے دو گے۔ ورنہ ایک روپیہ تک مجھ پر حرام ہے۔" اسے اُمید تھی، یقین تھا کہ میں مکمل ٹھیک ہو جاؤں گا۔

دو سال مسلسل دوائی لیتا رہا۔ مگر ایک روپیہ تک نہیں دیا تھا۔ دو سال بعد میرا جسم بھرا بھرا ہو گیا۔ ہڈیوں پر گوشت چڑھ گیا۔ رگوں میں خون گردش کرنے

لگا۔میرا چہرہ ،میرا جسم دیکھنے کے لائق ہوگیا تھا۔میرے بازو، میری ٹانگیں آہستہ آہستہ سیدھی ہوتی گئیں۔ان میں جان آگئی۔تمام جسم حرکت میں آگیا۔اب مجھے سہارے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔میں اپنی مدد آپ کے تحت چلنے پھرنے لگا تھا۔میرے جبڑے کھل گئے۔روٹی چبانے لگا تھا۔پھر یوں ہوا میں مریض سے تندرست نوجوان بن گیا۔

میری منگیتر صائمہ جسے لوگ کہتے تھے کہ مجید اب نہیں بچے گا۔تم کہیں اور شادی کرلو۔مگر وہ تھی کہ مجھ سے آس لگائے بیٹھی تھی۔مجھے صحت کی طرف لوٹتا دیکھ کر اس کا چہرہ کھلکھلا اٹھا تھا۔اس کے سپنے پورے ہونے چلے تھے۔خوشی سے پھولے نہیں سمارہی تھی۔سہلیوں کو پارٹیاں دے رہی تھی۔قسمت کی دیوی نے اسے بھی بہت رُلایا تھا۔پہلے ماں اسے چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے پاس چلی گئی تھی۔ابھی ماں کی جدائی کے زخم ہرے تھے کہ باپ بھی دیارِ غیر میں جدائی کے آنسو دے گیا۔سعودی عرب حج کرنے گئے تو زندہ پلٹ کر نہ آئے۔جنت البقیع میں مدفن ہو گئے۔باقی بہن بھائی شادی شدہ تھے۔کوئی خبر نہیں لیتا تھا۔تنہائی اس کا مقدر بن گئی تھی۔اسے اُمید تھی تو صرف اور صرف میرے سہارے کی، میرے سپنے دیکھتی تھی۔میری منتظر تھی۔

میں صحت یاب ہوکر کام کرنے لگا۔ہر ماہ تنخواہ جو بھی ملتی اس میں سے ایک حصہ ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کو دے آتا۔اسی طرح میں نے تمام رقم ادا کردی۔

ابو جان کی وفات کے چھ ماہ بعد میری شادی ہوئی۔وہی میری ہم سفر ہمیشہ کے لئے میرے آنگن میں آگئی۔میری شادی میں میرا مسیحا بھی آیا۔اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر میری خوشیوں کو دوبالا کیا۔اس دن اس مسیحا نے اپنی جو داستان سنائی، خوشی کے اس موقع پر بھی آنکھیں اشک بار تھیں۔کہنے لگے جب میں اسٹوڈنٹ تھا اس وقت مجھے مجید احمد جائی کی طرح بیماری نے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔بیماری کے علاج کے لیے مارا، مارا پھرتا رہا مگر کوئی حکیم، ڈاکٹر، پیر فقیر علاج نہ کر سکا۔جس کے پاس گیا، اس نے ہی لوٹا، اس نے ہی میری رگوں سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑنے کی کوشش کی۔کالج لائف کا زمانہ تھا، جوانی تھی اور جوانی تو دیوانی ہوتی ہے۔میں بھی شاعری کرتا تھا، مجھے بھی لکھنے کا شوق تھا۔مگر سب اس بیماری کے نذر ہوگیا۔میں تڑپتا رہا، سسکتا رہا، آنسو بہاتا رہا۔درد ستاتا تھا،

زندگی صبر اور تکلیفیں سہنے کا نام ہے۔میں نے بھی صبر کا دامن تھامے رکھا اور برداشت کرتا رہا۔ایک دن اللہ تعالیٰ سے پیغام ملا۔دل میں خیال آیا۔میں جنگل کی طرف نکل گیا۔وہاں سے ایک سبز رنگ کی بوٹی ملی اور میں نے اسے رگڑ کر پی لیا۔اس جڑی بوٹی کا پینا تھا اور میرا ٹھیک ہونا تھا۔میری بیماری ایسے رفو چکر ہوئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔پھر کیا اس دن سے میں اسی طرف مائل ہو گیا۔پڑھائی بھی جاری رکھی اور ریسرچ بھی کرتا رہا۔میں نے بہت محنت کی ظلم سہے، درد برداشت کیے، میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔میں نے تہیہ کرلیا، اپنی جگہ جہاں بھی ہوں انصاف کروں گا۔

میں نے پڑھائی مکمل کر لی اور کلینک بنا لیا۔الحمدللہ! آج تک کوئی مایوس نہیں لوٹا۔لوگ آنسو بہاتے آتے ہیں اور خوش ہوکر جاتے ہیں۔میں غریبوں کا دوست اور امیروں کا مخالف ہوں۔کسی کی حق تلفی نہیں کرتا اور نہ ہی کرنے دیتا ہوں۔یہی میری زندگی ہے، یہی میرا مقصد ہے۔میں نے شادی کرلی اور بہترین زندگی گزار رہا ہوں۔میں روحانی علاج بھی کرتا ہوں اور جسمانی علاج بھی۔جو بھی مریض آتا ہے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے شفایاب ہو جاتا ہے۔میں اللہ تعالیٰ کی رضا پر خوش ہوں۔جتنا اس ذات نے نواز دیا ہے اتنی میری اوقات نہیں ہے۔آج میں بہت خوش ہوں اور خوشگوار زندگی گزار رہا ہوں۔

ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا صاحب ایک گھنٹہ ہمارے درمیان رہے اور پھر جدا ہو گئے۔مگر ان کی باتیں آج بھی گوشہ سماعت سے بازگزشت کرتی رہتی ہیں۔میں اس عظیم ہستی کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔میرا مسیحا خدمت خلق کر رہا ہے۔آج بھی اسی طرح اپنے جذبے ،اپنی کام میں ڈٹا ہوا ہے۔

☆☆......☆☆☆

دوسری مرد کہانی

اُس مردِ مومن کا قصہ جس نے عبادت کی اصل روح کو پالیا تھا

غلام مصطفیٰ نام شاید ماں باپ نے سوچ سمجھ کر رکھا تھا۔ کہتے ہیں پُوت کے پاؤں پالنے سے ہی نظر آجاتے ہیں ماں باپ دین دار اور مذہبی تھے تو اولاد کو بھی نیک سیرت دیکھنے کی تمنا تھی جب ہی تو اولاد کی پیدائش سے پہلے ہی ناموں کا انتخاب کرلیا تھا۔ لڑکا ہوا تو غلام مصطفیٰ اور لڑکی ہوئی تو عائشہ۔ امید لڑکے ہی کی تھی کیوں کہ کئی پیڑھیوں سے خاندان میں لڑکے ہی ہوئے تھے اور مجتبیٰ صاحب کے یہاں بھی لڑکا ہی ہوا۔ اپنی اکلوتی اولاد کو غربت میں مڈل تک تعلیم دلوا سکے اور کسمپرسی کی زندگی گزارتے ایک دن بیٹے اور بیوی کو اکیلا چھوڑ گئے۔ بیوی بھی وعدوں کی ایسی پکی نکلیں کہ چھ ماہ میں ہی شوہر کے پاس چلی گئیں۔ ابھی غلام مصطفیٰ صرف چودہ برس کے تھے۔

باپ کی پنج وقتہ نماز اور گھر کے مذہبی ماحول نے غلام مصطفیٰ کو بھی اللہ کی محبت سے سرشار کردیا تھا۔ کم عمری سے یہی نماز کی عادت پڑ گئی اور دل میں اللہ اور اس کے حبیب ﷺ کے گھر کو دیکھنے کی خواہش زور پکڑتی گئی۔ ماں باپ کا ساتھ چھوٹ جانے پر اکیلے پن کے شکار غلام مصطفیٰ نے اپنا سلجھی عبادت کو بنالیا۔ خدا کا قرب ایسا حاصل ہوا کہ دنیاوی جھنجھٹوں سے جان ہی چھوٹ گئی۔ محنت مزدوری کرکے رزق حلال کمانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہو گئے۔ باپ ایک کمرے اور صحن پر مشتمل مکان چھوڑ گئے تھے تو سر چھپانے کا کوئی مسئلہ درپیش نہ ہوا۔

غلام مصطفیٰ کے شریف ہونے کی گواہی ہر شخص آنکھ بند کرکے دیتا تھا ان کی خوش مزاجی اور اخلاق کی بدولت لوگ غلام مصطفیٰ کی بہت عزت کرتے تھے۔ محلے میں سب ہی غریب تھے۔ تو ایسے میں ایک صاحب نے اپنی بیٹی کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اب بھلا مشورہ مانگتے بھی تو کس سے؟ لے دے کے ایک بچپن کا دوست تھا شاہ نواز، جو کہ ان سے بھی زیادہ غربت کا شکار تھا۔ سو مشورہ بھی شاہ نواز سے مانگا۔

پھر ایک دن آمنہ بیگم ان کی زندگی میں جیون ساتھی کی شکل میں داخل ہوگئیں۔ آمنہ بیگم کے آنے کے بعد انہوں نے محنت مزدوری میں زیادہ جان مارنا شروع کردی۔

سال بھر کئی پیڑھیوں کی روایت بھی ٹوٹ گئی اللہ نے بیٹی کی شکل میں رحمت سے نواز دیا۔

غلام مصطفیٰ روز بروز اللہ کے نزدیک ہوتے جارہے تھے۔ ان کے دل میں اللہ کا گھر دیکھنے کی خواہش مضبوط سے مضبوط تر ہوگئی تھی۔ دن رات اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے جائے نماز پر بیٹھتے تو دیر تک آنسو بہاتے رہتے۔ دعا ہمیشہ ایک ہی ہوتی۔ ''اللہ اپنے گھر کی حاضری نصیب

کرادے اور غلاف کعبہ کو بوسے دے لوں۔"

☆......☆......☆

دن تیزی سے گزرتے رہے، مگر کوئی صورت نہیں بن پائی اور بنتی بھی تو کیسے؟ کارخانے کی ملازمت میں جو آتا تھا، وہ گھر کی کفالت میں پورا ہو جاتا تھا۔ بچی اسکول جانے لگی تھی تو خرچے مزید بڑھ گئے تھے۔ ایسے میں اوور ٹائم لگا کر کام چلانے لگے۔ لاکھ کوششوں کے باوجود بھی کچھ بچا نہ پائے۔

سیٹھ واجد علی بہت مالدار آدمی تھے۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ باپ کے شروع کیے ہوئے چھوٹے سے کارخانے کو بہت جلد فیکٹری میں تبدیل کر لیا تھا۔ دنیا کی ہر آسائش میسر تھی لیکن خدا کو بھول بیٹھے تھے۔ مذہب سے تو کوئی واسطہ بھی رہا ہی نہیں ان کا۔ اپنی تجوریوں کو دولت سے بھرنے کے سوا کوئی کام یاد ہی نہیں تھا۔ کسی عام آدمی کا خیال تو دور کی بات، وہ اپنے کسی ورکر کی مدد بھی کبھی نہ کرتے۔ فیکٹری میں کئی دفعہ حادثات میں کچھ ورکر عمر بھر کی معذوری کا شکار بھی ہوئے، مگر ان کو سیٹھ واجد علی کی طرف سے کسی طرح کی مالی سپورٹ نہ مل سکی۔ تمام ملازمین اس بات پر اتفاق کرتے تھے کہ سیٹھ واجد علی ایک خود غرض اور خدا سے دور رہنے والا انسان ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتا کہ کروڑوں کی جائیداد کا کوئی وارث بھی نہیں ہے۔ اللہ نے اولاد کی نعمت سے محروم رکھا ہے۔ تو کیا اتنی دولت قبر میں لے کر جائے گا۔

غلام مصطفیٰ اکثر بیوی سے کہا کرتے کہ آمنہ اتنی دولت ہونے کے باوجود سیٹھ واجد علی خدا کا گھر نہ دیکھ سکے! مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی دولت کے باوجود ان کے دل میں راہ خدا میں سفر کا خیال کیوں نہیں آتا اگر دولت خدا سے دور کر دیتی ہے تو ہم غریب ہی اچھے ہیں، کہ ہمیں خدا تو یاد رہتا ہے۔"

ادھر بچپن کے دوست شاہ نواز کی بھی ان کی ماں نے مرنے سے پہلے ایک غریب لڑکی سے شادی کر دی تھی۔ اللہ نے اوپر تلے دو چاند سی بیٹیاں عطا کر دیں۔ اپنی مفلسی میں بھی خدا کا شکر کبھی نہیں بھولتے تھے۔ کم آمدنی ہونے کے باوجود زندگی کو ہنسی خوشی گزار رہے تھے۔ پریشانی تھی تو صرف بیٹیوں کے جوان ہونے کی کہ آخر بچیوں کی شادیاں کیسے کریں گے؟ کیوں کہ زمانہ تبدیلی کی طرف گامزن تھا۔ لوگوں کی ترجیحات بدل رہی تھیں۔ لوگوں کو شرافت

سے زیادہ دولت کی تلاش تھی۔ لڑکیوں کی خوب سیرتی کم اور جہیز دینے والوں کی تلاش زیادہ کی جاتی تھی۔ ایسے میں غلام مصطفیٰ کا ساتھ بہت سے غموں اور پریشانیوں کا مداوا کر دیتا تھا۔

غلام مصطفیٰ اپنے دوست کو سمجھایا کرتے کہ ہر کوئی اپنا نصیب ساتھ لے کر آتا ہے۔ اللہ نے بیٹیاں دی ہیں۔ تو ان کے مقدر بھی لکھے ہوں گے۔ ان کے لیے بھی ان کے ہم جوڑ اتارے ہوں گے۔ تم پریشان مت ہوا کرو۔ اللہ ہے نا ہمارے سروں پر۔ وہ کب کیسے راستہ نکال دیتا ہے، یہ ہم جیسے گناہ گاروں کو پتا بھی نہیں چلتا۔ بس ہم ہی ہیں جو اپنے پاک پروردگار کو بھولے رہتے ہیں۔"

☆......☆......☆

سولہ سال کا عرصہ یوں گزر گیا جیسے سولہ راتیں۔ ان سولہ برسوں میں کچھ بھی تو نہ بدلا۔ وہی غلام مصطفیٰ اور شاہ نواز کے گھر کی مفلسی۔ وہی پریشانیوں کا راج اور وہی بیٹیوں کی شادی کی فکر۔ صرف تبدیل ہوا تو دونوں کی کمر کا سیدھا پن اور بچیوں کا بچپن جوانی میں۔ بیویاں دونوں دوستوں کا ساتھ چھوڑ کر راہ عدم سدھار گئی تھیں لیکن یہ خون کا اثر تھا یا تربیت کا خاصا کہ دونوں بیٹیاں انتہائی مذہبی، نیک سیرت اور سگھڑ تھیں۔

کنول ہمیشہ کیچڑ میں ہی کھلتا ہے۔ یہ بات ان دونوں کی بچیوں پر صادق آتی تھی۔ خوبصورتی ایسی لاکھوں میں نظر آتیں۔ بغیر کسی بناؤ سنگھار کے ان کا حسن سر چڑھ کر بولتا تھا۔

اللہ بہت کریم ہے۔ غلام مصطفیٰ پر ایسے کرم کیا کہ ان کے سالے نے اپنے بیٹے کے لیے ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگ لیا وہ اپنی حج کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اتنے پیسے جوڑ چکے تھے کہ سال دو سال مزید کچھ جمع کر کے حج کر لیں لیکن بیٹی کا رشتہ آنے پر یہ ارادہ کر لیا کہ جمع کیا ہوا پیسہ بیٹی کی شادی پر خرچ کر لیں گے۔ لیکن سالے نے شرط رکھی کہ غلام مصطفیٰ میں چاہتا ہوں کہ اپنی بہو کو ایسے بیاہ کر لے جاؤں کہ دنیا کے لیے مثال قائم ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی بیٹی کو ایسے رخصت کرو جیسے ہمارے پیارے آقا ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت بی بی فاطمہؓ کو رخصت کیا تھا۔ مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے تمہاری مدد کے سوا۔ کیا تم اس نیک کام کو کرنے میں میری مدد کرو گے؟ جہیز کی لعنت کو ختم کرنے کے لیے ہمیں باتیں نہیں عمل کرنا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگوں کی طرح جہیز کو لعنت قرار دے کر تقریریں کرتا پھروں اور جب تم ریت کے مطابق ٹرک بھر کے جہیز دو تو میں ہنسی خوشی لے کر یہ کہتا پھروں کہ غلام مصطفیٰ نے اپنی بیٹی کو دیا ہے۔ میں عملی قدم اٹھانا چاہتا ہوں۔ آخر کسی کو تو پہل کرنا ہوگی۔"

غلام مصطفیٰ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے کہ خدا کا شکر ہے آج جیسے ہوس میں لپٹے معاشرے میں ایسے پُرخلوص لوگ بھی موجود ہیں۔

☆......☆......☆

بیٹی نہایت سادگی سے اپنے سسرال رخصت ہوگئی۔ داماد نے ولیمے کی سنت اپنی استطاعت کے مطابق بہت اچھے طریقے سے ادا کر دی۔ اب غلام مصطفیٰ کی ایک ہی مراد باقی تھی اور تھی خانہ کعبہ کی حاضری۔

دن رات خدا سے اپنے گھر کی حاضری کے لیے التجائیں کرتے رہتے۔ لوگوں سے ملتے تو صرف ایک ہی بات ہوتی کہ دعا کیجیے گا اللہ اور اس کے گھر کا دیدار نصیب ہو جائے۔

سال بھر کا عرصہ گزرا ہوگا کہ غلام مصطفیٰ کے سالے نے اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے شاہ نواز کی بڑی بیٹی کا رشتہ مانگ لیا۔ وہی پرانی شرط کے مطابق سادگی سے شادی انجام پائی اور شاہ نواز خوشی سے نہال ہو گئے۔

اللہ نے ایک بیٹی کے فرض سے کتنی آسانی سے سبکدوش کر دیا تھا۔ ایسا تو انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

کاش کہ سب بیٹے والے ایسے ہی سوچنے لگیں۔

کاش کہ جہیز کے نام پر اولادوں کا سودا بند ہو جائے۔

کاش کہ لڑکیوں کے والدین کو جہیز کے لیے موت سے پہلے مرنا نہ پڑے۔

شاہ نواز دل میں سوچ کیا رہے تھے، یہ تو دعائیں تھیں، جو وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے دل سے زبان پر لے آئے تھے۔ دعا تو ہوتی ہی پیاری ہے۔ اور یہ تو ساری دعائیں ہی پیاری تھیں۔

☆......☆......☆

اگلے سال غلام مصطفیٰ نے گورنمنٹ اسکیم کے تحت حج کی درخواست جمع کروا دی کہ اب اتنے پیسے جمع ہو چکے تھے کہ بچپن کی خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکے۔ وہ خوشی سے سرشار تھے کہ وہ دن قریب نظر آ رہا ہے جس کے لیے شاید وہ ابھی تک زندہ تھے۔ درخواست جمع کروا کے جب

گھر واپس لوٹ رہے تھے تو راستے میں کسی دکان سے تیز آواز میں حمد کی آواز آ رہی تھی۔

کعبے کی رونق کعبے کا منظر
اللہ اکبر اللہ اکبر
یاد آ گئیں جب اپنی خطائیں
اشکوں میں ڈھلنے لگی التجائیں
رویا غلاف کعبہ پکڑ کر
اللہ اکبر اللہ اکبر

دل مستی میں جھومنے لگا۔ لگا جیسے وہ واقعی سفر پر چل پڑے ہوں۔ دل خوشی میں پاگل ہوا جا رہا تھا لگ رہا تھا کہ کعبہ آنکھوں کے سامنے آ گیا اور وہ غلاف کعبہ کو بوسے دے رہے ہوں۔ اسی سرشاری میں گھر جانے کے بجائے شاہ نواز کو خوش خبری دینے چلے گئے کہ وہ دن قریب نظر آ رہا ہے۔ جس کی تمنا بچپن سے دل میں پالی ہوئی تھی۔

شاہ نواز نے بتایا کہ آج کمپنی میں پتا چلا ہے کہ سیٹھ واجد علی بھی بیگم کے ساتھ حج پر جا رہے ہیں۔ اللہ ان کو بھی بالآخر یاد آ گیا ہے۔ اللہ پاک ان کا بھی سفر آسان کرے اور ان کے حج کو بھی مقبول کرے۔

دوسری بات شاہ نواز نے یہ بتائی کہ ان کی دوسری بیٹی کا بھی رشتہ آیا ہے۔ لڑکا بہت شریف ہے مگر ان کی ماں تھوڑی سی لالچی عورت ہے۔ وہ کسی جاننے والے کے توسط سے ہمارے گھر میں آ تو گئی لیکن ہماری غربت دیکھ کر سمجھ گئی کہ ہم اس کو جہیز اس کی توقع کے مطابق نہ دے سکیں گے۔ اب کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں؟ اچھے لڑکے آج کے دور میں ملنا ناممکن ہو گئے ہیں۔ اس لیے نہیں چاہتا لالچی ساس کی وجہ سے اچھے داماد کو گنوا دوں۔ بہت کوشش کے باوجود بیٹی کے لیے کچھ جوڑ نہیں سکا۔ ایسے میں ایک ہی صورت نظر آتی۔ سیٹھ واجد علی سے قرض کی درخواست ہے کروں۔ کیا خبر وہ ہمارے اس برے وقت میں مدد کر دیں۔"

☆......☆......☆

اگلے روز شاہ نواز نے سیٹھ واجد علی سے ان کے آفس میں مل کر تمام صورتحال بیان کر کے قرض کی گزارش کر دی۔ سیٹھ واجد علی نے جو جواب ان کو دیا شاید اس کی امید شاہ نواز کو ہرگز نہیں تھی۔

"بھائی دو لاکھ رقم بہت بڑی ہوتی ہے۔" میں ویسے بھی حج پر جا رہا ہوں۔ جس پر میرے بہت پیسے خرچ ہو گئے ہیں آخر پرائیویٹ سسٹم کے تحت VIP سہولیات سستے میں تھوڑی ملتی ہیں اور کمپنی بھی آج کل خسارے میں جا رہی ہے۔ اگر میں تمہاری مدد کر بھی دوں تو تم میرے پیسے واپس کیسے لوٹاؤ گے؟ تمہاری زندگی کا پتا ہی کیا ہے؟ تمہارے آگے پیچھے ہے ہی کون جو میرے پیسے لوٹائے گا؟ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" شاہ نواز بیچارے دکھی ہو کر آفس سے باہر نکل آئے۔

سیٹھ واجد علی کا حج بھی دراصل بزنس کو پھیلانے کا وزٹ تھا۔ وہ نئی کمپنی سعودیہ میں بھی لگانا چاہتے تھے تو سوچا کہ چلو حج بھی ساتھ کر لیں گے اور یہی خیال دل میں لیے وہ حج پر جانے والی پہلی پرواز سے سعودیہ روانہ ہو گئے۔ اُدھر غلام مصطفیٰ کا نام بھی حج کرنے والوں کی فہرست میں آ گیا تھا۔ بس کچھ دنوں میں پیسے جمع کروانے تھے سوچا جو کام کچھ دنوں بعد کرنا ہے وہ آج ہی کر ڈالیں۔

اگلے دن فیکٹری ارادہ کر کے نکلے کہ آج آدھے دن کی چھٹی لے کر بنک چلا جاؤں گا اور حج کے واجبات جمع کروا دوں گا۔ کمپنی پہنچ کر خبر ملی کہ سیٹھ واجد علی اور ان کی بیگم کا ایئرپورٹ سے ہوٹل جاتے ہوئے شدید ایکسیڈنٹ ہو گیا اور دونوں میاں بیوی کو شدید چوٹیں آئی ہیں۔ ایڈمن کے لوگوں سے تفصیل معلوم کرنے پر پتا چلا کہ سیٹھ واجد علی کی دونوں ٹانگیں شدید فریکچر کا شکار ہوئی ہیں اور ان کی بیگم کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی ہے۔ کمپنی میں ہی شاہ نواز نے اپنے اور سیٹھ واجد علی کے درمیان ہوئی گفتگو غلام مصطفیٰ کو بیان کی تو وہ بے چارے افسوس کے سوا کچھ نہ کر سکے۔

☆......☆......☆

کچھ دن بعد شاہ نواز کی بیٹی کی شادی کا دن بھی آ گیا۔ جہیز میں وہ تمام چیزیں موجود تھیں جو ساس محترمہ کو درکار تھیں۔ غلام مصطفیٰ اس بار بھی حج پر نہ جا سکے شادی کی تقریب میں ایک کونے پر کھڑے کمپنی کے کسی ساتھی کے ساتھ نہایت خوش و مطمئن نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ بھائی اللہ تو میرے دل میں رہتا ہے۔ نظر نیچی کر کے دیکھ لیتا ہوں اور میرا حج تو ہو بھی گیا۔ کیا کسی مجبور اور مفلس کی شادی کروا دینا کسی حج سے کم عبادت ہے کیا!؟"

☆☆......☆☆......☆☆

تیسری مرد کہانی

عالیہ حرا

مہنگائی کے عفریت کا شکار ہونے والے مرد کا قصہ جو جیون ہار گیا تھا

شب کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ چاند، بادلوں کی اوٹ میں جا کر اداس اور خاموش چھپ گیا تھا۔ درختوں پر پرندے بھی گہری نیند میں تھے۔ فضا میں غیر معمولی خاموشی تھی۔ گھروں کے دروازے بند تھے۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ عبدل سنگی بینچ سے دھیرے سے اٹھا اور گھر کی راہ لی۔ اس کا چہرہ اداس، پیروں میں برسوں کی تھکن، سوچوں میں تلخیاں اور پیشانی پر تفکر کی لکیریں تھیں۔

مختلف راستوں سے ہوتا ہوا وہ گھر کی دہلیز پر رکا۔ اندر خاموشی کا راج تھا۔ سب سو چکے تھے۔ دھیرے سے اُس نے دروازے پر ہاتھ رکھا، لکڑی کا دروازہ بے آواز کھل گیا۔

عبدل کے چہرے پر اچانک حزن سا پھیل گیا گویا اب رات کے اس پہر بھی دروازہ بند کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اندر آ کر اُس نے دروازہ مقفل کر دیا۔

اُس گھر میں ہی کیا ہے جو دروازے بند کیے جائیں؟ اُس کی سوچوں میں زہر سا گھلنے لگا۔ دو قدم چل کر وہ اپنے کمرے میں آیا تو فرشی دری پر اس کے بیوی بچے آڑے ترچھے لیٹے سو رہے تھے۔

اس کا اندر جانے کو دل ہی نہیں چاہا۔ جانے بچوں نے کچھ کھایا یا نہیں، کھایا تو کہاں سے کھایا؟ اگر نہیں کھایا تو تف ہے تم پر عبدل......!

وہ پلٹ گیا اور چھوٹے سے صحن میں پڑے جھلنگا پلنگ پر لیٹ گیا۔ تاروں پر آسمان اس کے سامنے تھا۔

عبدل کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اس کے اندر اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ بیوی کے کسی بھی سوال کا جواب دے سکتا۔ بچوں کی آنکھوں کی بھوک اور لبوں کی پیاس اسے بے موت مار رہی تھی۔

رفیعہ میں حوصلہ بھی تھا، ہمت بھی تھی۔ اس نے آج ضرور کچھ کر لیا ہوگا مگر کل......؟

کل کیا ہوگا؟ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے ہر روز کچھ نہ کچھ چاہیے۔ بلکہ روز کیا دن میں تین دفعہ چاہیے اور بچوں کو تو تین وقت کے سوا بھی کچھ چاہیے۔

آج تین دن ہو گئے تھے روزگار کی تلاش میں اسے دَر دَر بھٹکتے۔ روزی تو گویا اس کے آگے بھاگ رہی تھی۔ اس کی روز کی آمدنی کا ذریعہ وہ ٹھیلا تھا۔ جس پر وہ سبزی لگاتا تھا اور روز گلی گلی جا کر بیچتا تھا۔

وہ ٹھیلا جو ملکی ہنگاموں کی وجہ سے خاکستر ہو گیا تھا۔ ابا کی کمزوری کے بعد ابا کا ٹھیلا اسے ورثے کی شکل میں مل گیا تھا جس سے وہ روزگار چلا رہا تھا۔

پچھلے دنوں ہونے والے ہنگاموں میں، جہاں ملکی املاک کو نقصان پہنچا، وہاں جلاؤ گھیراؤ تحریک میں اس کا ٹھیلا بھی جل گیا۔ ٹھیلا کیا جلا اس کے خواب، اُمنگیں، خواہشیں سب کچھ جل گیا۔ بچوں کا پیٹ بھرنے کا وہ واحد وسیلہ تھا۔ ابا کی دوا اور اماں کی بیماری کے خرچے اسی سے پورے ہو رہے تھے۔ اب وہ ذریعہ بھی نہیں رہا تھا۔

انتخابات کے بعد حالات خراب تھے۔ مہنگائی کا بحران تھا کہ جس نے کمر توڑ دی تھی۔

کھانا ضروری ہے۔ مگر لایا کہاں سے جائے؟ بچوں کو یہ بات معلوم نہیں، وہ صرف کھانے کو مانگتے ہیں۔ بس نت نئی چیزیں...... رفیعہ کا صبر و حوصلہ عبدل کو کمزور کر رہا تھا۔ آج گھر سے اس عہد کہ ساتھ نکلا کے کوئی مزدوری مل جائے۔ سامان ڈھو کر کچھ پیسے مل جائیں تو بچوں کے کھانے کا انتظام ہو جائے گا۔ خود اس کی بھوک تو جیسے مر ہی گئی تھی۔ اور مزدوری کرنے کے لیے طاقت درکار تھی۔ اس کی طاقت گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ کم ہو رہی تھی۔

"واہ ری قدرت...... تیرا انصاف ...... تیرا قانون...... وہ بے چینی سے بالوں میں ہاتھ پھیرتا بڑبڑایا۔

"کچھ بندوبست ہوا......؟" اِس آواز پر وہ اچھل ہی تو پڑا۔ سر اٹھایا تو دیکھا رفیعہ بڑی امید کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

"نہیں۔" عبدل نے بازو آنکھوں پر رکھ جواب

دے دیا۔

"پھر...... پھر کیا ہوگا عبدل! بچے روٹی کے انتظار میں بھوکے سوگئے ہیں۔"

"میں کیا کروں رفیعہ مجھے کام ہی نہیں مل رہا۔" اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"یہ غریبوں کی بستی ہے عبدل! میں بھی یہاں کام نہیں کر سکتی ورنہ کسی کے گھر میں جھاڑو پوچا، کپڑے دھونے کا کام تو کر ہی لیتی۔"

عبدل اس کی شکل دیکھنے لگا۔ اس کے مسائل میں، مایوسی کے ساتھ ساتھ اس کی ہمدم، اس کی رفیقہ حیات تھی۔

"ایسے کس طرح گزارہ ہوگا عبدل...... صبح وشام بچوں کو بھوک مٹا دے گی۔ اماں کی دوائی...... ابا کی تکلیف......؟؟"

"تو میں کیا کروں......؟" وہ چیخ ہی تو پڑا تھا...... گھر کے اندھیرے اور سناٹے میں اس کی آواز ابھری۔ رفیعہ ڈر کر پیچھے ہٹی۔

"رفیعہ عبدل آ گیا کیا......؟"

"ہاں اماں......!" اس نے آہستگی سے کہا کہ کہیں بچوں کی آنکھ نہ کھل جائے۔

"دروازہ بند کر لینا۔ حالات بہت خراب ہیں۔"

اماں کا تفکر جاگ رہا تھا۔ عبدل نے جھنگا پلنگ کی پٹی پر بازو ٹکا کر رفیعہ سے آنکھیں چرالیں۔ حالات کتنے خراب تھے کوئی اس کے دل سے پوچھتا......

اس کی زندگی، اس کا گھر خراب ہو رہا تھا۔

"حوصلہ کر عبدل کیا ہوگیا ہے تجھے......؟" رفیعہ اس کے قریب آ بیٹھی۔ رفیعہ اس کی آواز سرد تھی۔

"میں ناکارہ ہوگیا ہوں رفیعہ۔ میرا حوصلہ ٹوٹ گیا ہے۔ میرا ضبط جواب دے گیا ہے۔ میرے گھر میں بھوک ناچ رہی ہے اور میں بے بسی سے دیکھ رہا ہوں۔ میں پاگل ہوجاؤں گا۔"

وہ بے بسی سے رو دیا۔ آنکھ کے آنسو اور لہجے میں اداسی چھپا کر رفیعہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"یہ آزمائش قدرت کی طرف سے ہے۔ ہمیں حوصلہ کرنا ہے اور خیر سے اچھے دنوں کا انتظار کرنا ہے۔"

رفیعہ نے شکستگی سے اسے دیکھا۔ وہ نڈھال ہو کر ڈھے گیا۔

رفیعہ سب کچھ سمجھتی تھی۔ اس کا ہاتھ تھام کر سہلاتی تھی رہی۔

"بچوں کو سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ خدا ہماری نہیں تو بچوں کی سن لے۔" مگر شاید خدا بھی اپنے بندوں سے مایوس ہو گیا ہے۔ اندر سے بلو کے رونے کی آواز آئی۔ رفیعہ سرعت سے اٹھی اور پانی کا گلاس بھر کر اندر لے گئی اور عبدل جھلنگا پلنگ پر گر کر گھٹ گھٹ کر رو دیا۔ کس قدر منحوس مقام تھا۔ وہ اپنے چار بچوں اور بیوی، ماں باپ کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہو رہا تھا۔ دو دن سے اُس کے گھر میں چولہا نہیں جلا تھا۔ سالن پڑوس سے مانگ لیا تھا۔ مگر سفید پوش گھرانہ کب تک دے سکتا تھا......؟

رات ڈھلتی رہی، دل کٹتا رہا، روح مچلتی رہی۔ صبح منہ اندھیرے عبدل، پرندوں کی آواز کے ساتھ ہی باہر نکل گیا۔ صبح اٹھنے والوں کو خدا رزق دیتا ہے۔ اور ضرور دیتا ہے۔ مگر ملک کے حکمرانوں نے، صاحب حیثیت لوگوں نے، رزق کی تقسیم، شاید اپنے ہاتھ میں لے لی ہے تو غریب کیسے رزق حاصل کرے اور بھوک مٹائے......؟؟

یہ حسن اتفاق تھا۔ یا اس کی خوش قسمتی کہ اسے صبح صبح مزدوری مل گئی۔ 200 روپے میں 2 بجے تک ایک جگہ سے دوسری جگہ سامان پہنچا کر وہ دوپہر کو فارغ ہوا اس کے عوض اس کو 200 روپے ملے تھے۔ 200 سو روپے...... وہ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر گم صُم ہوا تھا۔

اس سے کیا لے۔ آٹا، گھی، چاول، سبزی، اماں کی دوا یا ابا کا سکون...... اس کی آنکھ بھر آئی......

کیا لے؟ کیا نہ لے؟ وہ دو سو روپے ہاتھوں میں پکڑے سوچتا گیا۔

تب ہی ایک فقیر بھاگتا ہوا آیا۔ اس کے اس کے ہاتھ سے نظر آتا ایک سرخ نوٹ اُچک کر بھاگ گیا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگا مگر فقیر برق رفتاری سے بھاگتا چلا گیا۔

صرف ایک سرخ نوٹ اس کی مٹھی میں دبا رہ گیا۔

آہستہ قدموں سے وہ قریبی دکان کی جانب بڑھا، جہاں لوگوں کا رش تھا۔ اور وہ ایک دوسرے سے باتیں

کر رہے تھے۔

''غضب خدا کا ایسی مہنگائی، مہنگائی نے تو حد ہی کر دی مہنگائی کا پہاڑ تو ہمالیہ سے بھی اونچا ہو گیا۔''

''اور کیا بھائی رات کو سوتو صبح ہر چیز کے نرخ میں اضافہ ہوگا۔ غریب آدمی کیا کرے۔''

''اور کیا غریب آدمی کے بھی بچے ہیں۔ ضرورتیں ہیں اور جو روزانہ کی اجرت پر کام کرتے ہیں، وہ کیا کریں......؟''

''غریب کو مر جانا چاہیے۔'' ایک منچلا بولا۔

''ہاں ہمیشہ غریب ہی مرے۔ امیر عیش کریں۔''

دوسرے نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

لوگوں کے آپس کی گفتگو اس کا بلڈ پریشر بڑھا رہی تھی۔ یہ دیکھو، یہ پانچ کا سامان ہے۔ ایک آدمی نے چھوٹا سا شاپر آگے کیا بھائی۔ ایک آدمی نے اس شخص کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ تمہارے پاس پانچ سو تھے تم نے سودا لے لیا۔ جن کے پاس ہزار ہیں انہوں نے حسب منشا اشیائے ضروریات خرید لیں، جس کے پاس سو روپے ہوں گے وہ کیا کرے گا......؟''

عبدل نے مٹھی زور سے بھینچ لی اور واپس پلٹ گیا۔

ایک منچلے نوجوان نے کہا تھا کہ غریبوں کو جینے کا حق نہیں۔ ایک شیشی زہر کی خریدیں اور سکون کی نیند سو جائیں۔ نہ مہنگائی کا کوئی حل ہے نہ حکمرانوں نے جاگنا ہے۔'' پیچھے گفتگو جاری تھی اس کا فشار خون بڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے ایک دکان سے زہر آب خریدا اور گھر جانے والے راستے پر چل پڑا۔ مایوسی اس کی رگوں میں سرایت کر گئی تھی۔ پچھلے دو دنوں سے اس نے سوائے پانی کے کچھ نہیں لیا تھا۔

کمزوری اس کے اندر سرایت کر گئی تھی۔ پھولے ہوئے سانس، سرخ آنکھوں اور کمزور وجود کے ساتھ گھر کی چوکھٹ پر ٹھہرا......اور اندر داخل ہو گیا۔

''ابا آگیا۔ ابا آگیا۔'' بچے اس کی جانب دوڑے۔......ابا روٹی لایا......ابا بھوک لگی ہے۔''

رفیعہ امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ تو امید دو بے یقینی اور بھوک نے اُس کی آنکھوں کی سرخی میں اور اضافہ کر دیا۔

☆......☆......☆

''ابا کہاں ہے؟''

اماں کو لے کر خیراتی اسپتال گیا ہے۔ بہت درد تھا۔ اماں کو۔''

''ابا بھوک لگی ہے آٹا نہیں لایا۔ اماں نے روٹی پکائی تھی۔''

اُس کا دل کٹ گیا۔

''رفیعہ پانی لاؤ۔''

''ابا شربت لایا ہے؟'' بیٹی نے بند شیشی کو غور سے دیکھا۔

''کچھ بنا عبدل......؟''

رفیعہ پانی کا گلاس لے آئی۔ عبدل نے اس کی جانب دیکھا رفیعہ چونک گئی، گویا آخری بار ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں۔''

بوتل کھول کر اس نے گلاس میں انڈیل دی۔

''یہ کیا ہے عبدل؟''

''آب حیات......'' اس نے بڑا سا گھونٹ پی لیا۔

''ابا میں بھی۔'' بڑے لڑکے نے گلاس جھپٹ لیا۔ مجھے بھی وہیں چھوٹے نے بھی منہ سے لگا کر گلاس چھین لیا۔ مجھے بھی چکھنا ہے شربت، بیٹی نے بھی بھائی سے گلاس لے لیا۔ ننھا شکیل بلک بلک کر پیاس سے رونے لگا۔

رفیعہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک کے بعد دوسرے کو دیکھ رہی تھی۔

''عبدل...... عبدل کیا تھا یہ؟'' وہ زور سے چیخی۔ ننھا شکیل اور زور سے رونے لگا۔ بیٹی کے ہاتھ سے گلاس چھین کر اس نے دیکھا تو وہ لڑکھڑا کر نیچے گر رہی تھی۔ ننھے شکیل نے پیاس کی شدت سے گھبرا کر زمین پر پڑی شیشی منہ سے لگا لی...... حواس باختہ ہو کر رفیعہ نے گلاس میں پڑے مشروب کو ہونٹوں سے لگا کر گھونٹ بھرا۔ زہریلا سیال گلے سے گزرتا ہوا رگوں کو کاٹتا پیٹ میں اترنے لگا۔

''عبدل!'' گلاس ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

''یہ کیا...... کیا عبدل......'' اس کی آواز اور آنکھیں ایک ساتھ پھٹنے لگیں۔

اس کے سامنے اس کے لخت جگر، اس کی زندگی کا

ساتھی زمین پر ڈھے گئے۔ان سب کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔حواس باختہ اٹھی اور گر گئی۔
کوئی تیز قسم کا زہر تھا۔جس نے آناً فاناً چھ کے چھ افراد کو موت کی نیند سلا دیا۔
خیراتی اسپتال سے بیوی کے ساتھ اندر آتا شرفو صحن میں بکھری لاشوں کو دیکھ کر ٹھٹکا۔
بیوی باہر سے اندر آ رہی تھی۔تب ہی باہر سے آواز ابھری۔
''اماں عبدل کو بھیج دے چھ ماہ کا کرایہ ہو گیا ہے۔نہیں دے سکتا تو مکان خالی کر دے۔میں نے بھی اسی سہولت کے لیے کرایہ پر چڑھا رکھا تھا کہ مہنگائی بڑھ رہی ہے، خرچے پورے نہیں ہوتے۔عبدل تو اسے اپنی پراپرٹی سمجھ بیٹھا ہے۔''
شرفو کو مالک مکان کی آواز آ رہی تھی۔آنکھیں ساکت ہو رہی تھیں۔
''بھیجتی ہوں بچے...... پر کہاں سے کرایہ دے گا۔کام ہے نہیں، ٹھیلا جل گیا ہے۔مہنگائی نے جان نکال دی ہے۔فاقوں کی نوبت آ چکی ہے۔'' ماں بڑبڑاتی اندر داخل ہوئی۔
''آ جا...... اندر......''
ڈیوڑھی چڑھ کر اندر داخل ہوئی، دوسرے لمحے انہیں زمین پر پڑی اپنے لختِ جگر کی لاشیں اور اس کے گرد بکھرا خون۔
''ہائے ربا!...... سینے میں دم رکنے لگا۔
ننھا معصوم کامران، صبح سے بھوک کے لیے بلکتا سہیل، دادی روٹی دے کی پکار کرتا۔اسامہ اور ننھی پری سائرہ۔بے رحم پڑے وجود......
''عبدل کے ابا......'' وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔
'' ارے انہیں کیا ہوا؟'' مالک مکان ہڑبڑا کر قریب آیا۔اسے ایک جھرجھری آئی اور وہ الٹے قدموں بھاگا۔آناً فاناً پورے محلے میں یہ خبر گردش کر گئی۔
''عبدل نے بچوں سمیت خودکشی کر لی۔''
جس نے سنا دل پکڑ لیا۔اگلی صبح...... صبح و شام کی اشاعت کے اخباروں میں شہ سرخی کے ساتھ یہ خبر آ گئی۔
غربت، افلاس و بے روزگاری سے تنگ آ کر عبدل نے بیوی بچوں سمیت خودکشی کر لی۔''
''اُف! مہنگائی نے حد کر دی ہے ایسا تو ہونا تھا۔''
آج ایک عبدل، کل کوئی اور عبدل ہوگا۔یہ مہنگائی سب کو اسی طرح ختم کرے گی۔نہ غریبی ہوگی نہ غریب ہوگا۔
محلے میں ماتم کی سی کیفیت تھی۔جتنے لوگ اتنی باتیں۔اس خبر نے اربابِ اختیار کو جھٹکا دے دیا۔مہنگائی کے حوالے سے خبروں میں اس کا ذکر کیا گیا۔
وزیرِاعظم نے از خود اس اقدام۔خودکشی کا نوٹس لیا۔اپنا ایک وفد عبدل کے گھر بھیجا۔تین لاکھ روپے اور ایک مکان کے کاغذ دیکھ کر عبدل کا باپ شرفو رو پڑا۔
''یہ میرے بیٹے کی قیمت ہے؟ بس اتنی سی؟ اب میں اس رقم کا، ان روپوں کا کیا کروں گا۔جن کو ضرورت تھی وہ تو سسک سسک کر مر گئے۔اب میں یہ کہاں خرچ کروں......؟'' شرفو رو رہا تھا اور شرفو کی بیوی ساکت ہو کر ساتھ بیٹھی تھی۔
''اماں حوصلہ کریں حوصلہ۔'' ایک شخص نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔
کیسے صبر کروں، کیسے۔وہ اپنی موت نہیں مرا۔اسے بھوک نے مارا ہے۔اس جان توڑ مہنگائی نے مارا ہے۔تم لوگوں نے مارا ہے، جو غریبوں کے بارے میں نہیں سوچتے......''
شرفو نے بھی روتے ہوئے ہاتھ جوڑ لیے۔
''خدارا...... مہنگائی کے اس سیلاب کو روکو...... آج میرا عبدل مرا ہے۔کل اسی چکی نے قدم قدم پر کھڑے عبدلوں کو پیس ڈالنا ہے۔اس ناچتی بھوک کو ختم کر دو۔خدا کے واسطے قہرِ الٰہی نازل ہو جائے گا۔خدا نے ہر شخص کا رزق لکھا ہے، مگر زمین کے ڈاکوؤں نے اسے قیمتی بنا دیا ہے۔خدا کے واسطے اس عفریت کو روکو۔ورنہ...... ورنہ۔'' روتے روتے شرفو کا گلا رندھ گیا۔
شرفو کی بیوی نے نڈھال ہو کر اس کے کاندھے سے سر ٹیک دیا۔اربابِ اختیار کا سر جھک گیا۔یہ کون سی منزل ہے، جس کے ہم مسافر ہیں......؟ کون سی دنیا ہے جس کے ہم باسی ہیں......؟؟
''ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات۔''

☆☆......☆☆

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

اسرار کی نئی دنیا میں لے جانے والے، پُراسرار سلسلے کی تیسری قسط

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ماما! یہ ایک معصوم سا بلا ہے...... اور آپ اسے جن بھوت کہہ رہی ہیں؟" صنوبر نے احتجاج کیا۔

"اچھا تو پھر تم ہی بتاؤ یہ سارا دن کہاں تھا۔ میں پورا دن اسے تلاش کرتی رہی۔ گھر کا کونہ کونہ چھان مارا، مگر یہ نہیں ملا۔ نوکروں کو بھی لگا لیا ساتھ میں۔ اس کمینے کی خاطر میں نے جم سے بھی چھٹی کی اور مسز طارق کی طرف بھی نہیں گئی۔ لیکن یہ...... اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔"

"ماما وہ بس ایک بلا ہے۔ ایک بے زبان جانور اور اسے کیا معلوم اس کے لیے اسے دیکھتے ہی آپ کے دل میں اتنی محبت پیدا ہو چکی ہے۔" صنوبر کی ہنسی نکل رہی تھی" وہ اپنے پرانے ٹھکانے پر چلا گیا ہوگا۔ ویسے بھی اس طرح کے جانوروں کو اپنا پرانا ٹھکانہ چھوڑنے کی عادت نہیں ہوتی۔"

"چلو مان لیا ایسا ہے، تو پھر مجھے اس بات کا جواب دو کہ جب سے تم آئی ہو یہ گھر میں کیوں موجود ہے اور شاید رات بھر رہا ہے تمہارے ساتھ بھی۔!"

"ماما پلیز آپ اس طرح کی باتیں مت کیجیے۔ مجھے آپ کی سوچ پر افسوس ہو رہا ہے۔ آپ کی ایک بات تو غلط ثابت ہوگئی۔ میں تو دوپہر میں تین بجے گھر آ گئی تھی اور یہ تو رات کو واپس آیا ہے۔"

"ہاں تو رات کو تھا کہاں؟ تمہارے پاس اور تمہارے کمرے میں۔ اسے باقی گھر سے اور گھر کے لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بیٹا۔ یہ اس طرح......" درشہوار اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔

"ماما یہ جسٹ ایک بلی ہے آپ اپنے وہم اور سوچوں کے آئینے میں اسے مت دیکھیے۔ یہ ایک معصوم جانور ہے اور یہ اس کی مرضی ہے کہ کب اور کہاں رہنا چاہتا ہے۔ یہ آپ کا پالتو Pet نہیں ہے کہ جیسا آپ چاہیں گی ویسا ہی کرے گا... ویسے بھی اگر آپ ایسا چاہتی ہیں تو آپ کو اسے باقاعدہ ٹریننگ دینا ہوگی"

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے آج یہ سارا دن میرے پاس رہے گا میں اس کی ٹریننگ کروں گی...." وہ بلے کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں اور صنوبر نے جیسے ان کی بات بلا چوں چرا مان لی اب مشکل میں تھا تو یہ بلا یعنی سلمان اسے لگا عشق کرنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے یہ تو جن سے انسان بننے سے بھی زیادہ مصیبتوں والا کام ہے... اگر صنوبر کی ماں نے اسے سارا دن

اپنے پاس روک لیا تو وہ نہ صرف مدرسے نہیں جاسکے گا بلکہ اس کا یہ مقصد بھی فوت ہوجائے گا کہ اسے صنوبر کی اداسی اور پریشانی کے بارے میں پتا کرنا تھا... لیکن اب وہ پھنس چکا تھا اور فوری طور پر اسے کوئی راستا بجھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ مدرسے نہ گیا تو مدرس اور نگراں اسے کسی صورت معاف نہیں کریں گے اور اس کا کوئی عذر کام نہیں آئے گا.... سوچتے سوچتے اسے ایک حل بجھائی دیا مگر یہ حل ہر طرح سے اپنی جن جاتی سے بغاوت اور اپنے باپ کے اصولوں کی خلاف ورزی سمجھا جائے گا لیکن ان حالات میں اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا نہ ہی وہ صنوبر سے دور رہ سکتا تھا اور نہ ہی مدرسے سے نکالا جانا افورڈ کر سکتا تھا اسے وہ کرنا ہی ہوگا جو اگر جنوں کی تاریخ میں کبھی کسی نے کیا بھی تھا جو غلط تھا اور اس غلطی کی کڑی سزا بھی ضرور دی گئی ہوگی... اس نے ایسا کیا تو پتا نہیں اسے کیا اور کیسی سزا ملے لیکن وہ اپنی محبت کی خاطر ایسا کرنے پر مجبور تھا اور اسے ایسا کرنا ہی پڑا.... اس نے ایک ہلکی سی میاؤں کی اور صنوبر کی ماں در شہوار کی گود میں جا کے بیٹھ گیا۔ اسے اس وقت اس عورت کا اعتماد جیتنا تھا جو اس گھر کی مالکن تھی اور اس وقت اس کی طرف سے بلاوجہ کے شکوک وشبہات میں مبتلا تھی وہ اسے ناراض کر کے اس گھر میں کسی بھی صورت نہیں رہ سکتا تھا... در شہوار کو بلے کا یوں اس کی گود میں چڑھ کر بیٹھ جانا ایک ایسی خوشی کا باعث تھا کہ اسے بلے سے جو بھی شکایت تھی وہ لمحے بھر میں کافور ہوگئی۔ صنوبر نے جب یہ منظر دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا "دیکھا ماما اس نے آپ کی ساری باتیں سمجھ لی ہیں اور اب اسے آپ کے پاس ہی رہنا ہے شاید کل وہ آپ کی محبت کو ٹھیک سے سمجھ نہیں سکا تھا" صنوبر کی مسکراہٹ نے سلمان کا حوصلہ بڑھا دیا اور وہ در شہوار کو مزید اپنائیت کا احساس دلانے لگا۔

"ٹھیک کہتی ہو تم میں غلط تھی یہ تو بہت معصوم اور بہت پیارا ہے اب میں اسے ہمیشہ اپنے پاس ہی رکھوں گی" یہ کہہ کر در شہوار بلے کے جسم پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگی اور سلمان کو یہ محبت اور اپنائیت وقتی طور پر بھلی معلوم ہوئی، اس کے بعد صنوبر نے ناشتا کیا، وہ تیار ہوئی اور اپنے اسکول چلی گئی اور سلمان اسے حسرت کی تصویر بنے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ شکر ہے اس وقت در شہوار کی نظر اس پر نہیں پڑی ورنہ وہ پھر کسی نئے شک اور وہم میں پڑ جاتی اور اسے پھر اس کا شک دور کرنے کے لیے کچھ نیا کرنا پڑتا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی نئی مالکن جو اس کی محبوبہ کی ماں ہے، اسے خود سے دور نہیں کرنا چاہتی اور آج ہی سے وہ اس کی ٹریننگ بھی شروع کرنے والی ہے تاکہ اسے گلی محلے کے گھروں میں آوارہ پھرنے والے بلے سے ایک پالتو اور سدھایا ہوا بلا بنا سکے جو اس کے اشاروں پر چل سکتا ہو... لیکن یہ سب اپنی جگہ تھا، سلمان کو امید تھی کہ کوئی بھی انسان اس کے ساتھ چوبیس گھنٹے کا وقت نہیں گزار سکتا۔ وہ تو بلا بن کر کسی کے بھی ساتھ اپنا سارا وقت گزار سکتا تھا لیکن کوئی انسان ایسا ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے اسے یہ یقین تھا کہ در شہوار جیسے ہی اپنی کسی انسانی ضرورت کو محسوس کرے گی اور اسے اکیلا چھوڑے گی وہی وقت اس کے لیے کارآمد اور اپنی اس ترکیب پر عمل کرنے کا ہوگا جس کے لیے جنوں کے قبیلے میں منائی تھی اور ایسا کرنے والے کے خلاف سخت قوانین تھے جن کو عمل میں لا کر سزائیں دی جاتی تھیں۔ اور اس کا باپ ابراہیم بھی کسی جن کے ایسی حرکت کرنے کے اتنا خلاف تھا کہ وہ کئی جنوں کو سزا دلوا چکا تھا۔ دوسرے معنوں میں ابراہیم ایک کٹر مسلمان جن تھا، جسے اپنے مذہب اور اپنے خالق کے احکامات سے سرتابی کرنے والے لوگ بھی سخت ناپسند تھے اور ایسے لوگوں کے ساتھ وہ کسی بھی طرح کی بھلائی کرنے کے حق میں نہیں تھا پھر بھی قدرت اپنی سب ہی مخلوقات کے اصولوں اور نظریات کو آزمائش کی کسوٹی پر پرکھنے کا کام کرتی ہے سو ابراہیم کی پہلی آزمائش یہی تھی جب اس نے سلمان کو انسان بننے اور انسانوں کی طرح ان ہی کے ایک مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی تھی۔ ایک طرح سے ابراہیم کے سخت اصولوں کو پہلی بار دراڑ اور شکستگی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس نے کسی بھی طرح اپنے اکلوتے بیٹے کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے یہ بات تو مان لی تھی لیکن اس سے آگے اگر سلمان نے کچھ بھی ضابطے کی خلاف ورزی کی تو ابراہیم کو یہ کسی بھی صورت منظور نہ ہوگا...... یہ بات جانتے ہوئے بھی سلمان اپنی جگہ، اپنے دل سے مجبور تھا اور اس نے وہ کر دکھایا جس کی اسے سختی سے ممانعت تھی۔

جیسے ہی در شہوار واش روم میں گئی فوراً سے پیشتر اس نے گھر کے ایک ایسے کونے کا رخ کیا جو پوری طرح ویران تھا اور جہاں اس وقت کوئی آتا جاتا نہیں تھا۔ یوں بھی صنوبر، اس کا بھائی سلمان اور اس کا باپ آصف کریم سب ہی اپنے اپنے کاموں سے چلے جاتے تھے۔ گھر میں در شہوار اور آتے جاتے کچھ ملازمین ہی باقی بچتے تھے... سلمان نے جلدی سے خود کو

بلّے کے بہروپ سے نکلا اور انسان بن گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے آپ کو آنکھیں بند کر کے ایک عمل سے گزارا جو جنات کا اپنا غیر معروف طریقہ ہے۔ اس طریقے سے اس نے اپنے جیسا ایک اور سلمان اپنے ہی سامنے لا کے کھڑا کر دیا ۔سلمان نے انسان بننے کے بعد اپنی آنکھیں بند کیں اور اپنے تصور میں بار بار اپنا ہی پورا وجود لانے کی مشق کرنے لگا۔

ایسا کرنے میں اسے خاصی دقت پیش آئی اور کتنی بار کی کوششوں کے بعد اسے اس میں کامیابی نصیب ہوئی کہ وہ خود کو عالم تصور میں دیکھنے میں کامیاب ہو گیا اور پورے یقین سے اس نے اپنی بند آنکھیں دھیرے دھیرے کھولیں کیونکہ وہ

جانتا تھا جو بھی جن اس عمل میں پہلی بار ناکام ہو جاتا ہے پھر اسے اکتالیس دن تک اس عمل کو دوبارہ کرنے کی منائی ہے اور اگر وہ کرنا بھی چاہے تو اسے اکتالیس دن سے پہلے کبھی کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔ اسی لیے سلمان کو ڈر تھا کہ اگر وہ پہلی مرتبہ میں ناکام ہو گیا تو پھر اس کا عشق اور اس کی تعلیم دونوں ادھورے رہ جائیں گے۔

اگر اس نے عشق کا دامن تھاما تو اسے تعلیم سے ہاتھ دھونا پڑیں گی اور اگر تعلیم کو پکڑ کے رکھنا چاہا تو پھر اس کے لیے عشق کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے کیونکہ اب اگر کچھ ایسا ہوا کہ وہ درشہوار کی نظروں کے سامنے سے اس طرح پورے دن کے لیے غائب ہوا تو اسے اپنے اس شک پر کامل یقین ہو جائے گا کہ وہ بلا نہیں کوئی جن ہے اور پھر اس کا اس گھر میں سمجھو داخلہ بند ہو جائے گا۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

یہ بات سلمان کو ابتدا میں ہی قدرت نے سمجھا دی تھی اور اب اس نے خود کو مشکلات کے حوالے کرنے کا عزم صمیم کر لیا تھا۔

اس کا ہم شکل سلمان آنکھیں کھولتے ہی اس کے سامنے تھا۔ اپنی اس کامیابی پر اس کے دل میں ایک عجیب سی مسرت پیدا ہوئی۔ اسے ایسا لگا جیسے قدرت بھی اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ ورنہ وہ ناکام ہو جاتا تو اس کا عشق بھی ناکامی کے اندھیروں میں ڈوب جاتا۔ اس نے سلمان کی شکل کا ایک اور انسان اپنے سامنے دیکھ کر اسے اپنے سینے سے لگایا اور بولا۔

"تم ہی میرے عشق کی منزل تک مجھے پہنچاؤ گے، دیکھو جیسا میں کہوں سب کچھ ویسا ہی کرنا اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کی تمہیں اجازت نہیں ہے۔ سمجھو تو...... مجھ میں اور تم میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن تم میرے غلام ہو اور میں تمہارا آقا ہوں اور میں وہ ہی کروں گا جو مجھے ٹھیک لگے گا۔ کوئی گڑبڑ نہیں کرنا ورنہ میں تمہیں سزا دوں گا اور سزا سے تمہیں کافی تکلیف ہوگی۔"

"آپ مجھے سزا سے مت ڈرائیے ماسٹر! میں ویسے بھی آپ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ مجھے تو آپ نے بنایا ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ خالق کی مرضی اور اس کے حکم سے کوئی مخلوق سرتابی کرے... حکم دیجیے میرے آقا مجھے کیا کرنا ہے" ہم شکل نے کہا تو سلمان نے برا سا منہ بنایا اور بولا۔

"سب سے پہلے تو تمہیں اپنی بات مختصر کر کے بیان کرنا آنی چاہیے۔ تم کافی چرب زبان ہو اور بلاوجہ بات کو طول دے کر میرا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہو۔" یہ سن کر ہم شکل شرمندہ ہوا اور بولا۔

"آئندہ خیال رکھوں گا ماسٹر۔" اس کے بعد جو کچھ وہ بولنا چاہتا تھا اسے اس نے اپنے حلق ہی میں روک لیا اور خاموشی سے وہ سارے احکامات سنتا رہا جو سلمان نے اسے دیے تھے اور پھر سلمان کے کہنے سے غائب ہو کر مدرسے چلا گیا۔ جانے سے پہلے سلمان نے اسے یہ تاکید کافی سختی سے کر دی تھی کہ جب تک وہ نہ بلائے اسے آنا نہیں ہے۔ وہ جب ضروری سمجھے گا اسے بلائے گا ورنہ اسے احکامات ملتے رہیں گے جن پر اسے عمل کرنا ہے۔

یہ سب کر کے سلمان نے خود کو پھر سے بلا بنایا اور گھر کے اندر چلا گیا۔ اس بار اسے بلا بننے میں پہلے سے زیادہ مشقت کرنا پڑی تھی اور یہ اسی وجہ سے تھا کہ اس نے اپنی شکتیوں کا کچھ حصہ اپنے ہم شکل میں منتقل کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

"میں تو سمجھی تم پھر بھاگ گئے۔" اسے دیکھتے ہی درشہوار نے کہا اور اس سے پوچھنے لگی "دودھ پیو گے؟" ابھی سلمان اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کی ہر بات اس کی سمجھ میں آ رہی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ ہوشیار عورت پھر اس پر شک کرنے لگے گی اور اب سلمان ایسا کوئی موقع اسے دینا نہیں چاہتا تھا جس کی وجہ سے وہ اس کی طرف سے کسی وہم یا اندیشے میں مبتلا ہو اور اسے اس گھر میں نہ رکھنے کے بارے سوچے۔ سلمان نے میاؤں کیا تو...... اسے لگا بلا اس سے دودھ مانگ رہا ہے لیکن جب وہ دودھ لے کر آئی تو سلمان نے دودھ کی طرف سے منہ پھیر لیا اور اس کے بار بار کہنے پر بھی دودھ میں منہ نہیں ڈالا تو درشہوار کو لگا کہ اس نے اس کی میاؤں کا مطلب غلط لیا ہے۔ بلا کچھ اور چاہتا ہے۔ کیا!! یہ تو اتنی جلدی

وہ نہیں بتا سکتی تھی کیا؟ اس لیے کئی طرح کی چیزیں لا لا کر وہ بلّے کے سامنے رکھتی رہی اور بلّا ان سے منہ پھیرتا رہا اور آخر میں جب درشہوار نے اس کے سامنے باہر کے بسکٹوں کا ایک ڈبا کھول کے رکھا تو بلّے نے پوری دلچسپی سے انھیں کھانا شروع کر دیا۔ درشہوار پہلے تو حیران ہوئی اور بعد میں یہ سوچ کر خوش ہوگئی کہ یہ کوئی آوارہ اور عام بلّا نہیں ہے بلکہ یہ تو کوئی بہت ہی کلاسی بلّا ہے۔ جس نے غیرملکی بسکٹوں کو اپنے لائق سمجھا اور ان سے اپنی بھوک مٹا رہا ہے ورنہ عام بلّے اور بلیاں تو دودھ پر جھپٹتے ہیں جیسے دودھ ہی ان کے لیے سب کچھ ہے۔ دودھ پر مرے جاتے ہیں... لیکن یہ بلّا عام بلوں سے بہت مختلف ہے۔ یہ سوچ کر درشہوار جیسی کلاس کونشش عورت کو ایک گونہ اطمینان اور خوشی حاصل ہوئی اور وہ مزے سے اس کے سامنے بیٹھ کر اسے بسکٹ کھاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ سلمان نے یہ حرکت جان بوجھ کر کی ہے تا کہ اس کے اور قریب جا سکے۔ اس کے قریب ہونے کا مطلب ہے کہ صنوبر اور گھر کے باقی سب ہی لوگ اس کے ساتھ محبت اور انسیت سے پیش آئیں گے۔

یہ بازی سر کرنے کے بعد سلمان یہ سوچنے لگا کہ صنوبر کیسی ہوگی اور اس وقت وہ اپنے اسکول میں کیا کر رہی ہوگی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھنے لگی۔

☆......☆......☆

دوسری طرف اس کا ہم شکل جو اس کی جگہ اس وقت مدرسے میں موجود تھا اور مدرس کے سامنے بیٹھ کر ان کی غور فکر میں ڈوبی ہوئی باتیں سن رہا تھا اس پر نئے جہان کھل رہے تھے۔ مدرس ایک پہنچا ہوا عالم اور کسی حد تک عامل بھی تھا۔ اس کے باوجود سر دست اسے ذرا سا بھی یہ شک نہیں ہوا کہ ان کے سامنے جو سلمان بیٹھا ہوا ہے، وہ سلمان نہیں اس کا ہم شکل ہے۔ لیکن شک ہو بھی سکتا تھا۔ اب تک بھی ہم شکل نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی جس سے وہ پکڑا جائے یا اسے کسی پر شک ہونے لگے۔ ویسے بھی سلمان نے اسے نہ صرف سب کچھ بتا کے بھیجا تھا بلکہ سلمان ہم شکل سے روحانی رابطے میں بھی تھا۔ اس لیے اگر کہیں کوئی مشکل گرہ آ جاتی تو وہ روحانی ذریعے اور رابطے سے سلمان سے اس کا حل پوچھ سکنے کے لیے آزاد تھا پھر بھی مدرس نے اس سے آج کچھ مختلف باتیں کہیں۔

''سلمان کیا بات ہے رات ٹھیک سے سوئے نہیں تھے؟'' مدرس ریحان عظیم نے معاً اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں تو استاد جی رات کو تو میں تھا ہی نہیں۔'' جھٹ سے ہم شکل نے جواب دیا۔

''کیا مطلب رات کو تم نہیں تھے کہاں نہیں تھے؟'' ریحان عظیم کو اس کے جواب پر حیرت ہوئی۔

''وہ میرا مطلب ہے میں ہوش میں نہیں تھا، ایسی گہری نیند سویا تھا۔'' ہم شکل نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ اسے اپنے جواب کے ادھورے اور اول جلول ہونے کا احساس ہوا۔

''لیکن تمہاری آنکھوں میں وہ پہلی جیسی چمک نہیں ہے۔ جانتے ہو نا ہم تمہاری آنکھوں کی چمک دیکھ کر ہی تمہارے بیدار مغز ہونے اور تمہاری ذہانت کا اندازہ لگاتے ہیں۔''

ریحان نے اسے یاد دلایا کہ اس نے ایک بار کہا تھا تمہاری آنکھوں میں ایسی خاص بات ہے جو کسی اور طالب علم کی آنکھوں میں نہیں ہے۔ تمہاری آنکھوں کی چمک دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ تم دوسرے طالب علموں کے مقابلے میں زیادہ ذہین اور مختلف ہو۔

''جی استاد جی مجھے یاد ہے مگر کچھ دن سے میری آنکھوں کی چمک میں کچھ کمی سی واقع ہونے لگی ہے اور قدرت کے اس راز سے میں خود بھی واقف نہیں ہوں۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہو رہا ہے۔'' اب وہ استاد کو کیا بتاتا کہ وہ تو سلمان کی بس ایک نقل تھا۔ اس میں اور اصل سلمان میں یہی تو ایک فرق تھا۔ دونوں کو ساتھ میں کھڑا کریں تو یہی آنکھوں کی چمک ہے جس سے اصل اور نقل کا پتا چلایا جا سکتا ہے۔ استاد کتنا بھی پہنچا ہوا تھا پر اس راز کو اتنی جلدی نہیں پا سکتا تھا اس لیے وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''تمہیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ ہی ایسا لگتا ہے جیسے قدرت تمہارے معاملے میں کچھ مختلف اور انہونے پن سے پیش آتی ہے۔ مجھے کبھی کبھی تو ایسا بھی لگتا ہے جیسے تم انسان ہی نہیں ہو!'' یہ بات سن کر ہم شکل ایک دم ہی جیسے اچھل کے رہ گیا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں استاد جی! ایسا تو انسانوں کے ساتھ ہوا ہی کرتا ہے۔ بعض انسانوں کی آنکھوں میں دوسروں سے زیادہ چمک اور روشنی ہوتی ہے۔ جس طرح ایک انسان کی آنکھیں دوسرے انسان سے مختلف ہوتی ہیں۔ کوئی زیادہ خوبصورت آنکھوں کا مالک ہے اور کسی کی آنکھیں بہت معمولی ہیں۔ اس میں قدرت کا وہی بھید چھپا ہے جو اس نے ہر انسان کو دوسرے سے مختلف بنا کر ظاہر کیا ہے اور پوشیدہ بھی ہے'' سلمان نے لمبی سی علمی تاویل پیش کی تو استاد کے ہونٹوں پر ایک باریک سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ بولا۔

''تمہاری آنکھوں کی چمک میں شاید کچھ کمی سی ہے یا پھر یہ میرے دیکھنے کا نقص ہے لیکن تمہاری ذہانت اور بیداری میں کوئی کمی نہیں واقع ہوئی اور یہ جان کر مجھے بہت خوشی اور تسلی ہوئی ہے کہ تم اسی طرح ذہین اور سمجھدار ہو جیسا کہ ہمیشہ سے تھے'' پھر اس نے کچھ توقف کیا اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا ''اصل چیز تو انسان کی ذہانت ہی ہے۔ اس کی ذہانت میں کوئی کمی واقع ہو تو تشویش کی بات ہے۔ آنکھوں کی چمک سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، یہ میرے دیکھنے کا نقص بھی ہو سکتا ہے۔'' استاد کے اطمینان اور خود ہی خود اس پر یقین کر لینے سے ہم شکل کو طمانیت ملی اور اس نے محسوس کیا کہ اس کے مالک سلمان نے اسے اس کی ذہانت اور بیدار مغزی پر خیال ہی خیال میں شاباش دی۔ سلمان کو سب سے زیادہ ڈر مدرس ریحان عظیم سے ہی تھا کہ وہ ایک پہنچا ہوا عالم اور بعض جہتوں میں عامل بھی تھا۔ اگر اسے اس کے ہم شکل پر سلمان ہونے کا یقین تھا تو اب کوئی اور اسے کسی بھی صورت میں پہچان نہیں سکتا تھا۔ اس طرح اس کا یہ عمل بارگاہِ خالق میں قبول کر لیا گیا تھا۔

استاد آج زیادہ بات کرنے کے موڈ میں تھا اس لیے اس نے سلمان سے پوچھا۔

''تمہاری عمر کو دیکھ کر مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ تم کسی اور چکر میں نہ پڑ جاؤ۔ کیا ایسا ہے؟''

''میں کچھ سمجھا نہیں استاد جی؟ آپ کس چکر کی بات کر رہے ہیں؟'' ہم شکل نے بے چین ہو کر کہا۔

''اس عمر میں انسان کی تعمیر کا وہ مرحلہ طے ہوتا ہے جب اس کے دل میں موسموں کے اثر انداز ہونے کا احساس جاگتا ہے۔ خوشبو، بارش، ہوا اور قدرت کے باقی نظارے اسے دنیا کی اور سب چیزوں سے زیادہ لبھاتے ہیں۔ اسے ایسا لگتا ہے جیسے اس کا دل مچل رہا ہے اور کوئی اس کے دل کے تاروں سے کھیل رہا ہے۔ آسمان پر چمکتا چاند اور ستارے ایسا لگتا ہے جیسے صرف اسی کے لیے نکلے ہوں اور اسی سے باتیں کرتے ہوں۔ جو وہ سوچتا ہے اسے لگتا ہے جیسے کوئی الوہی رنگ اس کی سوچوں میں ہے۔ المختصر کائنات یکا یک اسے حسین لگنے لگتی ہے اور قدرت کے بھید اس کے اندر انگڑائی لے کر اس پر کھلنے لگتے ہیں؟'' ریحان عظیم جیسے یہ سب بیان کرتے ہوئے خود بھی کائنات کی رنگینیوں میں گم ہونے لگا تھا۔

''نہیں استاد جی! میرے ساتھ تو ایسا کچھ نہیں ہو رہا۔ سب کچھ پہلے جیسا ہی لگ رہا ہے جیسے ہمیشہ سے تھا'' ظاہر ہے یہ سب تو اصل سلمان کے ساتھ ہو رہا تھا، اسی لیے تو اسے عشق کے بچھو نے ڈس لیا تھا اور وہ اپنے عشق کی خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار تھا حتیٰ کہ وہ عشق کی خاطر اپنے ان اصولوں کو بھی تاراج کرنے کا سلسلہ شروع کر چکا تھا جن کے بارے میں اگر کسی کو بھی بالخصوص اس کے باپ کو پتا چلا تو سمجھو اس کی خیر نہیں ہوگی۔ اور اشد ممکن ہے کہ وہی باپ جو اس سے ساری دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرتا تھا کوئی عجب نہیں کہ اس کا دشمن بن جائے۔ لیکن عشق ہوتا ہی وہ ہے جو اپنے عہد کی سب روایتوں سے ٹکرا جائے اور اسے کسی اور بات کسی اور خطرے کا ہوش نہ رہے۔ عشق میں انسان کو سارے اعتبار کھو کر بھی بس ایک ہی اعتبار کو پانے کی طلب رہتی ہے اور وہ اعتبار اس کے محبوب کا اعتبار ہوتا ہے۔ ایسا ہی سلمان کے ساتھ ہو رہا تھا۔ وہ بھول چکا تھا کہ وہ ایک جن ہے اور اسے ایک انسان جاتی کی لڑکی سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ایسا تو قدرت سے ٹکرانے جیسا ہے لیکن عجیب بات ہے قدرت کے بھیدوں اور اصولوں سے ٹکرانے کے لیے بھی وہ قدرت سے ہی مدد کا خواہاں تھا۔

''چلو یہ تو اچھی بات ہے ورنہ ایسا ہو جائے تو سب کچھ ختم ہونے لگتا ہے اور سب سے پہلے انسانی عقل اس آگ میں

جل کر بھسم ہو جاتی ہے۔ مجھے امید ہے تمہارے ساتھ ایسا کچھ ہوا تو تم مجھ سے اسے اخفا نہ رکھو گے۔ ایسا میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تمہارے جیسا علم کا طالب اور محب اگر اپنے راستے سے بھٹکا تو یہ بڑا المیہ ہوگا۔ اور میں تمہیں اس المیے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا، تمہاری مدد کروں گا۔"

ہم شکل کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ رہی تھی کہ استاد کیا کہنے کی کوشش کر رہا ہے اسی لیے اپنے تجسس کی خاطر اس نے مزید جاننا چاہا۔

"استاد جی اس مدرسے میں تو میری عمر کے اور بھی کئی لڑکے ہیں تو کیا ان سب کے ساتھ بھی ایسا ہونے کا احتمال ہے؟"

"بالکل ہے۔ مگر یہاں جس طرح طالب علموں کو رکھا جاتا ہے۔ ان کی تربیت کی جاتی ہے تو ایسا ہونا ممکن نہیں ہے کیونکہ عشق حقیقی کے سامنے عشق مجازی کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے اور ایک بات میں تمہیں بتاتا ہوں۔ محبت کی بیماری ضروری نہیں کہ سب ہی انسانوں کو لاحق ہو۔ یہ ایسی بیماری ہے جو مخصوص لوگوں کے دلوں میں جگہ بناتی ہے۔ مجھے اس مدرسے میں ایسا کوئی اور طالب علم نہیں دکھائی دیتا جو اپنے معمولات سے ہٹ کر اس بیماری میں مبتلا ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا بھی تو ہمارے پاس اس کا علاج بھی ہے۔ ہم اسے سیدھی راہ پر لے آئیں گے کیونکہ عام طور پر یہ بیماری اپنی پوری شدت سے کسی کسی کو ہی پکڑتی ہے۔ زیادہ تر لوگوں میں اس کے پہلے ہی مرحلے میں اس کی شناخت ہو جاتی ہے اور ان کا علاج کرنا بھی کوئی دشوار نہیں ہوتا لیکن جن لوگوں کو یہ پہلے مرحلے میں ہی اپنی پوری شدت سے ہوتی ہے ان کا علاج کبھی کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ وہ لاعلاج ہوتے ہیں۔"

استاد کی کہی ہوئی باتیں ہم شکل کے ذہن میں اس وقت بھی گونجتی رہیں جب وہ مسجد میں نماز پڑھنے گیا اور وہاں سے واپس لوٹا لیکن اتنی دیر تک ان باتوں میں گھرے رہنے کے بعد بھی اسے اپنے دل میں ایسا کوئی احساس کروٹ لیتا ہوا محسوس نہیں ہوا، جیسا کہ استاد جی نے بتایا تھا۔ وہ مدرسے کے اس وسیع باغ میں رات کو دیر تک لیٹ کر آسمان کو تکتا رہا لیکن اس سے چاند اور ستاروں میں سے کسی نے بات نہیں کی۔ وہ ایسی ہی خاموشی سے چمکتے رہے جیسے ہر روز چمکا کرتے تھے۔ بس اتنا ہوا تھا کہ اسے پہلے کے مقابلے میں آج چاند اور ستاروں کا دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے۔ آج تم اب تک بھی کمرے میں نہیں آئے۔ معلوم بھی ہے کیا وقت ہوا ہے؟" اس کے روم میٹ عمران نے اس کے قریب ہی گھنی اور آرام دہ گھاس پر لیٹتے ہوئے اس سے کہا تو وہ جیسے چونک ہی تو پڑا۔

"اچھا کیا وقت ہوا ہے مجھے خبر نہیں ہوئی!" وہ جلدی سے بولا۔

"دس بجنے والے ہیں اور عشاء کی نماز کے ختم ہونے کے ایک گھنٹے بعد کمرے میں سونے چلے جانے کا حکم ہے اور اب یہ ایک گھنٹہ بس پورا ہونے ہی والا ہے" عمران نے کہا۔

"اگر ایسی بات ہے تو پھر تم کیوں اب تک کمرے سے باہر ہو؟" ہم شکل نے عمران کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "میں نگراں کے کمرے کی طرف گیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر مجھے لگا کہ تم یہاں ہو۔ دور سے شک ہوا تھا، قریب آیا تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ یہ تم ہی ہو۔" عمران نے وضاحت سے کہا۔

"اچھا تو پھر چلتے ہیں۔" ہم شکل نے کہا اور چلنے کو اٹھ کر بیٹھ گیا۔

☆......☆......☆

سارا دن سلمان درشہوار کے ساتھ رہا اور جو کچھ اوٹ پٹانگ باتیں وہ اسے سکھاتی رہی سلمان اس سے سیکھتا رہا لیکن سلمان نے اس ایک دن کی ٹریننگ میں درشہوار کو اتنا تنگ کیا کہ وہ کبھی کبھی غصے سے اس کی مار لگانے کا سوچنے لگتی تھی اور جیسے ہی وہ اس پر غصہ ہوتی سلمان اس پر اس طرح غراتا کہ وہ ایک دم ڈر جاتی اور اپنے ارادے سے خود کو باز رکھتے ہوئے اس کی منتیں کرنے لگتی۔ ایک مرحلے پر تو درشہوار پر سلمان کو ترس بھی آ گیا تھا، جب وہ تھک کر بڑے ملائم لہجے میں بولی۔

"دیکھو ٹیٹو مجھے زیادہ تنگ مت کرو اور جو میں کہتی ہوں وہ کرو۔ تمہیں پتا ہے تم سے پہلے بھی میرے پاس ایک بلی تھی۔ وہ تم سے زیادہ خوبصورت تھی اور اس نے مجھے کبھی تنگ نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ میرا کہنا مانتی تھی۔ پھر ایک دن وہ بیمار

ہوگئی اور پھر کچھ دن بعد مرگئی میں نے اس کا بہت علاج کرایا مگر اس کی حالت سنبھل کر ہی نہیں دی۔ پتا نہیں اس نے ایسا کیا کھالیا تھا حالانکہ میں اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ تب سے میں خود کو تنہا محسوس کرتی ہوں۔ اب تم آئے ہو تو مجھے لگا ہے میری میری نونو واپس آگئی ہے لیکن تم تو بلے ہو۔ اسی لیے میں تمہیں نونو نہیں ٹینو کہا کروں گی۔ بولو ٹھیک ہے نا؟'' سلمان کو اس پر ترس آیا اور اس نے ہلکے سروں میں میاؤں کر کے جیسے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

سلمان کا دل تو چاہا کہ وہ اس خوبصورت عورت سے پوچھے کہ اس کے پاس اس سے بھی زیادہ خوبصورت شوہر ہے تو پھر وہ اس کی موجودگی میں اکیلی کیوں ہے۔ دو بچے بھی ہیں جن میں سے صنوبر تو غیر معمولی حسین لڑکی ہے اور وہ حساس بھی معلوم ہوتی ہے تو پھر کیوں یہ عورت اس طرح خود کو اکیلا محسوس کرتی ہے کہ اسے بلیوں اور جانوروں سے اپنی تنہائی دور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ سب اس نے سوچا ضرور لیکن وہ اس سے ظاہر ہے پوچھ نہیں سکا۔

دوپہر کے بعد صنوبر آئی تو سلمان کا دل خوشی سے اچھلنے لگا اور وہ دوڑ کر اس کی طرف لپکا لیکن یہ کیا...... صنوبر تو پچھلے دو دن کے مقابلے میں آج زیادہ ہی اداس نظر آئی تھی۔ اس نے سلمان کی طرف ایک نظر بھر کے بھی نہیں دیکھا جیسے اسے یاد ہی نہیں تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی ہے جو اس کے لیے بلا بن کر یہاں موجود ہے۔ اس کے گھر میں...... سلمان کو اس کی اِس بے رُخی پر دلی افسوس ہوا لیکن اس سے پہلے کہ اس کی اداسی اس پر حاوی ہو جاتی، اُس نے خود کو سمجھایا کہ وہ کیسے اسے توجہ دے سکتی ہے۔ اس کا التفات کیسے اسے مل سکتا ہے۔ وہ اسے پاگلوں کی طرح چاہنے لگا ہے مگر صنوبر کو تو یہ تک نہیں پتا کہ وہ انسان ہے۔ ایک معمولی کالے بلے کو وہ کتنی دیر تک یاد رکھ سکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے اس نے ایک پوری رات اسے دیکھتے ہوئے اور گھنٹوں اس کے تلوے چاٹتے ہوئے گزاری تھی لیکن یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں تھی جس سے اس کے دل میں ایک بلے کے لیے ایسی محبت پیدا ہو سکتی ہو، جسے وہ یاد بھی رکھ سکے۔ سب ہی پالتو بلیاں اور بلے اسی طرح کرتے ہیں اور اس کے بدلے میں ان کے مالکان ان کا خیال رکھ سکتے ہیں۔ اس سے محبت تو نہیں کر سکتے۔ وہ بھی ایسی محبت جو ایک انسان دوسرے انسان سے کرتا ہے۔ اس لیے سلمان نے صنوبر کی بے رخی یا عدم توجہی کو دل کا روگ نہیں بنایا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے میں چلا گیا۔ سلمان نے دیکھا کہ صنوبر اپنے بستر پر لیٹی ہوئی جیسے خلا میں کچھ تلاش کر رہی تھی لیکن یہاں سے تو نیلا آسمان بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا تو خلا کیسے دکھائی دیتا۔ اس کا مطلب ہے وہ صرف سوچ رہی ہے۔ نہ ہی آسمان، نہ ہی خلا اور نہ ہی اس کمرے پر پڑی ہوئی چھت...... وہ کسی کو بھی دیکھ رہی ہے اور نہ دیکھنا چاہتی ہے۔

سلمان کو اس کی یہ حالت دیکھ کر ایسا شدید دکھ پہنچا جس کا بیان بھی یہاں ممکن نہیں ہے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ابھی کے ابھی انسانی روپ اختیار کر لے اور صنوبر سے پوچھے کہ وہ کیا سوچ رہی ہے؟ اسے کیا روگ ہے، جو اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی شادابی دونوں کو نگل رہا ہے۔ وہ کس کے غم میں اس طرح نڈھال اور سوچوں میں غرق رہتی ہے۔

''کہیں وہ کسی سے محبت تو نہیں کرتی اور جس سے وہ محبت کرتی ہے اس نے اسے دھوکا دیا ہو یا اس کے ساتھ بے وفائی کی ہو؟ سلمان کو پہلی بار یہ خیال آیا اور وہ سوچنے لگا کہ اگر ایسا ہے اس کا دل پہلے سے ہی گرفتارِ عشق و محبت ہے تو پھر اس کی تو ساری محنت اور ریاضت اور محبت رائیگاں چلی جائے گی۔ وہ اگر کسی اور سے محبت کرتی ہے تو پھر اس سے کیونکر محبت کرے گی۔ ایک لڑکی ایک وقت میں ایک ہی مرد سے محبت کرتی ہے یا کر سکتی ہے اور بعض لڑکیاں تو ایسی بھی ہوتی ہیں جو ساری زندگی ایک ہی مرد کی محبت میں گزار دیتی ہیں۔ یااللہ! صنوبر کے ساتھ ایسا مت ہونے دینا۔ ایسا ہوا تو میں تو جیتے جی مر جاؤں گا۔ میں اس کے بغیر اب زندگی کا کوئی تصور نہیں کر سکتا۔ اس کے دل میں صرف میری ہی محبت ہونی چاہیے۔ لیکن کیسے؟ میں تو اس منحوس بلے کے وجود میں قید ہوں۔ جب تک وہ مجھے دیکھ نہیں لیتی، مجھ سے مل نہیں لیتی، اسے مجھ سے محبت کیسے ہو سکتی ہے؟ اسی طرح کی باتیں سوچتے ہوئے سلمان اسے مسلسل دیکھتا رہا اور صنوبر کو اس کے کمرے میں موجود ہونے کی خبر تک نہیں ہوئی۔ وہ تو اپنے ہی خیالوں میں گم تھی اور سلمان کو اس کا اس طرح کسی اور کے خیالوں میں کھوئے رہنا ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔ وہ اسے اس دلسوز خیال سے فوری طور پر باہر لانا چاہتا تھا اور ایسا کرنے کے لیے اس کے پاس ایک ہی طریقہ تھا اور اس نے اس طریقے پر فوراً سے پیشتر عمل کر دیا۔ ایک ہلکی سی میاؤں اس کے حلق سے خارج

آفس جا کر تو انھیں یہ گھر یاد ہی نہیں رہتا تو فون کرنا کیسے یاد رہ سکتا ہے" ماں نے تاسف اور اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ صنوبر کو اپنی غلطی کا اندازہ ہو چکا تھا اور وہ اب ماں کی باقی دکھ بھری داستان سننے کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔

"تم جانتی ہو اس آدمی نے مجھ سے مجبوراً شادی کی تھی اور شادی کر کے یہ مجھے بھول ہی گیا کہ میں اس کی کچھ لگتی ہوں۔ اسی لیے میں سارا وقت گھر میں رہتی ہوں، اکیلی، اس پلنے کے ساتھ۔ باہر جاؤں تو سب ہی عورتیں مجھ سے سوال کرتی ہیں کہ میرا شوہر میرے ساتھ کہیں آتا جاتا کیوں نہیں ہے۔ میں تو اُس دن کو کوستی ہوں جب میں اس کے حسن جمال پر مرمٹی تھی اور شادی کے لیے جھٹ سے ہاں کر دی تھی، بنا کچھ بھی سوچے اور کچھ بھی جانے۔"

"اب ایسے تو نہ کہیں ماما۔ اگر پاپا نے آپ سے کبھی پیار ہی نہیں کیا تو ہم دو بچے کیسے آپ کی زندگی میں آ گئے؟" صنوبر نے جیسے ماں سے اختلاف کرتے ہوئے بات کو طول دینے کا غیر ارادی سلسلہ جاری رکھنا چاہا۔

"یہ تم ابھی نہیں سمجھ سکو گی۔ جیسے پیٹ میں بھوک لگتی ہے ایسے ہی ایک بھوک اور ہوتی ہے۔ اسے بھی مٹانا پڑتا ہے۔ بس وہ ہی بھوک تھی جو تمہارے باپ نے مجھ سے مٹائی اور نتیجے میں تم دونوں دنیا میں آ گئے۔ اسے محبت نہیں کہتے۔" درشہوار رونے جیسی ہو گئی۔

"اچھا نا ممی ہم تو بس یونہی بات کر رہے ہیں۔ آپ کی یہ ذود رنجی (اس نے انگلش میں اوور سینٹی مینٹس) کہا تھا ہم آپ کی آسانی کے لیے ہمیشہ اردو میں ہی ساری بات کریں گے) ٹھیک نہیں ہے۔ یوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر رنجیدہ ہونا کوئی اچھا لگتا ہے۔ بات کرنے سے دل ہلکا ہو جاتا ہے اور میں یہی کوشش کر رہی ہوں۔" صنوبر جیسے ایک ہی پل میں اپنی ماں کی دوست بن گئی۔

"کیا آپ مجھ سے اپنا دکھ شیئر نہیں کر سکتیں۔ ایسا کرنے سے آپ کا دل جو ہر وقت آنسوؤں کے بوجھ سے بھرا رہتا ہے اس میں کچھ کمی آسکتی ہے۔ آپ کا غم کم ہو سکتا ہے۔ آپ مسکرانا سیکھ سکتی ہیں۔ آپ کو تو شاید یہ یاد بھی نہیں کہ آپ کی مسکراہٹ کتنی خوبصورت ہے۔" پتا نہیں کتنے دن بعد بیٹی کے منہ سے ایسی باتیں درشہوار نے سنی تھیں اور اسے یہ سب سن کر جیسے گھڑوں حوصلہ ملا۔ اس نے محبت سے بھرپور نظروں کے ساتھ صنوبر کو دیکھا اور محبت سے بولی۔

"تھینک یُو مائی چائلڈ... تھینک یُو سو مچ۔" صنوبر جو پہلے ہی کھانا چھوڑ چکی تھی اس نے ماں کو خود سے لگایا تو لمس نے وہ کام کر دکھایا جو صنوبر چاہتی تھی۔ ماں کی آنکھوں سے شاید وہ آنسو دھار و دھار بہہ نکلے جو پتا نہیں اس نے کب سے روک کے رکھے ہوئے تھے۔

"ممی میں ہوں نا آپ کے پاس اور سلمان بھی ہے" سلمان کا نام سنتے ہی بلا اپنی محویت سے چونکا لیکن پھر اسے یاد آیا کہ بدقسمتی سے اس گھر میں تو ایک اور سلمان بھی ہے، جو صنوبر کا بھائی ہے۔

"جانتی ہوں بیٹے لیکن کسی کو میری پروا ہے نہ فکر ہے۔ آج تم نے مجھ سے بات کی ہے تو میں سوچ رہی ہوں کتنا عرصہ ہوا جب سلمان نے تو مجھ سے کام کی باتوں کے علاوہ کوئی بات تک نہیں کی۔ پتا نہیں وہ کن چکروں میں رہتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ ڈرگ لیتا ہے اور یہ عادت اسے کسی اوباش دوست کی طرف سے تحفے میں ملی ہے۔ لیکن میں اسے کچھ اس لیے نہیں کہتی کہ تمہارے پاپا کی طرح اگر اس نے بھی مجھے جھڑک دیا تو میں کیا کروں گی۔ مجھ سے اور بے عزتی سہی نہیں جا سکے گی میری جان۔" درشہوار جیسے آج سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی اور سلمان کو یہ سب سن کر جتنا افسوس ہو رہا تھا اتنا ہی اچھا بھی لگ رہا تھا کہ وہ اس گھر کے لوگوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا اور آج اس کی یہ خواہش پوری ہو رہی تھی۔ اسے یہاں اجنبیوں کی طرح رہنے والے لوگوں کی کہانی کے بارے میں پتا چل رہا تھا اور ایک بات وہ فی الفور سمجھ گیا کہ محبت اور پیار کی کمی کا شکار یہ گھر اور یہاں رہنے والے دنیا کی ہر نعمت کے ہونے کے باوجود کس قدر تنہا اور قلاش تھے۔

"آپ ٹھیک نہیں سوچتیں ماما! آپ کو کوئی نہیں جھڑکے گا۔ پاپا کی بے رخی کا عکس اپنے بچوں میں تلاش کرنا ختم کیجیے ہم آپ کے بچے ہیں اور آپ ہماری ماں ہیں۔ ہم آپ کو کیسے جھڑک سکتے ہیں۔ ایک رشتے سے ملنے والی محرومی کو باقی رشتوں کی پہچان سمجھ لینا آپ کی نادانی ہے ممی۔ آپ ہمیشہ پاپا کی محبت کی محرومی سے اس قدر متاثر ہوتی رہی ہیں کہ آپ کو

اپنے بچے بھی کبھی دکھائی نہیں دیے، نہ آپ نے انھیں اپنا سمجھا نہ ہمیں پیار دیا اور نہ اپنا حق جتایا۔ جو پیار دیتا ہے اسے حق جتانا بھی خود بخود آجاتا ہے۔ آپ پیار دے کر تو دیکھیے، آپ کا حق اپنے آپ ہی آپ کو ملنے لگے گا۔ اب بھی دیر نہیں ہوئی ہے ماما۔ اپنے بچوں کو آپ اپنا سمجھیں، ایسا مت سوچیں کہ یہ پاپا کی کسی ضرورت یا بھوک کا نتیجہ ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جو بے اولاد ہیں تو کیا سب کو ان کی بھوک مٹانے سے بچے مل جاتے ہیں؟ نہیں نا..... یہ تو قدرت کا انعام اور تحفہ ہے جو آپ کو پاپا کے ساتھ کی وجہ سے ملا ہے اور آپ اسے اپنا سمجھنے تک سے کترا تی رہی ہیں۔"

صنوبر کی باتیں سن کر جتنا متاثر اس کی ماں ہوئی تھی اس سے بھی زیادہ سلمان کو ان باتوں نے اپنا اسیر بنا لیا وہ اس لڑکی کی ذہانت اور احساس کا گرویدہ ہو گیا۔ واقعی صنوبر تم دنیا میں ایک نایاب اور قیمتی انسان ہو۔ پتا نہیں تم اور کیا کیا ہو.....اس نے سوچا اور اپنی محویت سے نکل کر درشہوار کو دیکھا تو وہ منظر اس کی آنکھوں میں بھی پانی بھر لایا ماں اپنی بیٹی سے بے تحاشا اور بے اختیار پیار کر رہی تھی۔

"مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا میری بیٹی اتنی بڑی ہو چکی ہے اور اتنی سمجھدار کہ وہ مجھے بھی راستا دکھا سکتی ہے" درشہوار نے صنوبر کے ماتھے پر پیار کیا اور پھر دونوں ماں بیٹیاں وہاں سے اٹھ کر لان کے اس حصے میں آکر بیٹھ گئیں جہاں درختوں نے اب بھی سایا کر رکھا تھا ویسے بھی آج سورج کو بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا اور دھوپ گہرے بادلوں میں کہیں چھپ کے لیٹی ہوئی تھی۔ موسم خوشگوار تھا اور ہلکی ٹھنڈی ہوا دھیرے دھیرے ایسے چل رہی تھی جیسے اس کے پیروں میں کسی نے پازیب باندھ رکھی ہو۔ چلتی تو نغمے سے اس کی چال میں سنائی دیتے۔ سلمان بھی ان کے پیچھے پیچھے وہیں چلا آیا تھا اور اس وقت سلمان کیا کر رہا تھا، کہاں جا رہا تھا، اور کہاں سے آرہا تھا، صنوبر اور اس کی ماں دونوں کو اس بات کا احساس تھا نہ خیال ...درشہوار کے مرجھائے ہوئے چہرے پر یکایک ایسی تازگی اور بہار کھل اٹھی تھی کہ اس کا چہرہ کھلتا ہوا گلاب معلوم ہو رہا تھا۔ ویسے بھی عمر کے اعتبار سے وہ کوئی ایسی عمر رسیدہ بھی نہیں تھی اچھی خاصی جوان دکھائی دیتی تھی تاہم یہ حقیقت سب کو ماننا پڑتی تھی کہ درشہوار کا شوہر اس کے مقابلے میں ایک ناقابل بیان حسن و رعنائی کا شہکار تھا۔ مردوں میں ایسے حسین مرد لاکھوں کروڑوں میں بھی مشکل سے دیکھنے میں آتے ہیں اور آصف کریم ایک ایسا ہی حسین مرد تھا۔

"ماما انسان کو ضروری نہیں ہے کہ اپنے سب رشتوں میں محبت ملے۔ کئی بار ایسا نہیں بھی ہوتا۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ دنیا کا حسین ترین آدمی آپ کا شوہر ہے اور یہ افتخار تو آپ کے حلقے کی کسی بھی عورت کو حاصل نہیں ہے۔ سچ کہوں تو وہ لوگ آپ سے جیلسی میں اس قسم کی باتیں کرتی ہیں جن سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے آپ ان باتوں پر اگر مختلف ردعمل ظاہر کریں گی تو وہ ایسی باتیں کرنا چھوڑ دیں گی" صنوبر شاید آج اپنی ماں کی اوور ہالنگ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی تا کہ اس گھر میں بھی مدتوں سے تنی کھڑی ہوئی ٹینشن کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا جائے۔

"مجھے کیا کرنا چاہیے بیٹے!" درشہوار جیسے جان بوجھ کر یہ بھول جانا چاہتی تھی کہ صنوبر اس کی بیٹی ہے۔ یوں بھی آج اسے اپنی بیٹی دنیا کی سب سے زیادہ عقلمند انسان دکھائی دے رہی تھی۔ سلمٰی کو بھی یوں ماں اور بیٹی کا ایک دوسرے سے قریب ہونا اور پاس بیٹھنا، باتیں کرنا اتنا اچھا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ توقع سے جلدی ان کے لیے چائے لے آئی۔ میز کی سطح پر چائے رکھتے ہوئے جب سلمٰی نے ہولے سے 'چائے' کہا تو دونوں نے بس اسے ایک اچٹتی سی نظر سے دیکھا اور صنوبر نے اپنی بات جاری رکھی۔

"آپ سے جب بھی کوئی پاپا کے بارے میں پوچھے یا طنز کرے تو آپ مسکرا کر کہا کریں اتنے خوبصورت آدمی نے مجھے اپنا نام دیا ہے میرے لیے تو یہی بہت ہے۔ آپ بتائیے آپ کے شوہر کے پاس کیا ہے جو آپ کے پاس بتانے کو ہے یا پھر یہ کہ میں اپنے شوہر کو اس لیے اپنے ساتھ نہیں لاتی کیونکہ میری ساری فرینڈز اسی کو دیکھنے اور لائن مارنے لگتی ہیں اور میں نہیں چاہتی کہ کوئی اسے مجھ سے چھین کر لے جائے" اس بات کو سن کر درمیان سے ہی درشہوار کو زور کی ہنسی آگئی اور وہ پورے دل سے اس طرح ہنسنے لگی کہ صنوبر کو اس کی طرف دیکھ کر بہت ہی اچھا لگا۔ ویسے بھی صنوبر ان سارے لمحوں میں اپنا دکھ بالکل ہی بھول چکی تھی۔

''یہ تم نے بہت ہی اچھا کہا'' درشہوار ہنستے ہوئے بولی۔
''پاپا کی بے رخی کو اپنی کمزوری نہیں اپنی طاقت بنائیے ماما۔ پھر دیکھیے آپ کو جینے میں کیسا مزا آنے لگتا ہے۔ ویسے ایک بات کہوں۔'' بولتے بولتے اچانک ہی صنوبر کو کوئی خیال آیا ''اگر آپ غور کریں تو پاپا نے بھی اپنے عہد کو نبھا دیا ہے جو انھوں نے آپ سے شادی کرتے وقت کیا تھا۔ ورنہ پاپا سے شادی کر کے آپ جتنا عدم تحفظ کا شکار رہ چکی ہیں، کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ خدانخواستہ آپ کو چھوڑ کر کسی اور عورت کے پاس چلے جاتے بلکہ اس یوسف ثانی کا کسی بھی عورت کے پاس ٹھہر جانا، اُس عورت کا بہت بڑا کمال ہے۔ یہ تو آپ کی وہ خوبی ہے جو آپ کو سب عورتوں سے زیادہ ممتاز بناتی ہے۔ ذرا سوچیے پاپا کے لیے یہ ممکن نہیں تھا اور میں تو کہتی ہوں پاپا کو تو اب بھی پتا نہیں کتنی ہی عورتیں لائن مارتی ہوں گی۔'' صنوبر کی بات غور اور توجہ سے سنتی ہوئی اس کی ماں نے اس ایک بات پر چونک کر پہلو بدلا۔
''کیا پتا بیٹے ایسا ہو.... وہ پرائی عورتوں کے پاس جاتا ہو۔ اس کے تعلقات ہوں غیر عورتوں سے۔'' درشہوار کی شکی طبیعت اور وہم عود کر آیا تھا اور اس کی آنکھوں میں کچھ دیر پہلے جو مسکراہٹ کھیل رہی تھی اب اس کی جگہ ایک نامعلوم خوف اور تشویش نے لے لی تھی۔
''اول تو ایسا کچھ نہیں ہے.... یہ محض آپ کا وہم ہے اور کچھ نہیں اور اگر ایسا ہے بھی تو آپ یہ کیوں بھولتی ہیں کہ انھوں نے بیوی ہونے کا جو فخر آپ کو دیا ہوا ہے یہ حق دنیا میں اور کسی عورت کے پاس نہیں ہے۔ سچ ماما اگر آپ کی جگہ میں ہوتی تو میں تو خود کو دنیا کی سب سے خوش قسمت انسان سمجھتی لیکن ایسا لگتا ہے جیسے میں آپ کی طرح خوش قسمت نہیں ہوں'' گفتگو کے اس حصے میں جانے کیسے ایکا ایکی صنوبر کا اپنا دکھ اس کی باتوں میں ابھر کے سامنے آ گیا۔ جیسے لہروں کے زیر و بم سے تہہ میں بیٹھی ہوئی کوئی چیز اچانک سطح آب پر آ جائے۔
درشہوار کو اپنی بیٹی کی باتیں بہت اچھی طرح سمجھ میں آ چکی تھیں اور اس نے آج سے نیا جیون جینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے زندگی کا مفہوم اور محبت کا چلن سب کچھ سمجھ آ گیا تھا اور اپنے سمجھنے کے تیز بہاؤ میں وہ اپنی بیٹی کے پل بھر کے لیے ابھرنے والے دکھ کو محسوس کرنے سے چُوک گئی اور یوں یہ ملاقات چائے کے بعد ایک ایسے احساس پر اختتام پذیر ہوئی جس میں اس گھر میں موجود کم سے کم ایک شخص کو تو جینا آ گیا تھا۔
سلمان سوچنے لگا کہ کاش اس لمحے میں درشہوار کو تھوڑا سا بھی خیال بیٹی کی کہی ہوئی اس بات پر آ جاتا کہ ماما میں آپ کی طرح خوش قسمت نہیں ہوں، تو وہ اس سے پوچھتی تو کہ صنوبر بیٹا آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہو..؟ کیا بات ہے؟ تمھیں اپنی بدقسمتی کا یہ ملال کیسے اور کہاں سے ملا ہے۔ ایسا ہو جاتا تو سلمان کو صنوبر کا دکھ معلوم ہو جاتا جو اسے جاننے میں دنیا کے ہر معاملے سے زیادہ دلچسپی تھی۔
درشہوار خوشی خوشی ایک پہلے سے الگ اور مختلف راستے پر جینے نکل کھڑی ہوئی اور اس ایک بات سے سلمان کو یک گونہ سکون اور مسرت مل گئی کہ اب درشہوار پہلے کی طرح اس کا تعاقب نہیں کر رہی تھی اور وہ باآسانی صنوبر کے ساتھ رہ سکتا تھا۔
اور یہ بھی اس نے طے کر لیا کہ اب اس کا اس طرح بلا بنے رہنے سے اسے اپنا مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ وہ بھی اس حالت میں صنوبر کو یہ نہیں بتا سکے گا کہ وہ کون ہے اور اسے کتنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اسے کچھ اور کرنا ہوگا۔ اپنی محبت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے لیے اسے ایسا کرنا ہوگا جو انوکھا ہو اور جو اسے اس کی منزل کے قریب لا سکتا ہو۔ یہی سوچ کر وہ رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔
اس اثنا میں درشہوار کی ایک بالکل مختلف ملاقات اپنے بیٹے سلمان سے بھی ہوئی شام ہونے کے قریب تھی جب سلمان اپنی گاڑی میں گھر لوٹا۔ صنوبر اپنے کمرے میں تصویروں کو پھر سے دیکھ رہی تھی اور کچھ نئے اسکیچ بنا رہی تھی جب اسے ماما اور سلمان کے اونچی آوازوں میں باتیں کرنے کا احساس ہوا لیکن اس نے یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہ لی کہ ان دونوں کے بیچ میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ وہ بدستور اپنے کام میں لگی رہی لیکن جن سلمان کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس گفتگو کو جاننے کی ضرورت کا احساس ہوا اور وہ وہاں پہنچ گیا جہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ ہر روز نہایت بے ترتیبی سے اٹا ہوا سلمان کا

کمرا آج اس قدر صاف اور سلیقے سے مرتب کیا ہوا دکھائی دے رہا تھا کہ کمرے میں داخل ہونے کے بعد خود اسے پہلی نظر میں یہ یقین نہیں آیا کہ یہ اسی کا کمرا ہے اسے لگا کہ کہیں وہ غلطی سے تو اس کمرے میں نہیں آ گیا اور یہ کسی اور کا کمرا ہو لیکن کچھ ہی دیر میں اپنی سب چیزوں کو اس نے پہچان لیا اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ اسی کا کمرا ہے۔ ایک نامعلوم تجسس میں اس نے اپنی الماری کھولی تو اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اسے ایک ہی لمحے میں اتنی زور سے غصہ آیا کہ اس کی رگیں تک سلگ اٹھیں۔ اس کی ساری ڈرگ اور شراب کی بوتل سب کچھ اپنی جگہ سے غائب تھا۔ اسی غصے کے عالم میں اس نے کمرے کے باقی حصوں میں اپنی ان چیزوں کو تلاش کیا اور یہ تلاش ایک ایسی دیوانگی لیے ہوئے تھی کہ منٹوں میں سلمان نے اس بے حد نفاست سے صاف کیے گئے ترتیب شدہ کمرے کو پھر سے کچرے کے ڈھیر میں بدل ڈالا۔ اس نے اپنے سب کپڑے نکال نکال کر زمین پر پٹخ دیے اور اپنی سب قرینے سے رکھی ہوئی چیزوں کو تتر بتر کر ڈالا اور جب ہر چیز، ہر کونا دیکھنے کے بعد بھی اسے اپنی مطلوبہ چیزیں نہیں ملیں تو اس نے حلق پھاڑ کے سلمٰی کو آواز دی لیکن سلمٰی کو آج در شہوار نے وقت سے پہلے ہی رخصت کر دیا تھا کیونکہ وہ خود بہت سے اسے کاموں کو کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی جو آج سے پہلے سلمٰی کی ذمہ داری ہوا کرتے تھے۔ سلمٰی یہ وسوسہ دل میں لیے رخصت ہو گئی کہ پتا نہیں کام کم ہو جانے کے بعد بیگم صاحبہ اس کی تنخواہ میں کوئی کمی تو نہیں کر دیں گی لیکن اسے فوری طور پر بیگم صاحبہ سے پوچھنا اچھا نہیں معلوم ہوا۔ اور وہ ان کے چھٹی دینے پر خاموشی سے چلی گئی۔

سلمٰی کے نام کی آواز سن کر خلاف توقع سلمان کو سلمٰی کی جگہ اپنی ماں کو دیکھنا نصیب ہوا تو اسے اور بھی حیرانی ہوئی اور وہ انہیں دیکھتے ہی شکایتی لہجے میں بولا۔

"دیکھیے ناں مما سلمٰی نے میری سب چیزوں کو ادھر سے اُدھر کر دیا ہے کوئی چیز اپنی جگہ موجود نہیں ہے۔ اس سے میں نے کتنی بار کہا ہے کہ وہ میرے کمرے کی چیزوں کو نہ چھیڑا کرے لیکن وہ باز ہی نہیں آتی اور اب ایسے کانوں کو بند کر کے بیٹھی ہوئی ہے کہ سن بھی نہیں رہی ہے.... آخر یہ ہے کہاں! میں آج اس کی طبیعت ٹھیک کر کے رکھ دوں گا۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے سے جانے لگا تو در شہوار نے اسے روکا۔

"سلمٰی جا چکی ہے۔ وہ گھر میں نہیں ہے بیٹے۔" سلمان کو ایک شاک سا لگا۔

"چلی گئی اتنی جلدی!! مگر کیوں؟ وہ تو رات کو دس بجے کے بعد جاتی ہے۔ آج اتنی جلدی کیوں چلی گئی؟"

"اسے میں نے بھیجا ہے اور مجھے بتاؤ تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟" در شہوار نے اطمینان سے کہا۔

"آپ کو کیا معلوم ہوگا۔ صفائی تو وہ ہی کرتی ہے تو آپ کیسے بتا سکتی ہیں؟" سلمان نے الجھتے ہوئے کہا۔ غصے اور طیش میں بھی وہ اس بدلی ہوئی صورت حال کو لاشعوری طور پر محسوس کر رہا تھا کہ آج اس کی ماں اس طرح اس وقت اس کے کمرے میں موجود ہے۔ تو کیوں؟

"نہیں آج اس کمرے کی صفائی میں نے کی ہے!" در شہوار نے کہا تو سلمان کو لگا جیسے اس کے سر پر کوئی بم پھٹا ہو۔ وہ جیسے حیرت کے سمندر میں ڈوبنے لگا۔

"آپ نے صفائی کی ہے مگر کیوں ماما؟" وہ اپنی حیرت کو شاک سے بچانا چاہتا تھا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج دنیا میں ایسا کیا ہوا ہے جو اس کی ماں ایسی دیوانوں جیسی باتیں کر رہی ہے۔

"اب سے تمہارے کمرے کی صفائی میں ہی کیا کروں گی۔ میں نے سوچ لیا ہے اور جن چیزوں کی تمہیں تلاش ہے وہ سب میں نے پھینک دی ہیں" در شہوار کا اطمینان اپنی جگہ پر قائم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے جسم میں کسی نئی روح نے جنم لے لیا ہو۔

"لیکن کیوں ماما! ایسا کیا ہوا جو آپ نے میری زندگی میں مداخلت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ اچانک آپ کو کوئی نیا دورہ پڑا ہے جو آپ مجھے ٹیس کر رہی ہیں؟"

"تم کچھ بھی کہو مگر میں اب یہ فیصلہ کر چکی ہوں کہ اپنے بچوں کے سب کام اپنے ہاتھوں سے کروں گی اور مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میرے بچوں کی زندگی میں کیا کچھ چل رہا ہے۔ وہ کیا کر رہے ہیں۔ کس سے مل رہے ہیں اور کیوں مل رہے

ہیں۔ سب کچھ.... ایسی سب ہی سرگرمیوں کو میں روکنا چاہوں گی جن سے میرے کسی بھی بچے کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہو، اسی لیے میں نے تمہاری ساری ڈرگز ضائع کر دی ہیں۔" درشہوار کو جس ردعمل کی توقع تھی وہی اس کے سامنے آیا۔ سلمان جیسے اس کی چھاتی پر چڑھ کے بولا" آپ کا دماغ خراب ہوا ہے۔ میں آپ کو ایسا کچھ نہیں کرنے دوں گا اور یہ جو آپ کو ماں بننے کا اچانک سے خیال آیا ہے یہ سب فضول اور بے کار ہے۔ مجھے آپ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں جو آپ میری زندگی کو کنٹرول کرنے کا سوچ رہی ہیں۔ میں آپ کو یہ اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔ سمجھ گئیں آپ۔" سلمان اس کے اوپر اس طرح چڑھا جا رہا تھا کہ درشہوار کو بیڈ کی سائڈ پر پیچھے کی طرف جھکنا پڑا، نہایت مستعدی سے اس منظر کو دیکھنے والا بلا فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر سلمان نے اپنی ماں کی شان میں کوئی ایسی گستاخی کی جو نا قابل برداشت ہوئی تو وہ سلمان پر حملہ کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں کرے گا۔ اس سرکش اور از حد بدتمیز لڑکے کی کمینگی بڑھتی جا رہی تھی۔ درشہوار نے کسی قدر ڈرتے ہوئے اپنی ممتا کے جذبے کو کام میں لاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا یہ سب کچھ تمہارے لیے اچھا نہیں ہے۔ اس سے تمہاری زندگی تباہ ہو جائے گی اس لیے....."

ابھی درشہوار کی بات جاری ہی تھی کہ نا خلف لڑکے نے اسے ایک زور کا دھکا دیا اور وہ بستر پر اس طرح گری کہ اس کی کمر میں چوٹ لگ گئی اور وہ درد کراہنے لگی۔ اب بلے کے لیے مزید برداشت کرنا ناممکن تھا اس لیے اس نے پلک جھپکتے میں سلمان پر حملہ کر دیا۔ سلمان اس حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ وہ ایک دم سے ہکا بکا رہ گیا اور سنبھلنے کی کوشش میں زمین بوس ہو گیا۔ بلا اس پر غرانے لگا۔ اس کی غراہٹ شیر کی غراہٹ سے ملتی جلتی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر سلمان کے ساتھ ساتھ خود درشہوار بھی حیرت سے ششدر رہ گئی۔ وہ کسی بلی کے بارے میں ایسے سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کسی انسان کو یوں ڈرا سکتی ہے اور اس پر حملہ کر سکتی ہے۔ سلمان کا ڈر کے مارے دم حلق میں آ چکا تھا اور وہ زمین پر پڑے پڑے اپنی گردن پر لگنے والی کھرونچوں کی تکلیف سے بے حال ہو رہا تھا۔ اس نے غصے میں اٹھنے کی کوشش کی اور بولا۔

"میں اس حرامی بلے کو ابھی شوٹ کر دوں گا۔ اس کی یہ مجال...." ابھی سلمان اٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ بلے نے اس پر پھر اپنے اگلے پنجوں سے ایک اور حملہ کیا اور اس بار سلمان کی شرٹ تار تار ہو گئی اور اس کے پیٹ پر ایسا زخم آیا کہ وہ تکلیف سے چلانے لگا۔ درشہوار نے یہ منظر دیکھا تو اس سے رہا نہیں گیا اور وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"نہیں... نہیں ٹینو ایسا مت کرو۔ یہ میرا بیٹا ہے.... پلیز اسے چھوڑ دو۔"

اتنا سن کر جیسے صنوبر سے بھی اپنے کمرے میں رہا نہیں گیا اور وہ جلدی سے سلمان کے کمرے میں پہنچی اور وہاں پہنچ کر اس نے جو منظر دیکھا تو مارے دہشت کے اس کی چیخ نکل گئی۔ چیخ سن کر جن سلمان کو ایک دم ہوش آ گیا اور اس کے منہ سے نکلنے والی غراہٹ یکا یک تھم گئی۔ وہ خاموشی سے کمرے سے چلا گیا تو درشہوار نے جلدی سے اپنے بیٹے سلمان کو دیکھا جو تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو چکا تھا۔ صنوبر بھی ماں کے قریب آ کے بیٹھ گئی اور اپنے بھائی سلمان کو دیکھنے اور اس چھو کر دیکھنے لگی کہ وہ زندہ ہے یا کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔

"یہ سب کیسے ہوا ماما! کس نے کیا؟ سلمان کو اس طرح؟" درشہوار نے بیٹی کے سوالوں کو مزید بڑھنے سے روکتے ہوئے کہا۔

"صنوبر یہ وقت یہ جاننے کا نہیں ہے کہ یہ سب کیسے ہوا اور کس نے کیا۔ تم جلدی سے ایمبولینس سروس کو فون کرو۔ اسے ہوسپٹل لے جانا ہوگا۔" یہ سنتے ہی صنوبر جلدی سے اپنے کمرے میں بھاگی اور ایمبولینس سروس کو گھبرائی ہوئی آواز میں فون کرتے ہوئے اس نے جلدی سے پہنچنے کو کہا۔ وہ فون کر کے پھر کمرے میں آئی جہاں اس کی ماں عجیب بے حال سی اپنے بے ہوش بیٹے سلمان کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں ہزاروں سوالوں نے اُدھم مچایا ہوا تھا۔ اسے جہاں بلے کی اس حرکت پر حیرانی تھی وہیں اس کا ذہن یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ ایک بلا اتنا طاقت ور کیسے ہو سکتا ہے اور اتنا ویل ٹرینڈ کہ اس کی مالکن کو اس کے اپنے بیٹے نے ہرٹ کرنے کی کوشش کی تو بلے سے یہ برداشت نہیں ہوا، اور اس نے اس کے بیٹے کو ہی زخمی کر دیا۔ اسے یاد آنے لگا کہ بلے کی آواز کسی شیر کی غراہٹ اور دھاڑ سے کم نہیں تھی۔ اس وقت تو اس نے یہ نہیں سوچا تھا مگر اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ یہ بلا کوئی معمولی بلا نہیں ہے۔ ورنہ بلوں اور بلیوں کی آواز ایسی تو کبھی

نہیں ہوتی۔ صنوبر ماں کو غمزدہ دیکھ کر خاموش تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی سوال تھے اور وہ بری طرح ڈری ہوئی تھی۔ آج ہی اس نے اپنی ماں کو تبدیلی کا سبق پڑھایا تھا اور وہ یہ دیکھ کر مطمئن تھی کہ اس کی ماں کے چہرے میں کھوئی چمک دمک، واپس آ رہی ہے۔ وہ پھر سے زندگی کی طرف لوٹ رہی ہے اور پھر کسی قدر مطمئن ہو کر صنوبر اپنے اسکیچ کے کام میں جت گئی تھی۔ ویسے بھی وہ کتنے ہی دنوں سے اسائنمنٹ کو کرنے کا سوچ رہی تھی مگر اس کا دل کسی کام میں لگ ہی نہیں رہا تھا اور جب ایک طرف سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد اس نے کام کرنا چاہا تو یہ اچانک جانے کیا ہو گیا تھا۔ سلمان کو کس نے اس طرح زخمی کیا تھا۔ اس کی ماں ایک پڑھی لکھی اور سمجھدار عورت تھی۔ وہ اپنے بیٹے سے اس طرح جنگی انداز میں نہیں لڑ سکتی تھی کہ اسے اس بری طرح زخمی کر دے تو پھر کیا ہوا تھا۔ یہ سب کس نے کیا تھا۔ اس کے ذہن میں سوالات گردش کرتے رہے۔ ہلچل مچاتے رہے اور پھر اس کی سماعت میں ایمبولینس کے سائرن کی آواز گونجی.....

☆......☆......☆

ہوسپٹل پہنچ کر جب صنوبر نے اپنے پاپا آصف کریم کو فون کرنے کا کہا تو درشہوار نے صنوبر کو روکا اور بولی۔

''ابھی رک جاؤ! سلمان کا ٹریٹ منٹ ہو جانے دو پھر جو بات میں تمہیں بتاؤں گی اسے سننے کے بعد فیصلہ کرنا کہ اپنے پاپا کو بتانا ہے تو کیسے بتانا ہے۔ یہ اتنی بڑی بات ان سے چھپائی تو نہیں جا سکتی لیکن کچھ دیر کا صبر کر لو۔'' درشہوار کی بات سن کر صنوبر ایک عجیب سی کشمکش میں پڑ گئی کہ آخر بات کیا ہے۔

''ماما آپ کسی اور بات کو لے کر پریشان ہیں؟'' صنوبر نے پوچھا تو درشہوار نے ساری بات بتانے کے بعد کہا۔

''مجھے ڈر ہے کہ تمہارے پاپا اس بلے کو کہیں جان سے نہ مار دیں!'' صنوبر جواب تک اس سارے واقعے کے اچنبھے سے نکلی نہیں تھی یہ سن کر اور بھی پریشان ہو گئی۔ ایک طرف بلے کی یہ حرکت ان دونوں کی حیرت کا باعث تھی تو دوسری طرف وہ دونوں ہی یہ سوچنے لگیں کہ یہ بلا تو بہت سمجھدار اور بہادر ہے۔ تاہم اس کی سلمان کو زخمی کرنے والی حرکت کا سوچ کر وہ پریشان بھی ہو رہی تھیں کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے اس واقعے کے بعد بھی وہ اسی طرح خونخوار بنا رہے اور گھر کے دوسرے لوگوں کو بھی اس سے نقصان پہنچے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد صنوبر نے اپنی ماں سے پوچھا۔

''آپ کیا چاہتی ہیں۔ کیا پاپا کو یہ بات نہ بتائی جائے اگر ان سے یہ بات چھپالی گئی تو انھیں سلمان کے زخمی ہونے کی کیا وجہ بتائی جائے؟'' درشہوار یہ سن کر مخمصے میں پڑ گئی۔ اسے بھی یہ تشویش لاحق ہو چکی تھی کہ بلا محض سلمان کی بدتمیزی کی سزا اسے دینے کے بعد نارمل اور پہلے جیسا ہو جائے گا یا وہ اس طرح کی حرکت بعد میں بھی کسی اور کے ساتھ کر سکتا ہے۔ فیصلہ کرنا بہت ہی دشوار تھا لیکن یہ بات اپنی جگہ اٹل تھی کہ دونوں خواتین بلے کو گھر سے نکالنے یا اسے جان سے مار دینے کے حق میں نہیں تھیں۔ ''کیوں نا ہم دونوں خاموش رہیں اور سلمان کو ہی بتانے دیں کہ اس کی یہ حالت کیسے اور کیوں ہوئی، کس نے کی!'' ماں کی یہ بات سن کر صنوبر کو کچھ اطمینان ہوا وہ بولی۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اگر پاپا نے پوچھا تو ہم کہہ دیں گے کہ یہ تو سلمان ہی بتا سکتا ہے۔ سلمان نے ہمیں کچھ نہیں بتایا کہ اس کی یہ حالت کیسے ہوئی۔'' اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد دونوں کے چہروں پر اطمینان دکھائی دینے لگا اور صنوبر نے اپنے باپ آصف کریم کو فون کر کے ہوسپٹل آنے کا کہہ دیا۔

☆......☆......☆

بلا گھر میں موجود تھا اور اس وقت بھی صنوبر کے کمرے کی کھڑکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے چینی دیکھی جا سکتی تھی۔ وہ بھی اپنے مستقبل کے بارے میں جاننے کے لیے شدید پریشانی اور اضطرابی کیفیت میں مبتلا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسے موقع پر جب وہ ناخلف اور سرکش لڑکا اپنی ماں کی بے عزتی اور توہین کر رہا تھا تو کیا اسے یہ سب ہونے دینا چاہیے تھا۔ اور اس معاملے سے خود کو لاتعلق رکھنا چاہیے تھا۔ کیا اس نے سلمان پر حملہ کر کے غلط کیا ہے اور اگر انھیں غلط معلوم ہوا تو وہ مجھے کیا سزا دے سکتے ہیں۔ کیا وہ مجھے اس گھر سے نکال دیں گے یا اس سے بھی بڑی کوئی سزا دے سکتے ہیں۔

بلے کی پریشانی دکھ میں بدل گئی اور اس نے دل میں کہا مجھے کوئی بھی سزا دے دی جائے میں سب سہہ لوں گا۔ پر خدارا مجھے

میری صنوبر سے دور نہ کیا جائے۔ لیکن اس کے دل کی یہ بات کوئی کیسے جان سکے گا اور وہ خود کہنے کے قابل نہیں ہے۔

کیا اوپر والا رحم دل خالق میرے کام نہیں آئے گا۔ اسے تو معلوم ہے کہ میں صنوبر کی خاطر، اس کی محبت میں مبتلا ہو کر کس قدر دکھ اور تکلیف اٹھا رہا ہوں۔ اوپر والے نے تو یہ دنیا بنائی ہے اور مجھے بھی اسی نے بنایا ہے۔ وہ میرے دل کا حال اچھی طرح جانتا ہے اور مجھے یقین ہے وہ میری مدد ضرور کرے گا۔ خود کو تسلی دے کر بلے نے جیسے اپنے دل میں ایک اطمینان محسوس کیا۔ معاً ایک نئی فکر نے اس کے وجود میں ہلچل مچادی اور وہ سوچنے لگا۔ اگر مجھے گھر سے نہ نکالا گیا تب بھی صنوبر کا بھائی سلمان میرا دشمن بن چکا ہے اور وہ مجھے اتنی آسانی سے اس گھر میں رہنے نہیں دے گا۔ لیکن یہ تو بعد کی بات ہے پہلے اس کے بارے میں ہونے والے فیصلے کا تو اسے پتا چلے۔ اسی بے چینی میں وہ کھڑکی پر ٹہلنے لگتا تھا۔

☆......☆......☆

آصف کریم صنوبر منہ سے سلمان کے زخمی ہونے اور ہوسپٹل میں داخل ہونے کا سن کر جیسے سناٹے میں آ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا بیٹا گھمنڈی ہے اور دوسروں کی بے عزتی کرنے میں بھی زیادہ وقت نہیں لگاتا۔ لیکن وہ کسی سے اس طرح الجھ سکتا ہے کہ اس کے نتیجے میں اسے ہوسپٹل میں داخل ہونا پڑے۔ یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا اور اب یہی سوچتا ہوا آصف کریم ہاسپٹل پہنچا۔

اس نے اپنی بیوی اور بیٹی کو ہوسپٹل کے کوریڈور میں لگی ایک بینچ پر بیٹھے دیکھا۔ وہ دونوں ہی چہروں سے پریشان لگ رہی تھیں۔ اس کے پہنچتے ہی صنوبر اس کی طرف بڑھی اور حسب توقع اس کا سوال سن کر ماں کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا تھا۔ کس سے جھگڑا ہوا ہے سلمان کا؟''

''ہم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اس نے ہمیں کچھ بتایا ہی نہیں۔'' درشہوار نے صنوبر کی طرف دیکھتے ہوئے یہ بات کہی۔

''کہاں ہے وہ؟'' آصف کریم نے پوچھا۔ اپنے بے پناہ خوبصورت شوہر کو پہلی بار اس قدر پریشان دیکھ کر درشہوار کو عجیب سی مسرت ہوئی لیکن ساتھ ہی اس نے دل میں سوچا اس حالت میں بھی اس آدمی کی خوبصورتی میں کوئی کمی نہیں واقع ہوئی بلکہ اس کا حسن کچھ اور نکھر کے سامنے آ رہا تھا۔ کچھ دیر تک تینوں کے درمیان خاموشی کی دیوار تنی رہی پھر ڈاکٹر نے انھیں آ کر بتایا کہ اب آپ سلمان سے مل سکتے ہیں۔ وہ ہوش میں آ چکا ہے۔

تینوں کمرے میں پہنچے تو سلمان نے اپنے باپ کو دیکھ کر ایک ڈرے ہوئے بچے کی طرح اپنے بازو وا کر دیے۔ آصف نے اسے سینے سے لگایا تو اس کے زخموں میں ہلکی سی تکلیف ہوئی وہ 'سی' کی ایک آواز نکال کر خاموش ہو گیا۔ صنوبر نے محسوس کیا کہ وہ اپنی ماں کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے کوئی ندامت یا پشیمانی تھی۔

''کیا ہوا تھا۔ کس نے کی تمہاری یہ حالت بیٹے؟'' آصف نے اس کے چہرے پر لگی ہوئی دوا اور اس کے سینے پر بندھی ہوئی پٹیوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس سوال کے لیے صنوبر اور درشہوار دونوں تیار تھیں اور ان دونوں کو ایک خوف محسوس ہوا کہ اب سلمان اپنے باپ کو پوری کہانی کچھ نمک مرچ لگا کر سنائے گا اور جواب میں آصف اپنا سارا غصہ درشہوار پر نکالے گا اور کہے گا اسی کو اس طرح بلیاں پالنے کا شوق ہے۔ لیکن سلمان کی بات سن کر دونوں خواتین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سلمان تو کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ اس کی بائیک پر کہیں جا رہا تھا اور بائیک کا ایکسیڈنٹ ہو گیا جس کی وجہ سے اسے اتنی خراشیں آئیں۔

''تمہیں اس طرح کی حرکتوں سے اجتناب کرنا چاہیے بیٹے۔ اب دیکھو تمہاری وجہ سے مجھے اپنے دفتر کے کتنے ضروری کام چھوڑ کے آنا پڑا ہے۔ ایسے دوستوں سے دور رہو جو اس قسم کی بے وقوفانہ حرکتیں کرتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر تمہیں کوئی اور سیریس چوٹ لگ جاتی تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ شکر ہے تمہاری کوئی ہڈی ڈیمج نہیں ہوئی ورنہ بہت نقصان ہو جاتا۔'' آصف کریم کی گفتگو کے دوران درشہوار اور صنوبر دونوں کو یک گونہ اطمینان ہوا اور فی الحال انھیں آصف کریم کے غصے اور ان سے کیے گئے۔ سوالوں سے نجات مل گئی تھی۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے سلمان کو ڈسچارج کرنے کی نوید سنائی۔ آصف کریم ڈاکٹر سے ملنے اور ضروری معلومات اور

ہوسپٹل کی ادائیگی کرنے کے لیے چلے گئے۔ان کے جاتے ہی سلمان بولا۔

''آپ یہ مت سمجھیں کہ میں نے اس منحوس پلے کو معاف کردیا ہے، جس نے میری یہ حالت کی ہے۔ میں نے پاپا سے اس لیے جھوٹ بولا کہ میں اسے خود سزا دینا چاہتا ہوں۔ میں اسے تڑپا تڑپا کے ماروں گا۔ دیکھ لیجیے گا آپ''

''مگر وہ تو ایک بے زبان جانور ہے سلمان۔تم نے ماما کے ساتھ جو زیادتی کی اسی کی وجہ سے اسے غصہ آگیا تھا۔ تمہیں پتا ہے نا وہ ماما کے کتنے قریب ہے۔وہ اسے ٹریننگ دے رہی ہیں اور آئندہ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ ماما اسے سمجھائیں گی کیوں ماما؟''صنوبر نے ماما سے اپنی بات کی تائید چاہی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہے صنوبر لیکن تمہیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔تم کبھی اس طرح کی بدتمیزی پھر کبھی نہیں کروگے۔آخر میں تمہاری ماں ہوں اور مجھے حق ہے تمہیں غلط کاموں سے روکنے کا'' درشہوار نے کنڈیشن کے ساتھ بیٹے سے اس کی مرضی معلوم کرنا چاہی۔

''آپ کچھ بھی کہیں، میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔اسے سزا ضرور ملے گی۔ جو کچھ اس نے میرے ساتھ کیا ہے، وہ میں کبھی معاف نہیں کرسکتا۔'' وہ رکا اور بولا۔''اور یہ اچانک آپ کو مڈل کلاس عورتوں کی طرح ماں بننے اور اپنے حق جتانے کا خیال کیوں ستانے لگا ہے؟''سلمان کی بات سن کر درشہوار نے کوئی جواب نہیں دیا اسے سلمان کی باتوں سے تکلیف پہنچ رہی تھی۔

''اچھا اب اس وقت خاموش ہوجاؤ اور تم نے پاپا سے جو جھوٹ بولا ہے اسے نبھاؤ۔ کہیں انھوں نے سن لیا تو ساری بات ہی بدل کے رہ جائے گی۔ باقی کی ساری بات گھر جاکے کریں گے۔''صنوبر کی بات سن کر سلمان نے اپنا منہ دوسری طرف کرلیا۔

''ٹھیک کہتا ہے یہ۔ میں شاید بہت دیر کرچکی ہوں اسے یہ بتانے میں کہ میں اس کی ماں ہوں اور یہ میرا بیٹا ہے۔'' درشہوار کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''آپ پریشان نہ ہوں ماما، دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہوجائے گا۔''صنوبر نے ماں کے قریب جاکر ان کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

جیسے ہی گھر کے مرکزی دروازے سے ایک گاڑی اندر داخل ہوئی تو کھڑکی پر بیٹھا ہوا بلا بے چینی سے اس طرف دیکھنے لگا اور اس نے دیکھا کہ گاڑی سے سلمان کے علاوہ اس کا باپ، صنوبر اور درشہوار بھی اترے تھے۔ چاروں گھر میں داخل ہوگئے لیکن بلا وہیں صنوبر کے کمرے میں ہی بیٹھا رہا اور اضطراری انداز میں ٹہلتا رہا۔ وہ اس وقت سلمان کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا لیکن اسے یہ جاننے کی بہت بے چینی تھی کہ آخر کیا ہوا ہے۔ سلمان نے اپنے باپ کو کیا بتایا ہے اور اس کے مقدر کا کیا فیصلہ کیا گیا ہے؟

سلمان کو اس کے کمرے میں لٹانے کے بعد آصف کریم نے صنوبر اور درشہوار سے کہا کہ اسے کچھ دیر آرام کرنے دینا چاہیے، رات کے کھانے پر اسے جگادیں گے تاکہ یہ کھانے کے بعد اپنی دوا کھاسکے۔'' دونوں خواتین نے خاموشی سے یہ بات مانی اور سلمان کو دیکھتے ہوئے کمرے سے چلی گئیں۔ ویسے بھی سلمان کو نیند کی دواؤں کے اثر سے اس وقت شدید نیند آرہی تھی۔

''پاپا آپ چائے پئیں گے؟''صنوبر نے پوچھا۔''نہیں ابھی نہیں کچھ دیر بعد۔'' آصف نے مختصر جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔صنوبر نے ماں کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا تو درشہوار صنوبر کے ساتھ ہی اس کے کمرے میں آگئی۔ دونوں کمرے میں داخل ہوئیں تو بلے کو ان کی آہٹ سے اندازہ ہوگیا کہ وہ اسی طرف آرہی ہیں۔ وہ جلدی سے بیڈ کے نیچے چلا گیا اور خاموشی سے بیٹھ گیا درشہوار کی آواز سن کر اس نے فوری طور پر اس کے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کردیا ورنہ وہ سب سے پہلے درشہوار کے سامنے آنا چاہتا تھا تاکہ اسے اپنے بارے میں ہوئے فیصلے کا ٹھیک ٹھیک معلوم ہوسکے۔

''اب آپ کیا کریں گی سلمان تو بلے کو اس گھر میں برداشت کرنے کو تیار ہی نہیں ہے۔'' سامنے پڑے صوفے پر دونوں بیٹھ گئیں۔

میرا خیال ہے اس بلے کو کچھ عرصے کے لیے کہیں اور بھیج دینا چاہیے'' درشہوار نے کہا۔

''لیکن کہاں اور یہ بات بڑا کیسے سمجھے گا کہ ہم اسے یہاں سے دور کہیں اور عارضی طور پر بھیج رہے ہیں؟''صنوبر نے کہا۔
''میں اصل میں اپنے آپ میں شرمندہ ہوتی رہوں گی اگر وہ یہاں سے چلا گیا تو.....اس لیے میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ مجھے اس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔اس نے جو کچھ بھی کیا میرے لیے کیا۔ورنہ سلمان تو جیسے مجھے جان سے ہی مار ڈالتا۔اس کا غصہ بالکل اپنے باپ جیسا ہے۔''
''ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا ورنہ سلمان اسے جان سے بھی مار سکتا ہے!''صنوبر کے لہجے میں چھپی ہوئی گہری تشویش جن سلمان کو صاف محسوس ہوئی۔اسے یہ جان کر اچھا لگا کہ صنوبر کو اس کی پرواہ ہے۔صنوبر کے اس کے بارے میں اس طرح سوچنے کا خیال ہی اسے ایک عجیب سی مسرت سے ہمکنار کر گیا اور اس نے سلمان کی دھمکی یا اسے نقصان پہنچانے والی بات سرے سے نظر انداز کر دی۔
''پتا نہیں اس وقت وہ کہاں ہے۔میں کہنا چاہتی ہوں کہ اسے کچھ دن تک یہاں تمہارے کمرے میں ہی چھپا لیا جائے۔خاص طور پر اس وقت جب سلمان گھر میں ہو۔ابھی دو چار دن تو ویسے بھی سلمان اپنے کمرے سے باہر نکلنے یا اسے سزا دینے کے بارے میں نہیں سوچے گا۔''درشہوار نے کہا۔بلّے کو اور کیا چاہیے تھا۔وہ تو رہنا ہی صنوبر کے ساتھ چاہتا تھا۔لیکن آج وہ ایک بہت بڑا اور خطرناک فیصلہ کر چکا تھا.....جس سے اس کی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی واقع ہونے والی تھی۔

☆.......☆.......☆

رات دھیرے دھیرے پھیل رہی تھی صنوبر کے گھر میں ایک ایسی خاموشی تھی کہ جیسے کسی مدتوں سے ویران پڑے مکان میں ہوتی ہے۔سب نے تھوڑا تھوڑا کھانا زہر مار کیا اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔سلمان کو اس کے کمرے میں ہی سوپ وغیرہ پلا کر دوا کھلا کر سلا دیا گیا تھا۔درشہوار کا دل اداس تھا اور وہ اس کمرے میں جانا نہیں چاہتی تھی جس میں اس کا شوہر آصف بھی اس کے ساتھ ہوتا لیکن اس وقت ان حالات میں وہ مزید کوئی نئی الجھن پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے مجبوراً کمرے میں چلی گئی۔آصف کریم لیپ ٹاپ پر اپنے آفس کا کوئی کام کر رہا تھا۔اس نے ایک اچٹتی سی نظر درشہوار پر ڈالی اور اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔درشہوار نے سونے کا ڈریس تبدیل کیا اور اپنے بیڈ پر آ گئی۔وہ روشنی گل کر کے سوجانا چاہتی تھی لیکن یہ بات آصف سے کہنے کی اس میں ہمت نہیں تھی اس لیے چپ چاپ اپنے بیڈ پر بیٹھ کر ہاتھوں میں لوشن کا مساج کرنے لگی۔اس کے دل میں ایک ہی خیال بار بار آئے جا رہا تھا جو اسے تنگ کر رہا تھا کہ اس کا ٹینو جب سے وہ ہوسپٹل سے آئی تھی،کہیں نظر نہیں آیا۔پتا نہیں وہ اس وقت کہاں ہوگا.....؟ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا ٹینو تو کہیں گیا ہی نہیں۔وہ اسی طرح صنوبر کے کمرے میں موجود تھا جیسے پہلی رات موجود آیا تھا۔
صنوبر بہت تھک چکی تھی اس لیے بیڈ پر لیٹتے ہی اسے نیند نے آلیا۔جن سلمان جو اس کے بیڈ کے نیچے چھپا ہوا تھا جب یہ محسوس کیا کہ صنوبر اپنے بیڈ پر لیٹ چکی ہے اور شاید سو گئی ہے تو وہ دھیرے سے وہاں سے نکلا اور کچھ ہی دیر میں اپنے اصل روپ میں آ گیا لیکن یہ اصل روپ اب بھی وہ جن والا روپ نہیں تھا بلکہ وہ انسانی روپ میں تھا۔سلمان نے ایک گہری محبت بھری نظر صنوبر کے سراپے پر ڈالی،تھک کر سوئی ہوئی وہ کس قدر معصوم لگ رہی تھی۔اس کا ملکوتی حسن نیند میں بھی اپنی چھب بکھیر رہا تھا۔سلمان اس کے قریب آ گیا۔قریب اور قریب......اتنا کہ اس کی سانسیں صنوبر کے ہونٹوں کو چھونے لگیں اور سلمان نے ایک نامعلوم بے خودی سے سرشار ہو کر بہت ہی میٹھے اور شیریں لہجے میں جو اس کے دلی جذبات سے مخمور تھا کہا۔''صنوبر.....صنوبر.''اس کی پکار سن کر صنوبر نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں اور اپنے اوپر جھکے ہوئے ایک اجنبی نوجوان کو دیکھ کر وہ خوف اور حیرت سے دنگ رہ گئی۔ایک فلک شگاف چیخ اس کے حلق سے برآمد ہوئی،جس نے سارے گھر میں طاری سکوت کو درہم برہم کر دیا۔درشہوار اور آصف کریم دونوں جلدی جلدی صنوبر کے کمرے کی طرف بھاگے سلمان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ خوف سے ڈری ہوئی اس لڑکی کو وہ کس طرح چپ کرائے۔وہ مسلسل چیخ رہی تھی اور سلمان اس کے سامنے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا......

(اسرار بھری دنیا کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! "مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ خلق خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے اولین شمارے سے شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ "سچی کہانیاں" میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، ان کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کین منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)...... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)...... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے نام ارسال کریں۔

(3)...... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

II C-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

عزیزانِ من!

میں سب سے پہلے اپنے تمام بچوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جنہوں نے 'میرے' خط کو توجہ سے پڑھا اور میرے ساتھ اس نیک کام میں شامل ہوئے۔ ہم بے حساب پیسہ الٹے سیدھے کاموں میں ضائع کردیتے ہیں لیکن یہی رقم اگر کسی افسردہ چہرے پر خوشیاں بکھیر دے تو اس سے بڑی خوش نصیبی کچھ نہیں۔ قطرہ قطرہ مل کر ہی دریا بنتا ہے۔ جن بچوں نے یہ پوچھا کہ ہم خطیر رقم ارسال نہیں کرسکتے۔ کیا معمولی سی رقم قابل قبول ہوگی۔ تو بچو! یہ تو نصیب کی بات ہے کہ انسان نیکی میں حصہ ڈالے، بنا کسی لالچ کے۔ نیکی چھوٹی یا بڑی نہیں ہوتی بس نیکی ہوتی ہے اور نیک عمل کا حصہ بننے والا اپنے لیے جنت کے دروازے کھول رہا ہوتا ہے۔ اللہ ہم سب کو برائی سے دور رکھے اور اللہ کے بندوں کی مدد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ رجب کا بابرکت مہینہ ہمارے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ اس ماہ میں خوب صدقہ خیرات کرنا چاہیے کہ یہ ماہ مسلمان مردوں کے لیے کڑا اور آزمائشوں سے پُر ہوتا ہے۔ استغفار کی تسبیح صبح شام کرنے والا ہر قسم کی ناگہانی سے محفوظ رہے گا۔ ماہ رجب میں زیادہ سے زیادہ روزے رکھنے چاہئیں۔ روزے دار کو ہر روزے کے عوض سال بھر کے روزوں کا ثواب ملتا ہے۔ پہلا اور تیسرا کلمہ بہت پڑھیں۔ ماہ رجب وہ مقدس مہینہ ہے جس کے احترام میں کفار بھی لڑائی حرام سمجھتے تھے۔ حضور نے فرمایا 'رجب اللہ کا مہینہ ہے۔ اس ماہ کو خوش نصیب ہی پاتے ہیں لہٰذا خوب استغفار کرنا چاہیے اور دل کھول کر صدقہ خیرات کرنا چاہیے۔

☐ اُم فروا۔ لاہور

○ بابا جی! آپ نے مجھے اولاد نرینہ کے لیے تعویز دیا تھا۔ دیر سے اطلاع دینے پر شرمندہ ہوں مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ اللہ نے مجھ پر رحم کیا ہے اور جڑواں بیٹوں سے نوازا ہے۔ ہمارے سر تو سجدے سے اٹھ ہی نہیں رہے ہیں۔ اللہ نے اتنا کرم کیا کہ ہم سب کو محسوس ہوتا ہے جیسے خواب ہو۔ ہمارے خاندان میں دور دور تک جڑواں بچے نہیں ہیں۔ بابا جی ہم لوگ آپ کے بہت شکرگزار ہیں۔ یقیناً عطا کرنے والی ذات تو رب کی ہے مگر وسیلہ تو نیک بندے ہی ہوتے ہیں۔ میرے سسرال والے اور میکے والے چاہتے ہیں کہ آپ کی خدمت میں تحفہ پیش کریں۔ بابا جی میں جانتی ہوں آپ کسی سے کچھ نہیں لیتے مگر میں آپ کی بیٹی ہوں۔ میرا مان رکھ لیجیے۔

☆ بٹی اُم فروا! اللہ نے تمہیں اپنی نعمت سے نوازا ہے اس کا شکر ادا اور کبھی اپنے اندر تکبر پیدا نہ ہونے دینا۔ بٹی میں بوڑھا آدمی ہوں اور محدود ضروریات ہیں۔ ہاں اگر کچھ کرنا چاہتی ہو تو میرے ٹرسٹ کے لیے کرسکتی ہو۔ میری خواہش ہے کہ رجسٹریشن سے لے کر دیگر معاملات میرے بچوں کی ارسال کردہ رقوم سے ہی ہوں میں کسی کا بھی احسان نہیں چاہتا۔ لہٰذا تم لوگ جو بھی دینا چاہو سچی کہانیاں کے نام ارسال کرو مجھے مل جائے گی۔

☐ ریاض تنویر۔ دبئی

○ بابا صاحب! اللہ آپ کو صحت دے۔ میں نے اپنی بڑی دو بچیوں کے لیے آپ سے تعویذ منگوایا تھا۔ شادی میں بہت رکاوٹ تھی۔ اللہ کے کرم سے میں پچھلے ماہ دونوں کے فرض سے سبکدوش ہوگیا ہوں اور

اطلاعِ عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: 88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 35893121-021

خوشی کی بات یہ ہے کہ میرے دونوں داماد دبئی میں مقیم ہیں۔ اللہ آپ کو جزا دے۔ میں بن ماں کی بچیوں کی ذمہ داری سے عزت کے ساتھ فارغ ہوگیا۔ بابا شکریہ کے طور پر کچھ رقم آپ کو ارسال کی ہے قبول کیجیے گا اور میرے لائق کوئی بھی خدمت ہو تو ضرور آگاہ کیجیے گا۔

☆ بیٹے ریاض! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ جو لوگ اللہ سے مدد مانگتے ہیں وہ ضرور کامیاب ہوتے ہیں۔ تمہاری ارسال کردہ رقم موصول ہوگئی۔ جو رقم تم نے مجھے ارسال کی اس سے تین غریب بچیوں کی شادی بہت اچھے طریقے سے ہوجائے گی۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

□ رضوانہ کوثر۔ راولپنڈی

☆ بیٹی رضوانہ! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ تمہارے نصیب میں اولاد ہے۔ یقین رکھو مایوسی کفر ہے۔ اللہ سے مدد مانگو، وہ ضرور کرم کرے گا۔ مناسب ہوگا مجھ سے تعویذ منگوالو۔ طریقہ کار سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلوم کرلو۔

□ م۔ کلر سیداں

☆ بیٹی! اللہ تمہاری بہن کو اپنے گھر میں آباد رکھے۔ اس سے کہو سورۃ انبیاء آیت 89 ہر نماز کے بعد ایک تسبیح پڑھے اور دعا کرے۔ انشاء اللہ جلد کرم ہوگا۔ بیٹی میں جانتا ہوں یہ وقت بہت کڑا ہے۔ تم پاک ذات پر یقین رکھو۔ گڑگڑا کر دعا مانگو۔ وہ اپنے بندوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ بروز جمعہ ایک بار سورۃ یٰسین ضرور پڑھو، کرم ہوگا۔

□ رخشی۔ کراچی

☆ بیٹی! رخشی تمہاری خواہش پر مسئلہ شائع نہیں کیا جارہا ہے۔ اللہ تمہاری والدہ اور بہن کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور تم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ بہت بڑا نقصان ہوگیا ہے تمہارا۔ ہاں خوش نصیبوں کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ بہر حال یہ اٹل حقیقت ہے۔ تم صرف اسمائے الٰہی کا ورد کیا کرو اور بعد نماز عشاء ایک بار الحمد شریف ترجمہ کے ساتھ پڑھو اور دعا کرو۔ اللہ ضرور کرم کرے گا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ قیصر۔ کراچی

○ پیارے باباجی! السلام علیکم! باباجی! آپ کی خدمت میں ایک اور مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ آج تک آپ نے میری ہر پریشانی میں ساتھ دیا ہے۔ باباجی! آپ کوئی ایسا وظیفہ دیں جس کی برکت سے میرے منگیتر کو جلد کوئی اچھی نوکری مل جائے۔ وہ بہت پریشان ہیں۔ اس دور میں نوکری ملنا بہت مشکل ہے۔ باباجی! والد صاحب مجھے پورا دن طعنے مارتے ہیں' مجھے بتاتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے کہ وہ مجھے گالیاں بھی دیتے ہیں جنہیں سن کر میرے پاس آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ باباجی! میں اپنی زندگی سے بہت تنگ آگئی ہوں۔ خدا گواہ ہے' وہ ہی میری اندر کی حالت سے واقف ہے۔ مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے جب والد سب کے بیچ میں بیٹھ کر مجھے الٹا سیدھا بولتے ہیں اور بری سے بری گالیاں دیتے ہیں اور جب والدہ منع کرتی ہیں تو ان کو بھی بہت گالیاں پڑتی ہیں۔ باباجی! میرے والد کو خدا کا بالکل خوف نہیں ہے۔ باباجی! پلیز' آپ کوئی ایسا وظیفہ دیں جو عشاء کی نماز کے بعد کا ہو جس کی برکت سے میرے منگیتر کو نوکری ملے اور میری جلد از جلد شادی ہو جائے۔ پلیز باباجی! جلدی جواب دیجیے گا۔

☆ بیٹی قیصر! تمہارے حالات جان کر بہت دکھ ہوا۔ بعض اوقات والدین بے جا سختی کر جاتے ہیں۔ بہر حال ہمت رکھو۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 7-7 تسبیح پڑھو یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَغِیْثُ اول و آخر دُرود شریف 7-7 بار پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 21 روز ہے۔

□ علیشہ۔ رحیم یار خان

○ محترم باباجی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند کرے۔ (آمین!) باباجی! آپ ہمیشہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں اور انہیں صحیح رستہ بتاتے ہیں۔ باباجی! میں نے آپ سے اپنے ٹرانسفر کے لیے وظیفہ منگوایا تھا' وہ پڑھنے سے میرا کام ہوگیا ہے۔ باباجی! اب آپ ایک اور مسئلے میں ہماری مدد کریں۔ باباجی! میری نند کے لیے کوئی بہتر اور مناسب رشتہ نہیں مل رہا۔ باباجی! آپ کوئی مناسب وظیفہ بتائیں جو میری نند یا پھر اُس کی والدہ وہ وظیفہ پڑھیں۔ باباجی! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ باباجی! آنے والے اگست کے شمارے میں اس کا جواب دے دیں۔

☆ بیٹی علیشہ! اللہ تمہیں مزید کامیابیاں عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بہن سے کہو بعد نماز فجر اور عشاء اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ پوری سورۃ

۷۔ ۷ بار پڑھے اور دُعا کرے۔ مدت دو ماہ ہے۔

□ اصفا شاہنواز۔ میلسی

☆ بیٹی! اصفا! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھا کرو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد سورۃ العنکبوت آیت ۷۷ ستتر ستتر (۷۷) بار پڑھو اور دُعا کرو۔ اپنی سوچ مثبت اور حقیقت پسندانہ رکھو۔ کامیاب زندگی وہ ہے جو عزت کے ساتھ گزاری جائے۔ تمہاری معمولی سی غلطی تمہیں بہت مشکل میں ڈال دے گی۔ اس شخص کے بارے میں سوچنا بالکل ترک کردو۔ یہ تمہارے اختیار میں ہے۔ مجھے ۱۴ دن بعد مطلع کرو۔

□ حرا ناز۔ چونگی

٥ محترم بابا جی! السلام علیکم! میرے میاں نجانے کیسے ایک فریبی اور دھوکے باز پراپرٹی ڈیلر کے ہتھے چڑھ گئے اور اس کی باتوں میں آکر بہت کم قیمت میں گھر بیچ دیا اور مجھے بچوں سمیت دربدر کردیا۔ جب نیا گھر خریدنے کی تلاش میں نکلے تو جگہ کی قیمت اور تعمیر شدہ گھروں کی لاگت کا اندازہ ہوا تو پچھتائے کہ یا رب العزت! میرے شوہر نے اتنا بڑا گھر جس کی کم از کم قیمت 16 لاکھ تھی' صرف آٹھ لاکھ میں کیسے بیچ دیا؟ سراسر ظلم ہوا۔ دوسرا ظلم یہ ہوا کہ ہزارہ شہر میں میری چھوٹی بہن کے شوہر نے پراپرٹی ڈیلروں سے مل کر مجھے دو لاکھ روپے کا نقصان پہنچایا۔ اندرونِ شہر کی ایک تنگ گلی میں ایک بوسیدہ عمارت جو کسی لحاظ بھی پانچ لاکھ روپے سے اوپر کی نہیں تھی۔ ہمیں 9 لاکھ روپے میں خرید دی۔ اس طرح میرے میاں پر ایک لاکھ روپیا قرض چڑھ گیا جو ادا کرنا ہے۔ بابا جی! اس خوفناک مہنگائی میں جہاں بچوں کو دو وقت کی روٹی میسر نہیں' اتنا پیسا کہاں سے آئے گا؟ میرے میاں نے چند دوستوں سے مالی امداد کی اپیل کی مگر کہیں سے کامیابی نہ ہوئی۔ اب خانیوال میں کرائے کے مکان میں رہتی ہوں' بابا جی! آپ سے ایک بیٹی التجا کررہی ہے کہ کوئی ایسا عمل بتائیں یا تعویذ دیں کہ ہماری واہ کینٹ والی جگہ فروخت ہوجائے اور ہم دوبارہ اپنا گھر تعمیر کرسکیں آپ کا بہت شکریہ!

☆ بیٹی حرا! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔

بیٹی! میں ہمیشہ اپنے پڑھنے والوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے قبل اگر استخارہ کروالیا جائے تو بہت مناسب ہوتا ہے۔ ظاہر ہے' جو لوگ اللہ سے مدد کے طلب گار ہوتے ہیں' وہ ضرور کامیاب ہوجاتے ہیں۔ بہرحال بیٹی! جو نقصان ہوگیا' یقیناً وہ بہت بڑا ہے مگر اللہ سے دُعا گو رہو۔ بے شک وہ بہت مہربان آقا ہے۔ بعد نمازِ عشاء 21 بار دُرود شریف پڑھو پھر 7 تسبیح یا حیّ سبحان کا ورد کرو۔ یہ عمل نہایت پابندی کے ساتھ ایک ماہ کرو۔ انشاء اللہ' بہتر اسباب پیدا ہوں گے۔

□ سمیعہ۔ لاہور

☆ بیٹی سمیعہ! تمہاری خواہش کے مطابق مسئلہ شائع نہیں کیا جارہا ہے۔ یہ درست ہے کہ تمہاری والدہ ذہنی طور پر نارمل نہیں اور یہ بیماری اولاد کی پیدائش کے ساتھ اور بڑھتی ہے مگر اب بھی کسی اچھے نفسیاتی ڈاکٹر سے اُن کا علاج کرایا جاسکتا ہے۔ انہیں کسی بھی نماز کے بعد سورۃ البقرۃ آیت ۱۰۱'۶۶ بار پڑھ کر پانی پر دَم کرکے پلا دیا کرو۔ جہاں تک بہن کا تعلق ہے تو اُس کے لیے میں تعویذ کا مشورہ دوں گا اور تعویذ لینے کے لیے مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو۔

□ فاخرہ گل۔ کوٹلی

☆ بیٹی فاخرہ! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ بیٹی! شرعاً جو کچھ تمہارے بھائی کا تھا' وہ اس کی بیوہ کو ہی ملے گا۔ ہاں' جو تمہارے والد کی جائداد تھی' اس میں تمہارا حصہ ہے لیکن اگر وہ اپنی زندگی ہی میں تقسیم کرگئے تو اب بیوہ بھائی سے مطالبہ جائز نہیں۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ تمہارے والد کی موت طبعی نہیں تھی تو پھر معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کردو تاکہ ظالم کو سزا ملے۔ بیٹی شاکرہ سے کہو' نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ مزمل ضرور پڑھے اور دُعا کرے۔ بیٹی! تم نمازِ فجر اور عشاء کے بعد یَا وَارِثُ کا بہت وِرد کیا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ یاسمین پشاور

٥ محترم بابا جی! السلام علیکم! امید کرتی ہوں' آپ خیریت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ عزوجل آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے اور آپ یونہی خلقِ انسانیت کی خدمت کرتے رہیں۔ (آمین!) بابا جی! میرا شوہر ملک سے باہر ہے' میں اور میرا بیٹا پاکستان میں رہتے ہیں۔

میں اپنی والدہ کے گھر رہتی ہوں۔ والدین فوت ہو چکے ہیں۔ میں، بھابی اور بھائی کے ساتھ رہتی ہوں۔ بابا جی! میرے شوہر کو ہماری کوئی پرواہی نہیں ہے۔ پہلے تو چار یا پانچ مہینے کے بعد خرچے کے پیسے بھیجتا تھا مگر اب وہ بھی نہیں بھیجتا۔ مہنگائی اتنی ہوگئی ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں؟ اگر میں اسے فون کرتی ہوں تو غصہ کرتا ہے، گالیاں دیتا ہے اور خرچ کے لیے پیسے بھی نہیں بھیجتا۔ سمجھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ بابا جی! اَب تو میری بھابی بھی لڑنے لگی ہے۔ کوئی ایسا وظیفہ پڑھنے کے لیے دیں کہ میرا شوہر ہم دونوں ماں بیٹے سے محبت کرے اور خیال رکھے۔

☆ بیٹی یاسمین! نمازِ فجر اور عشاء کے بعد سورۃ آلِ عمران آیت 27...... 1100-1100 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ صفیہ شاہ۔ سکھر

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! ہم چار بہن بھائی ہیں۔ ایک بہن اور بھائی کی شادی ہو چکی ہے جبکہ میں اور ایک بھائی غیر شادی شدہ ہیں۔ جب سے میرے بھائی اور بہن کی شادی ہوئی ہے، والدین بیمار رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مالی مشکلات اور پے در پے مسائل کے سبب میرا پورا گھرانہ بہت اپ سیٹ ہے، یہاں تک کہ تین سال ہونے کو آئے، بھائی اور بہن کی شادی پر جو قرضہ لیا تھا، وہ بھی تقریباً آدھا ادا کیا ہے۔ بڑے بھائی کا چھوٹا سا کاروبار تھا جو کہ بالکل ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ ان کے دو بچے ہیں۔ پورے گھر کی تمام تر ذمے داری چھوٹے بھائی پر ہے، اوپر سے بیماریاں ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ چنانچہ چھوٹے بھائی کی جو بھی آمدنی ہے، وہ علاج معالجے اور دیگر مسائل کے حل کے سلسلے میں خرچ ہوتی ہے۔ ان حالات میں ہم بقیہ دو بہن بھائی کی شادی کے اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے؟ مختصر یہ کہ میرا پورا گھرانہ بے انتہا مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ساس، نند اور بھاوج کی روایتی لڑائی جھگڑے بھی ہمارے گھر کا ایک اہم مسئلہ ہیں۔ میری امی کی اولین خواہش ہے کہ میں باعزت طریقے سے اپنے گھر کی ہو جاؤں لیکن اس خواہش کی تکمیل میں ایک اہم رکاوٹ یہ ہے کہ میرے لیے ابھی تک کوئی بھی معقول رشتہ نہیں آیا ہے جس کی وجہ سے میرے والدین بہت فکرمند ہیں۔ میری عمر اِس وقت 26 سال ہے۔ میں معمولی شکل وصورت کی مالک ہوں جبکہ لوگ خوب صورت لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں۔ میں بہت ہی حساس لڑکی ہوں، ان حالات میں سوچ سوچ کر اپنا بی پی ہائی کر لیتی ہوں۔ گھنٹوں روتی رہتی ہوں۔ بابا جی! میں کیا کروں، اگر میں خوب صورت نہیں ہوں، اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے؟ بابا جی! آپ مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتا دیں کہ میرے لیے کوئی معقول رشتہ آجائے اور میرے والدین اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں کیونکہ میری ہی وجہ سے چھوٹے بھائی کی شادی بھی نہیں ہو رہی کہ ایک بہن گھر میں ہے، شادی کے بعد اپنے مسائل میں گھر کر انسان دوسری طرف توجہ نہیں دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ میں تقریباً دس بارہ سال سے بیمار رہتی ہوں، نسوانی بیماریاں جان نہیں چھوڑتیں، دماغی کمزوری، نزلہ، بینائی کی کمزوری، جسمانی کمزوری اور الرجی نے مجھے بے حد پریشان کر رکھا ہے۔ ہزار علاج کروالیا لیکن بہت کم ہی افاقہ ہوتا ہے۔ دن بہ دن کمزور سے کمزور ہوتی جا رہی ہوں۔ اپنی عمر کے مطابق میری خوراک نہیں ہے۔ گھر کی تمام تر ذمے داری مجھ پر ہے۔ اپنے اخراجات بھی بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر پورے کرتی ہوں لیکن اَب جسمانی کمزوری کے باعث ٹیوشن پڑھانا بھی میرے لیے مشکل ہوتا ہے۔ اِن حالات میں بیماریوں اور مالی مشکلات کے باعث میں حالات کا مقابلہ کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ بابا جی! میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کس وجہ سے میرا گھرانہ اتنی پریشانیوں میں مبتلا ہے؟ پلیز بابا جی! بیماریوں سے نجات اور رشتے کے لیے کوئی وظیفہ بتا دیں۔ ہمارے والدین پر جو قرضہ ہے، وہ بھی اتر جائے، روزی میں خیر و برکت ہو اور ہمارے مسائل حل ہو جائیں۔ بابا جی! میں طویل وظیفہ نہیں پڑھ سکتی، اس لیے کہ بیمار رہتی ہوں۔ آپ ایسا مختصر وِرد بتائیں جو میں آسانی سے پڑھ سکوں۔ آپ جو دانتوں اور دانوں کے لیے دوا دیتے ہیں، اس کو منگوانے کے لیے منی آرڈر کہاں بھیجنا پڑتا ہے؟ کیا آفس سے براہِ راست دوا مل جاتی ہے؟ مجھے ان دونوں دواؤں کی

ضرورت ہے۔ میرے خط کا جواب ضرور دیجیے گا۔ اللہ پاک آپ کو اس کا اجر دے گا۔

☆بیٹی صفیہ! تم نے بہت تفصیل سے خط لکھا ہے' اس کے جواب میں صرف یہ کہوں گا کہ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ دوا دفتر سے دستیاب ہے' فون کر کے پوچھ لو۔ بعد نمازِ عشاء سورۃ الواقعہ ضرور پڑھو۔ رات کو ایک گلاس گرم دودھ ضرور پیا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ عارفہ حمید۔ کوٹ لکھپت

☆بیٹی عارفہ! اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں بہتری فرمائے۔ نمازِ فجر اور نمازِ عصر کے بعد ۷ بار سورۃ نوح پڑھو اور حاجات ایک ایک کر کے بیان کرو۔ اپنی خوراک متوازن رکھو۔ خالص ناریل کا تیل بالوں میں لگاؤ کم از کم ہفتے میں دو بار۔ مدت ۱۴۱ دن ہے۔

□ حنفیہ۔ ٹنڈو آدم

○ محترم بابا جان! السلام علیکم! میں نے آپ کا کالم پڑھا جو بہت پسند آیا۔ بابا جان! اللہ تعالیٰ آپ کو بہت لمبی زندگی دے۔ میں بہت پریشان حال لڑکی ہوں۔ امید ہے کہ آپ میری بہتر رہنمائی کریں گے اور مجھے اس مشکل سے نکال دیں گے۔ میری عمر اس وقت بیس سال کی ہوگی لیکن دکھ بہت بڑے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میری امی ہم سب بہن بھائیوں پر توجہ بالکل نہیں دیتیں۔ گھر کا خیال نہیں رکھتیں۔ گھر کا سارا کام میں کرتی ہوں۔ امی کی ان حرکتوں کا سبب میں بیان نہیں کر سکتی۔ وہ بہت بدنام ہو چکی ہیں۔ ابو بھی ان کے ساتھ مل گئے ہیں۔ بابا جان! میں پڑھی لکھی سمجھ دار لڑکی ہوں۔ یہ سب باتیں میری برداشت سے باہر ہیں۔ دل چاہتا ہے' خودکشی کر لوں۔ آپ کوئی مشورہ دیں۔ رشتے داروں کو بتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ میں پڑھنا چاہتی ہوں لیکن گھر کا ماحول بہت خراب ہے۔ آپ میرے لیے دُعا کریں اور کوئی وظیفہ بتا دیں جس سے امی ٹھیک ہو جائیں اور میرے مسئلے حل ہو جائیں۔ میں آپ کو بہت دُعائیں دوں گی۔

☆بیٹی حنفیہ! میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ اپنے کام سے کام رکھو اور کوشش کرو کہ تعلیم جاری رکھ سکو۔ ہر نماز کے بعد دُعا کیا کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری والدہ کو درست راستہ دکھائے۔ (آمین!) اپنے بہن بھائیوں کا خیال رکھو اور والدہ سے صرف ضرورت کے تحت بات کرو مگر رویہ نرم رکھو۔ نمازِ فجر اور نمازِ عصر کے بعد ایک ایک بار آیت الکرسی پڑھ کر گھر کے تمام افراد پر ضرور دم کر دیا کرو۔

□ رضیہ۔ کراچی

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم! جس طرح آپ لوگوں کی بے لوث خدمت کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دنیا اور آخرت دونوں میں دے گا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے پر چھائیاں ہیں' میں کوئی بھی گرم چیز استعمال نہیں کرتی ہوں حتیٰ کہ چائے بھی نہیں پیتی۔ ٹھنڈی چیزوں کا زیادہ استعمال کرتی ہوں۔ کچی سبزیوں کا بھی استعمال کرتی ہوں۔ اس کے باوجود بھی چھائیاں ختم نہیں ہوتی ہیں۔ میری عمر ۲۲ سال ہے۔ نماز پابندی سے ادا کرتی ہوں۔ دوسرے میرا پیٹ بھی شادی شدہ عورتوں کی طرح نکلا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں بھی کوئی وظیفہ بتا دیں۔ میں آپ کی بہت مشکور ہوں گی۔

☆بیٹی رضیہ! روزانہ رات کو ٹھنڈے پانی میں دو قطرے لیموں کے عرق کے ملا کر روئی سے چہرے پر لگاؤ۔ ہفتے میں ایک بار انڈے کی سفیدی میں روغنِ بادام ملا کر چہرے پر دس منٹ تک لگاؤ پھر چہرہ دھو لو۔ ہر نماز کے بعد ۹۹ بار یا مصور پڑھ کر چہرے پر پھیر لیا کرو۔ صبح نہار منہ ہلکی پھلکی ورزش ضرور کرو۔ مدت ۱۴۱ دن ہے۔

□ خضریٰ۔ کراچی

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ میری اور میری بہن کی دور کی نظر بہت کمزور ہے۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ دور کی نظر ٹھیک ہو جائے۔ میری نظر کا نمبر منفی ۴٫۵۰ ہے جبکہ میری بہن کی نظر کا نمبر منفی ۳٫۰۰ ہے۔ آپ کوئی ایسا علاج تجویز کریں جس سے یہ مسئلہ حل ہو جائے۔ مہربانی فرما کر ہمارے لیے دُعا کیجیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے۔

☆بیٹی خضریٰ! نمازِ فجر کے بعد ایک تسبیح یا نُور کی پڑھ کر اپنے اوپر دم کرو۔ سونف کا بہت استعمال کرو۔ وٹامن اے آنکھوں کے لیے بہت مفید ہے۔ آنکھیں ٹھنڈے پانی سے بار بار ضرور دھویا کرو۔ مدت ۱۴۱ روز ہے۔

□ ن۔ن۔ گھوٹکی۔

☆بیٹی! مایوسی کفر ہے' یہ بات میں وقتاً فوقتاً بچوں کو

بتاتا رہتا ہوں۔ جہدِ مسلسل ہی زندگی کی نشانی ہے۔ پانی بھی اگر رواں نہ رہے تو گدلا ہو جاتا ہے۔ تم وظیفہ پابندی کے ساتھ جاری رکھو۔ اللہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ آرزو۔ کراچی

☆ بیٹی آرزو! اللہ تمہارے والدین کو عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ جو طریقہ انہوں نے اپنایا ہوا ہے' وہ نہایت غلط ہے۔ ہمارے مذہب میں بھی یہی ہے کہ بچیوں کو جلد از جلد اُن کے گھر کا کیا جائے' بلا وجہ دیر اور بہتر سے بہترین کی تلاش میں بچیوں کو بٹھائے رکھنا بہت غلط ہے۔ بیٹی! تم وِرد مزید ایک ماہ جاری رکھو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ انوری۔ واہ کینٹ

○ جناب بابا جی! السلام علیکم! بہت عرصے سے آپ کا کالم "سچی کہانیاں" میں پڑھ رہی ہوں۔ میرا بھی ایک مسئلہ ہے۔ میرے شوہر بہت ہی سخت آدمی ہیں' نہ میری بات مانتے ہیں اور نہ ہی بچوں کی' نہ ہی کہیں آنے جانے کو چھوڑتے ہیں۔ مہربانی کر کے کوئی تعویذ اور وظیفہ بتا دیں کہ وہ ہمارے ساتھ محبت اور نرمی سے پیش آئیں۔

☆ بیٹی انوری! اللہ تمہارے شوہر کو ہدایت دے۔ اچھا انسان وہ ہے جس میں لچک ہے' نرمی ہے' اس سے وابستہ لوگ اس سے خوش ہیں۔ اللہ بھی اپنے ایسے بندے کو بہت پسند فرماتا ہے۔ بیٹی! تم نمازِ فجر کے بعد 500 بار پڑھو یَا رَحمٰنُ یَا رَحیمُ اول و آخر دُرود شریف پھر دُعا کرو۔ انشاء اللہ! جلد مثبت تبدیلی دیکھو گی۔ مدت 41 دن ہے۔

□ حرمت فاطمہ۔ اسلام آباد

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! کافی دن سے آپ کو خط لکھنے کا سوچ رہی تھی مگر امی کی بیماری اور گھریلو مصروفیات کی وجہ سے خط نہ لکھ سکی۔ اَب حالات بہتر ہیں تو خط لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ برائے مہربانی استخارہ کر کے بتائیں کہ میرے بیٹے کا رشتہ مناسب رہے گا کہ نہیں؟ عین نوازش ہوگی۔

☆ بیٹی حرمت! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ نماز پابندی سے اَدا کیا کرو۔ استخارہ حق میں نہیں ہے۔

صابرہ۔ مریدکے

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ لمبی عمر عطا کرے اور آپ ہمیشہ دکھی انسانیت کی خدمت کرتے رہیں اور بے سہارا اور جو مجبور لڑکیاں آج کے اس دور میں پریشان ہیں' اُن کے کام آتے رہیں۔ بابا جی! میں آپ کو اپنا مسئلہ بیان کر رہی ہوں' تقریباً آج سے پانچ سال پہلے میرا رشتہ میرے چچازاد کے ساتھ طے ہوا تھا اور ساتھ ہی میری چھوٹی بہن اور چھوٹے بھائی کا بھی رشتہ اسی گھر میں ہوا یعنی تین رشتے ہوئے۔ دو ماہ بعد میرے بھائی نے جو کہ ایک بے ضمیر انسان تھا' وہاں رشتہ کرنے سے انکار کر دیا حالانکہ اس نے اپنی پسند کے مطابق کیا تھا۔ وہ لوگ بہت دُکھی ہوئے' اتنے زیادہ کہ میں بتا نہیں سکتی۔ اس کے دو سال بعد انہوں نے اپنی بیٹی کا دوسری جگہ نکاح کر دیا پھر میری چھوٹی بہن نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ میں اس لڑکے کو پسند نہیں کرتی اور یہاں شادی نہیں کرنا چاہتی حالانکہ وہ لوگ ہم دونوں بہنوں سے رشتہ کرنا چاہتے تھے۔ میرے چچا کو ہم سے بہت زیادہ پیار تھا اور وہ خوش بھی بہت تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ میری بیٹی کا رشتہ تو نہیں ہوا لیکن میرے دونوں بیٹے تو خوش ہیں' کرتے کرتے وہ لوگ بہت کوشش کرتے رہے لیکن میری چھوٹی بہن بھی ضد پر اڑی رہی۔ آخر انہوں نے یہ کہا کہ ہم لڑکیوں کا رشتہ نہیں لیتے تو پھر ہم بڑی کا رشتہ بھی نہیں لیتے حالانکہ میری طرف سے کوئی بات نہیں ہوئی اور لڑکا بھی یہی چاہتا تھا کہ ہم دونوں کا رشتہ ہو جائے۔ اس طرح خاندان ٹوٹنے سے بچ جائے گا۔ میں نے بہت زیادہ وظائف پڑھے ہیں' لیکن اس طرف سے کوئی بات نہیں بنتی' کبھی وہ کہتے ہیں کہ ہم رشتہ کریں گے۔ اب میری بہن کی بھی دوسری جگہ رشتے کی بات چل رہی ہے اور اس بھائی کی بھی شادی ہو گئی ہے لیکن میری قسمت کے دروازے تو جیسے بالکل بند ہو گئے ہیں۔ اگر کہیں سے رشتہ آتا ہے تو بات نہیں بنتی۔ اس بات کو پانچ سال ہو گئے ہیں' نہ ہی اس لڑکے کا کہیں رشتہ ہوتا ہے اور نہ ہی میرا۔ بابا جی! مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں گے اول تو میرا وہی رشتہ ہو جائے' اس کے ماں باپ کے دل پر رحم پڑے۔ میں بہت دکھی ہو گئی ہوں اور بہت سوچتی رہتی ہوں۔ میں نے آپ کے بارے میں

لاہور کی ایک خاتون سے سنا تھا' تب سے میرے دل میں یہ بات تھی کہ میں اپنے مسئلے کا حل آپ سے پوچھوں۔ میں ساری عمر آپ کو دُعائیں دوں گی۔ مجھے کوئی دُعا یا وظیفہ جلد شادی کا بتائیں کیونکہ میرے والد کا سایہ بھی سر پر نہیں ہے۔ میں کہتی ہوں کہ میرے بھائی جو کہ بڑے ہیں' ہم اُن کے ساتھ رہتے ہیں۔ میری کسی طریقے سے یہ مشکل حل ہو جائے تو ساری زندگی آپ کو دُعائیں دوں گی اور مجھے اس خط کا جواب ضرور دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔

☆بیٹی صابرہ ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ مناسب ہوگا ان حالات میں مجھ سے تعویذ منگوالو۔ خط کے ساتھ جوابی لفافہ ضرور ارسال کرو تاکہ تفصیل سے جواب دیا جاسکے۔

□ ا-ب-خ-حویلیاں

○ محترم باباجی! السلام علیکم! باباجی! میں آپ سے گزشتہ چھے سال سے رابطے میں ہوں۔ باباجی! میری شادی کو ڈیڑھ سال ہونے کو آیا ہے' شادی کے تین مہینے بعد ہی میرا abortion ہو گیا تھا۔ اب باباجی! میری next pregnancy نہیں ہو رہی۔ باباجی! میرے لیے فکرمندی کی بات یہ ہے کہ میرے شوہر اکلوتے ہیں۔ آپ ساری صورت حال سمجھ سکتے ہیں۔ اَب آہستہ آہستہ ہر کوئی مجھ سے اولاد کے بارے میں پوچھتا ہے۔ باباجی! میں نے Medical Treatment بھی شروع کردی ہے' بس آپ کی دُعا کی ضرورت ہے۔ نقش وغیرہ میں نہیں منگوا سکتی۔ مجھے اولاد کے لیے کوئی آسان سا وظیفہ ارسال کریں۔ باباجی! میرا دوسرا مسئلہ میرے سسرال والوں کا ہے۔ باباجی! میں جتنا ان سے پیار کرتی ہوں' وہ ہر وقت مجھ سے خفا خفا رہتے ہیں۔ باباجی! سوائے میرے شوہر کے' کوئی گھر میں مجھ سے بات نہیں کرتا۔ میں چاہتی ہوں کہ گھر کے بھی افراد آپس میں پیار و محبت سے رہیں۔ ان کے دل میں میرے لیے پیار و عزت ہو۔ باباجی! میری مدد کریں اور مجھے پریشانی کا حل بتائیں۔

☆بیٹی! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! وظیفہ تمہیں بتایا جاچکا ہے لہٰذا اس پر عمل کرو۔ مگر میں تمہیں تعویذ کا مشورہ دوں گا آفس فون کرکے فوراً تعویذ منگوا لو۔ معاملات میں خاموشی رکھو۔ کوئی کب تک ناراض رہ سکتا ہے؟ تم اپنا رویہ اچھا رکھو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔ بس حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور دیا کرو۔

□ رابعہ-ملتان

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ پہلے ہمارا گھرانا اتنا خوش حال تھا کہ تمام برادری اور دوست احباب ہمیں داد دیتے تھے اور ہم اُن کی خاطر تواضع بڑھ چڑھ کر سرانجام دیتے تھے لیکن اَب ہمارے گھر میں نہ وہ خوش حالی ہے نہ برکت۔ میرے والدین بہت سخت ہو گئے ہیں۔ اس سے قبل وہ اپنی اولاد پر جان نثار کرتے تھے۔ اب ہر وقت لڑائی اور فساد برپا رہتا ہے جس سے گھر کا ہر فرد بہت متذبذب اور نڈھال ہو کر رہ گیا ہے۔ اب ہم سے بلکہ گھر کے تمام افراد سے ابو کا رویہ برداشت نہیں ہوتا۔ پلیز باباجی! کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے ہمارے گھر میں خوش حالی آئے اور ابو کا رویہ ٹھیک ہو جائے۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ تقریباً تیرہ' چودہ سال سے ہماری اپنی سر چھپانے کی جگہ نہیں ہے۔ جتنا کماتے ہیں' سارا خرچ ہو جاتا ہے اور پتا بھی نہیں چلتا۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ کوئی ایسا ورد بتائیں جو میں ہر وقت کرسکوں۔ میں پرائیویٹ فرسٹ ایئر ہوں اور اسکول میں پڑھاتی بھی ہوں۔ قرآن پاک بھی سب نے پڑھا ہوا ہے۔ پلیز باباجی! ہمارا کوئی مددگار نہیں ہے۔ آپ ہماری مدد کریں۔ میرے یہ دونوں مسئلے حل کردیں تو میں آپ کی بہت مشکور ہوں گی۔

☆بیٹی رابعہ! اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بہت نوازتا ہے مگر جب وہ اس کی راہ میں صدقہ خیرات نہیں کرتے ہیں تو پھر وہ اپنی نعمتیں واپس لینا شروع کردیتا ہے۔ جس قدر ممکن ہو' توبہ استغفار پڑھو۔ بروز پیر کچھ رقم ضرور خیرات کردیا کرو۔ نمازِ فجر اور نمازِ عصر کے بعد ۳-۳ بار سورۃ واقعہ پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ۴۱ دن ہے۔

□ فریحہ-صادق آباد

○ محترم بزرگوار باباجانی! السلام علیکم! مسئلہ یہ ہے کہ میرا شوہر بہت شکی مزاج ہے۔ ہر وقت لڑائی کرتا رہتا ہے اور میری کوئی بات اسے اچھی نہیں لگتی۔ میں اس وجہ

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

سے بہت پریشان ہوں۔ اسے چھوڑ بھی نہیں سکتی کیونکہ میرے بچے ہیں۔ اس شک کی وجہ سے وہ مجھے اور میرے بچوں کو اپنی سگی خالاؤں کے گھر بھی نہیں جانے دیتے۔ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ ان کا پیار بڑھ جائے اور میرے ساتھ ساتھ بچوں پر سے بھی پابندیاں ختم ہوجائیں کیونکہ میں بہت پریشان ہوں۔

☆بیٹی فریحہ! اللہ تعالیٰ تمہیں خوش رکھے۔ نماز فجر اور نماز عشاء کے بعد سورۃ طور آیات ۱۱۔۱۰۔۹ پڑھ کر دُعا کرو۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے ہیں' وہ ضرور کامیاب ہوجاتے ہیں۔ نماز قضا مت ہونے دینا۔ مدت ۴۱ دن ہے۔

□ رزاقاں۔ راولاکوٹ

○ محترم باباجی! آداب عرض! صورتِ احوال یہ ہے کہ ہم سات بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ ہم سب جوان ہیں۔ میرے والد اور والدہ کی آپس میں کبھی نہیں بنی۔ میرے ابو کے گھر والے ہمیشہ امی کی ہر بات کی مخالفت کرتے ہیں۔ شروع ہی سے انہوں نے میری امی کی مخالفت کی ہے۔ میرے ددھیال والوں کے بعد میرے ابو اور دونوں بھائی امی کے خلاف رہے ہیں۔ گھر میں ہر وقت لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔ برائے مہربانی کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے ابو اور بھائی امی کی بات مانیں اور ہمارے گھر میں سکون ہو۔

☆بیٹی رزاقاں! بعض اوقات انسان اپنی ضد اور انا کی خاطر بہت غلط فیصلے کرلیتا ہے۔ تمہارے گھر کا بھی کچھ یہی حال ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا کیا کرو۔ وہ ضرور کرم کرے گا۔ نماز فجر اور نماز عصر کے بعد ایک ایک تسبیح یَا رَقِیبُ یَا حَفِیظُ کی پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ۳ ماہ ہے۔ یہ وظیفہ اگر والدہ کریں تو بہت اچھا ہے۔

□ عامر حسین۔ پشین

○ محترم باباسائیں! السلامُ علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ! خیریت طرفین مطلوب! ہم غریب لوگ ہیں۔ میرے والد صاحب ڈرائیور ہیں۔ ہم لوگوں کے اوپر قرضہ ہے۔ اکیلے والد صاحب کمانے والے ہیں۔ ہم دو بھائی ہیں اور ایک بہن ہے۔ میں سب سے بڑا ہوں۔ میں نے T.I.P. سے ڈپلوما کورس تین سال کا ہری پور سے کیا ہے لیکن نوکری نہیں مل رہی ہے۔ باباسائیں! میں اپنے والد کا ہاتھ بٹانا چاہتا ہوں۔ تعلیم بھی ساتھ ساتھ جاری ہے اور دکان پر الیکٹرک کا کام بھی سیکھ رہا ہوں۔ مجھے کوئی آسان وظیفہ بتادیں جس سے میرا کام ہوجائے۔ مسئلہ نمبر دو۔ باباسائیں! میری عمر ۲۳ سال ہے لیکن میرا قد چھوٹا ہے۔ مجھے ہر وقت احساس کمتری محسوس ہوتا ہے۔ آپ برائے مہربانی میری مدد کریں اور مجھے اس احساس کمتری سے نجات دلادیں۔ میں تمام عمر آپ کو دُعائیں دوں گا۔

☆بیٹے عامر! نماز فجر اور نماز عصر کے بعد سورۃ اخلاص ۳۳۔۳۳ بار پڑھو اور دُعا کرو۔ انشاء اللہ روزگار فراہم ہوگا۔ جہاں تک قد کا تعلق ہے تو بیٹے! وہ اَب بڑھنا ممکن نہیں کیونکہ قد ایک خاص عمر تک بڑھتا ہے جو گزر چکی ہے۔ تم اس کو خامی سمجھتے ہو یا کمی جانتے ہو جو کہ نہیں ہے۔ اپنے اندر اچھی عادتیں پیدا کرو تاکہ لوگ تم سے ملنا چاہیں۔ مدت دو ماہ ہے۔

□ شمسہ بابر۔ گوجرانوالہ

☆بیٹی شمسہ! اللہ تعالیٰ تمہیں بہت خوشیاں عطا فرمائے۔ اپنے والد کی درازیٔ عمر اور صحت کے لیے دُعا کیا کرو۔ حالات کو بدلنا تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ تعلیم حاصل کرو اور اپنے والد کا ہاتھ بٹاؤ۔ بیٹی! زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی ہے اور جتنی جستجو' جتنی محنت ہوگی ثمر بھی اتنا ہی میٹھا ہوگا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے کچھ نہیں ملتا سوائے احساس محرومی کے۔ نماز کی پابندی رکھو اور نماز فجر اور نماز عصر کے بعد سورۃ بقرہ آیات ۲۲۔۲۱' اکیاون' اکیاون بار پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ۳ ماہ ہے۔

□ نسیمہ تاج۔ پسرور

○ باباسائیں! السلامُ علیکم! مسئلہ یہ ہے کہ پیسے میں بالکل برکت نہیں ہے۔ پہلی تاریخ کو خرچہ ملتا ہے وہ دو تین دنوں میں بالکل ختم ہوجاتا ہے اور میں بالکل کنگال ہوجاتی ہوں۔ آج کل کے زمانے میں سات ہزار روپے خرچ سے کیا ہوتا ہے جن میں بل بھی دینے ہوتے ہیں؟ آپ کو اللہ اور اس کے رسولِ پاک کا واسطہ کہ کوئی ایسا کلام اور ورد بتائیں یا تعویذ دیں کہ اللہ تعالیٰ کی اتنی برکتیں اور رحمتیں شامل ہوں کہ میرے سارے قرضے دور ہوجائیں اور میرا ہاتھ کھلا رہے۔ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آئے۔ دو تین

دن کے خرچے کے بعد ہی میں پائی پائی کی محتاج ہو جاتی ہوں یا دُعا کریں اللہ تعالیٰ اپنے غیب سے میری مدد فرمائے۔ ساری زندگی آپ کو دُعائیں دوں گی۔ جواب جلد از جلد دیں۔ اس کے علاوہ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے بچے بہت نافرمان ہیں۔ آپس میں بہت لڑتے ہیں اور مجھ سے بھی بہت بدتمیزی کرتے ہیں' بس صرف اپنے ابو سے ڈرتے ہیں مگر کب تک' جب تھوڑے بڑے ہوں گے تو اُن سے بھی خوب زبان چلائیں گے' بس اسی بات کا خوف ہے' اس کا بھی حل بتایئے۔

☆ بیٹی نسیمہ! بیٹی! تمہارے دونوں مسئلے بہت گمبھیر ہیں۔ بے شک فی زمانہ تنخواہ میں گھر میں چلانا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ کوشش کرو' جہاں بچت کر سکتی ہو' کرو حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ایسا کرنا بہت مشکل ہے مگر بیٹی! کوشش کرو۔ یَا رَزَّاقُ کا بہت وِرد کرو اور دُعا کرو کہ اللہ ہمارے ساتھ ساتھ ہمارے ملک پر بھی رحم فرمائے۔ جہاں تک بچوں کا تعلق ہے تو بچوں سے تم خود بھی نرمی سے بات کیا کرو۔ بچوں پر گھر کے ماحول کا بہت اثر ہوتا ہے۔ پیار و محبت سے سمجھاؤ' وہ ضرور سمجھیں گے۔

□ حارث۔ کراچی

○ بابا جی! السلام علیکم! ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے اور آپ ہمیشہ درد کے ماروں کے کام آتے رہیں۔ بابا جی! آپ نے میری بہن رفیقہ کو اولاد کے لیے سورۃ انبیاء پڑھنے کو کہا تھا' وہ انہوں نے پڑھی مگر کوئی فرق نہیں ہوا۔ اسے خواب میں کالے بھورے رنگ کے سانپ نظر آتے ہیں۔ بابا جی! میری بہن پانچوں وقت نماز اور قرآن پاک کی روز تلاوت کرتی ہے۔ بابا جی! ان کے لیے کوئی اچھا تعویذ بنا دیں۔ میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔ بابا جی! دوسرا مسئلہ میرا ہے کہ میں جو بھی اپنا کام شروع کرنے لگتا ہوں تو کوئی مصیبت آ جاتی ہے۔ بابا جی! میرے لیے بھی تعویذ بنا دیں۔ اور بابا جی پلیز میرے خط کا جواب مجھے مئی میں لازمی دیں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔

☆ بیٹے حارث! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹے! تعویذ میں ضرور تیار کر دوں گا مگر اس کے لیے مجھے کچھ تفصیل درکار ہے لہٰذا جوابی لفافے کے ہمراہ خط ارسال کرو۔

□ انیلا۔ کوٹری

○ محترم بابا جی! آداب! میرا مسئلہ یہ تھا کہ میرا خالہ زاد جس سے بچپن میں میرا رشتہ طے ہوا تھا' وہ مجھے پسند نہیں کرتا تھا یا کسی اور کو چاہتا تھا جس کے لیے میں نے آپ سے براہِ راست وظیفہ منگوایا تھا۔ مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ وظیفہ کامیاب ہو گیا ہے۔ وہ نہ صرف مجھے چاہنے لگا ہے بلکہ اس سے میری منگنی بھی ہو گئی ہے۔ بہت جلد شادی ہونے والی ہے۔ آپ کا ڈھیروں ڈھیر شکریہ بابا جی! میں زندگی بھر آپ کی احسان مند رہوں گی۔

☆ بیٹی انیلا! اللہ تعالیٰ تمہیں خوش رکھے۔ میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ دُعائیں قبول فرمانے والی ذات اسی غفورالرحیم کی ہے جو ہم سب کا مہربان آقا ہے لہٰذا ہمیشہ اسی کا شکر ادا کرتی رہنا اور نماز کی پابندی برقرار رکھنا۔ حسب توفیق صدقہ و خیرات بھی دیتی رہنا۔

□ حرا ناز۔ جہلم

☆ بیٹی حرا! تم نماز کی پابندی اور قرآنِ پاک کی تلاوت جاری رکھو۔ تم نے اگر قرآن پاک معنی سے پڑھا ہے تو یہ بھی پڑھا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے' جو گندی اور غلط راہ پر چل پڑتا ہے تو پھر میں بھی اس پر کرم نہیں کرتا۔ دنیا کی زندگی چند روزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ تمہارے سسرال والوں کو اپنے حبیبؐ کے صدقے' بری عادتوں سے بچائے۔ تم یا مزمل کا وِرد کرو اور اس کے بعد یوں دُعا کرو کہ یا اللہ! اپنے محبوبؐ کے صدقے' سب کو راہِ راست پر لا۔ یہ وظیفہ ۴۱ دن کرو اور پھر مجھے مطلع کرو۔

□ عروشے۔ لاہور

○ اچھے اور قابلِ احترام بابا جی! میں نے ہر طرف سے مایوس اور مجبور ہو کر اپنے دل کی مراد پوری کرنے کے لیے وظیفہ اور تعویذ منگوایا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے میری دلی مراد پوری ہو گئی ہے۔ اس کے ماں باپ جو بہت امیر ہیں اور مجھ غریب کو بہو نہیں بنانا چاہتے تھے آخر راضی ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے بابا جی! اور لمبی عمر دے تاکہ اسی طرح آپ غریبوں کی مدد کرتے رہیں۔ آپ کا ڈھیروں شکریہ!

☆بیٹی عروشے! اللہ پاک تمہیں شاد و آباد رکھے۔ بٹی! میرا شکریہ اَدا کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو ایک عاصی اور گناہ گار بندہ ہوں۔ جو کرتا ہے وہی رحیم و کریم آقا کرتا ہے۔ اس کا شکر اَدا کرو اور اَب نماز کی پابندی برقرار رکھنا اور کسی پیر والے دن رسولِ کریمؐ کے نام پر کسی میٹھی چیز پر نیاز ضرور دے دینا۔

□ علی سبحان۔ دادو

○ عالی جناب بابا جی! السلام علیکم! آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنی زمین کے مقدمے کے لیے آپ سے وظیفہ منگوایا تھا کیونکہ مقدمے کا فیصلہ کئی سال سے نہیں ہو رہا تھا اور پیشیاں بھگت کر میں عاجز آ گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مقدمے کا فیصلہ میرے حق میں ہو گیا ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ جناب عالی!

☆علی بیٹے! جو کرتا ہے' اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے اس لیے اس کا شکر اَدا کرتے رہنا چاہیے۔ مشکل ایک قسم کی آزمائش ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے اور اس کا ہر حال میں شکر اَدا کرنے والے کو ضرور کامیابی ملتی ہے۔ نماز کی پابندی کرتے رہنا اور حسبِ توفیق صدقہ خیرات بھی ضرور دینا۔

□ اسماء۔ کراچی۔

☆بیٹی اسماء! کوشش کرو کہ بچے کو سوتے سے اٹھا کر پیشاب کروا لیا کرو' چاہے رات ہو یا دن۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا اور یہ مشکل دور ہو جائے گی۔ دُرود شریف پڑھ کر دَم کرتی رہا کرو۔ یہ مثانے کی کمزوری ہے۔ انشاء اللہ' دور ہو جائے گی۔ دوسرے مسئلے میں اپنی عزیزہ سے کہو کہ وہ تخت یعنی سخت چیز پر لینا کریں اور اٹھتے وقت کروٹ سے نہیں بلکہ سیدھی اٹھیں۔ ۳ دفعہ الحمد پڑھ کر ٹانگ پر دَم کریں۔ انشاء اللہ! افاقہ ہوگا۔

□ زاہدہ ندیم۔ ہنگو

○ بابا جی! السلام علیکم! سلام کے بعد عرض ہے کہ بہت امید لے کر آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں کہ ہمارے گھر زیادہ لڑکیوں کی پیدائش ہوتی ہے۔ ہم سات بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ ہم نے بھائی کی بہت کم عمری میں شادی کی ہے۔ بھائی کی بھی لڑکیاں ہیں اور ایک پانچ سال کا بیٹا ہے اور میرا بھی ایک بیٹا ہے۔ اس کی شادی کی ہے۔ ابھی بیٹے کی دو لڑکیاں ہوئی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ آگے کتنی لڑکیاں ہوں گی؟ بابا جی! اب اللہ کے بعد آپ کا آسرا ہے کہ آپ ہمیں ایسا وظیفہ یا تعویذ دیں کہ ہمارے خاندان میں لڑکوں کی پیدائش ہو۔ پتا نہیں کہ ہم سے ایسی کون سی غلطی ہوئی ہے کہ خدا نے ہمارا گھر لڑکیوں سے بھر دیا ہے اور ہم صوبہ سرحد کے ہنگو کے رہنے والے ہیں جس میں قبائلی رواج کے مطابق خاندان میں مرد کم ہوں تو رشتے دار ظالم بن جاتے ہیں اور ہر طرح کا ظلم کرتے ہیں' نہ لڑکیوں کا رشتہ اپنی مرضی سے کر سکتے ہیں اور نہ جائداد وغیرہ بیچ سکتے ہیں۔ خدارا' بابا جی! ہمیں کوئی وظیفہ جلد از جلد بتائیں۔

☆بیٹی زاہدہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ اولاد میں لڑکا ہو یا لڑکی' یہ تو اللہ کی رضا ہے۔ بندہ تو صرف دُعا ہی کر سکتا ہے۔ تمہیں نصیحت کروں گا' مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ تفصیل تعویذ کے ساتھ ارسال کی جائے گی۔

□ عندلیب ناز۔ حیدر آباد

☆بیٹی عندلیب! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد ایک ایک بار سورۃ مزمل پڑھو اور دُعا کرو۔ بیٹی! بے شک حالات بہت مشکل ہیں مگر اپنے معاملات اللہ کے سپرد کر دو' وہ ضرور غیب سے امداد کرے گا۔

□ افضل حسین۔ ہالا، سندھ

○ جناب بابا سائیں السلام علیکم! میرا بیٹا جو کہ کراچی میں کام کرتا ہے' آپ کی گلوں کی دوا لے آیا تھا کیونکہ میرے گلے اکثر خراب رہتے تھے اور ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ ان کا علاج صرف آپریشن ہے مگر مجھے آپریشن سے بہت ڈر لگتا تھا۔ میں نے آپ کی دوا دو دفعہ منگوائی تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مجھے گلوں کی تکلیف سے نجات مل گئی۔ آپ کا بہت شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

☆بیٹے محمد افضل! اللہ پاک آپ کو صحت مند رکھے۔ شفا دینے والی ذات صرف اسی رحیم و کریم آقا کی ہے اس لیے اس کا شکر اَدا کرتے رہنا چاہیے جس کا ایک طریقہ نماز کی پابندی سے ادائیگی ہے۔

□ نوری۔ اسلام آباد

☆بیٹی نوری! تمہارے شوہر کی یہ بری عادتیں جہاں تمہارے لیے مشکل ہیں' وہاں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچے گا۔ اللہ تعالیٰ رحم کرے گا اور تمہاری

پریشانی دور ہوگی۔ تمہارا اپنی جگہ سے ہٹنا مناسب نہیں ہے۔ تم ہر نماز کے بعد چاروں قل شریف پڑھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگو۔ وہ رحیم وکریم ضرور سنے گا۔ یہ وظیفہ ۹۱ دن کرو اور پھر مجھے مطلع کرو۔

□ حیدر۔ ننذ وجہانیاں۔

☆ بیٹے حیدر! تم نے خود ہی بتا دیا کہ جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے وہ تم کر رہے ہو تو پیسے میں برکت کیسے ہوسکتی ہے؟ اس پیسے سے کھائی جانے والی غذا بھی حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو اور وظیفہ مزید ۴۱ دن جاری رکھو پھر مجھے مطلع کرو اور تم جو پیسے اللہ تعالیٰ کے نام پر نکالتے ہو وہ کسی حق دار کو ملنا چاہئیں ورنہ تم وہیں کھڑے رہ جاؤ گے۔

□ حمیدہ نواب۔ میاں چنوں۔

o بعد از سلام عرض ہے کہ میں نے آپ سے بیٹی بیٹے کے رشتے اور رزق روزی میں برکت کے لیے وظیفہ اور تعویذ منگوایا تھا کیونکہ ہمارے حالات بہت خراب ہوگئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے میری بیٹی کا رشتہ ہوگیا ہے اور حالات بھی پہلے سے بہت ٹھیک ہوگئے ہیں۔ آپ نے تین ماہ بعد اطلاع دینے کا کہا تھا اس لیے اس حکم کی تعمیل کر رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی زندگی اور اجر دے۔

☆ بیٹی حمیدہ! اللہ تعالیٰ تمہیں خوش رکھے جو دونوں جہانوں کا مالک اور بڑا رحیم وکریم ہے۔ اب نماز کی پابندی کرنا اور بیٹی، بیٹے کو بھی یہی تاکید کرنا۔

□ حاجرہ۔ جہلم

☆ بیٹی حاجرہ! میں نے بہت مرتبہ کہا ہے کہ جس گھر کا ماحول خراب ہو، لڑائی جھگڑے ہوتے رہیں تو وہاں برکت ختم ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو۔ انشاء اللہ وہ مدد کرے گا اور تم لوگ اس مشکل وقت سے نکل جاؤ گے۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ تم نمازِ فجر کے بعد سورۃ فلق ۳۳ مرتبہ پڑھو اور پینے کے پانی پر جو سب استعمال کرتے ہیں، دم کردو بغیر ڈھکنا ہٹائے۔ ۳۱ دن یہ وظیفہ کرو۔ انشاء اللہ مسئلے حل ہوجائیں گے۔

☆☆......☆☆

فرمان الٰہی

''اے نبی (ﷺ) جو باتیں یہ (کافر) لوگ (انکار قیامت کے متعلق) بنا رہے ہیں۔ انہیں ہم خوب جانتے ہیں اور آپ (ﷺ) ان پر جبر کرنے والے نہیں ہیں۔ بس آپ (ﷺ) اس قرآن کے ذریعے ہر اس شخص کو نصیحت کر دیجیے جو میری تنبیہ سے ڈرتا ہو۔''

سورۂ ق۔ 50 ترجمہ آیت 45

حدیث نبوی ﷺ

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ نرم خو ہے اور ہر کام میں نرمی ہی کو پسند کرتا ہے۔ نرمی پر جو کچھ عطا فرماتا ہے، سختی پر وہ کچھ عطا نہیں فرماتا۔''

(ریاض الصالحین باب الحلم والاناۃ والرفق ج 1 ص 374 بحوالہ صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عدل وانصاف

حضرت عمر فاروقؓ کے عدل کی یہ حالت تھی کہ جب آپ کا انتقال ہوا تو آپ کی سلطنت کے دور دراز علاقے کا ایک چرواہا بھاگتا ہوا آیا اور چیخ کر بولا۔ ''لوگو! حضرت حضرت عمر فاروقؓ کا انتقال ہو گیا ہے۔''

چرواہا بولا۔ ''جب تک عمر فاروقؓ زندہ تھے، میری بھیڑیں جنگل میں بے خوف پھرتی تھیں اور کوئی درندہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا، لیکن آج پہلی بار بھیڑیا میری بھیڑ کا بچہ اٹھا کر لے گیا۔ میں نے بھیڑیے کی جرأت سے جان لیا کہ آج دنیا میں حضرت عمر فاروقؓ موجود نہیں ہیں۔''

مرسلہ: غلام رسول گل۔ جیکب آباد

انتظار

انتظار...... اس دنیا کی سخت سزاؤں میں سے ایک ہے۔ یہ سزا انسان کو کبھی قسمت کی طرف سے ملی ہوتی ہے تو کبھی اس کے اپنے ہی اسے ساری عمر کے لیے اس کرب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس دنیا میں ہر شخص کو کسی نہ کسی کا انتظار رہتا ہے۔ کسی غریب کو اپنی خوشیوں کا انتظار رہے تو کسی امیر کو اپنی دولت میں اضافے کا۔ کسی مریض کو اپنی تندرستی کا تو کسی عاشق کو اپنے محبوب کا انتظار ہے۔

لیکن میرا انتظار ان سب سے مختلف ہے۔ مجھے انتظار ہے ان چند لمحوں کا، جب زندگی مجھے اپنے آنچل کے سائے تلے مجھے سامنے بٹھا کر اپنے شبنمی ہونٹوں سے اپنی محبت کا اقرار کرے اور صرف یہ یقین دلائے کہ وہ صرف میری ہے۔

مرسلہ: زین ظہور۔ کراچی

اہمیت

جس طرح ایک مرنے والے کے ساتھ کوئی نہیں مرتا، اسی طرح ایک درخت کے گرنے سے

باغ نہیں اجڑتا۔ سمندر سے کچھ پانی نکال لینے سے اس کی روانی میں کوئی کمی نہیں آتی۔

مرنے والا فنا ہوجاتا ہے مگر یہ دنیا اسی طرح قائم رہتی ہے۔ درخت گرنے سے باغ اسی طرح ہرا بھرا رہتا ہے مگر درخت اپنا وجود کھو دیتا ہے۔ سمندر سے نکلا ہوا پانی سمندر پر اثر انداز نہیں ہوتا لیکن خود اپنی پہچان کھو دیتا ہے۔

مرسلہ: ندا یاسمین۔ اٹک

غزل

پوچھیے مت کیا ہوا، کیسے ہوا
بت کوئی میرا خدا کیسے ہوا
آدمی بے حد بُرا تھا وہ مگر
پھر اچانک وہ بھلا، کیسے ہوا
جس دیے کی آبرو تھی روشنی
وہ طرفدارِ ہوا، کیسے ہوا
میں جسے سمجھی نہ تھی وہ عشق تھا
ہاں مگر پھر وہ سزا، کیسے ہوا
آدمی سے پوچھتا ہے آدمی
آدمی خود سے جدا، کیسے ہوا
مجھ کو آیا تھا منانے کے لیے
کیا خبر مجھ سے خفا، کیسے ہوا
سوچتی رہتی ہوں میں اکثر ثمین
جو نہیں سوچا گیا، کیسے ہوا

شاعرہ: ثمین سیف

سوا سیر

ایک بچہ گوالے کے پاس دودھ لینے گیا تو گوالے نے پوچھا۔ ”آپ اپنا دودھ لینے آئے ہیں یا کسی اور کا......؟“

بچے نے معصومیت سے جواباً دیا۔ ”نہیں جناب! میں تو گائے کا دودھ لینے آیا ہوں۔“

مرسلہ: شازیہ ظہیر۔ ساہیوال

دنیا کی سب سے لمبی زبان رکھنے والی خاتون

کہتے ہیں زبان سنبھالنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے، لیکن جس کی زبان عام زبان سے بھی ہو، وہ کیا کرے؟ دنیا کی سب سے لمبی زبان رکھنے والی اس خاتون چینل تاپر جس کی زبان کی لمبائی 9.75 سینٹی میٹر ہے جو عام زبان سے دوگنی ہے۔ چھپکلی کی مانند زبان رکھنے والی اس خاتون کا تعلق امریکا کے شہر کیلیفورنیا سے ہے۔ خاتون کا کہنا ہے کہ پیدائشی طور پر میری زبان لمبی ہے اور مجھے کھانے پینے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ میں عام لوگوں کی طرح زندگی گزار رہی ہوں۔ واضح رہے کہ چینل تاپر کا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ 2012ء میں دنیا کی سب سے لمبی زبان رکھنے کے حوالے سے شائع ہو چکا ہے۔

مرسلہ: روشن اعجاز۔ کراچی

بڑے لوگ، بڑی باتیں

☆ ایک شخص کی اس دنیا میں دلچسپی اس کے ذاتی مفاد تک ہی محدود ہے (برنارڈ شاہ)

☆ آواز ختم ہوجاتی ہے مگر اس کے اثرات قائم رہتے ہیں۔ (ولیم ورڈز ورتھ)

☆ کامیاب زندگی کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ نصب العین کا تعین اور پھر اس کے لیے کام۔ (ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ)

☆ گاؤں ہی کسی تہذیب کی بنیادی اکائی ہوتا ہے۔ گاؤں تباہ ہوجائیں تو تہذیبیں بھی زندہ نہیں رہتیں۔ (افلاطون)

☆ بے موقع گفتگو انسان کو لے ڈوبتی ہے۔ (ایوورڈ لو برنی)

☆ کچھ چیزیں جلد کھو جانے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ اس لیے چیزوں کو کھونے کا فن سیکھ کر خوش رہنے کا ڈھنگ سیکھیں۔ (الزبتھ بشپ)

مرسلہ: روحان ناصر۔ ملتان

زندگی

زندگی کو محض گزارنا ہی کوئی کارنامہ نہیں۔ ایسا تو جانور بھی کر لیتے ہیں۔ کارنامہ یہ ہے کہ آپ زندگی کو اپنے پسندیدہ انداز میں اس کامیابی اور خوبی کے ساتھ گزاریں کہ رخ، ہستی کا جھومر بن جائیں اور

آپ کے بعد آنے والے آپ کے نقش پا سے نشان منزل پائیں۔ مستقل مزاجی، محنت، جذبہ، لگن، انتھک جدوجہد اور عزمِ راسخ، راہِ زندگی کے وہ سنگِ میل ہیں جن کے ذریعے آپ کامیاب زندگی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ (ڈیل کارینگی)

حسنِ انتخاب: نایاب رحیم۔ کراچی

عجلت

پلمبر نے ایک گھر کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک خاتون نے سر نکالا تو پلمبر نے کہا۔

''محمود صاحب نے مجھے بلایا تھا، گھر کے نلکے وغیرہ ٹھیک کرنے کے لیے۔''

''لیکن وہ تو تین مہینے ہوئے گھر چھوڑ کر دوسری جگہ جا چکے ہیں۔'' عورت نے کہا۔

''کمال ہے۔'' پلمبر بولا۔ ''عجیب لوگ ہیں، ارجنٹ کام کے لیے بلاتے ہیں اور خود غائب ہو جاتے ہیں۔''

مرسلہ: نازش شیر محمد۔ کراچی

تفریح

ایک سفری سیلز مین کاروباری دورے پر تھا۔ راستے میں اسے ایک گاؤں میں رکنا پڑا۔ کام سے فارغ ہو کر شام کو اس نے سوچا کہ کچھ تفریح کی جائے۔ اس نے ایک مقامی دیہاتی سے پوچھا۔

''یہاں کوئی سینما ہے۔''

''نہیں۔'' دیہاتی نے جواب دیا۔

''کوئی تھیٹر ہال وغیرہ ہے، جہاں آدمی جا کر کوئی ڈراما یا شو وغیرہ دیکھ سکے؟''

''نہیں جناب۔'' دیہاتی نے نفی میں سر ہلایا۔

''حیرت ہے! پھر تم لوگ تفریح کیسے کرتے ہو؟'' شہری سیلز مین نے پوچھا۔

''بس جی۔ وہ بازار میں ایک چائے خانہ ہے۔ ہم وہاں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہاں کوئی نہ کوئی شہری بابو آ کر بیٹھا ہوتا ہے۔ ہم اسے دیکھتے ہیں۔ بس یہی ہماری تفریح ہے۔''

مرسلہ: شبانہ زمان۔ سکھر

عورت کیا ہے......؟

ماں کے روپ میں باعثِ جنت، بیٹی کے روپ میں باعثِ رحمت، بہن کے روپ میں باعثِ عزت اور بیوی کے روپ میں باعثِ سکون، آسمانی آخری تحفہ ہے۔ باوفا بھی ہے اور بے وفا بھی۔ نرم دل اور سنگدل بھی ہے۔

انسان اگر سمندر کی گہرائی نہیں جاننا چاہے تو جان سکتا ہے مگر عورت کے دل کی گہرائی نہیں جان سکتا۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا ہر صفحہ نئے رنگ کا ہوتا ہے۔ وہ چار دیواری کی زینت ہے نہ کہ بازار کی رونق۔ جس سے پیار کرتی ہے، اس پر جان نچھاور کر دیتی ہے۔

عورت کا دماغ نہیں، بلکہ دل کام کرتا ہے۔ وہ معمولی بات کو بھی ضبط نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ وہ اسے آگے نہ کہہ دے۔ بڑے سے بڑا ماہر نفسیات عورت کو جاننے کی کوشش کرے تو نہیں جا سکتا۔

مرسلہ: کرن شہزادی۔ راولپنڈی

9 ہزار 9 سو 99 گلابوں پر مشتمل ڈریس

شادی کے لئے پیغام تو سب ہی دیتے ہیں، لیکن کچھ لوگ پیغام دینے کے لیے ایسے نئے طریقے اپناتے ہیں کہ دنیا والے حیران رہ جائیں۔ ان میں ہی ایک نام چین سے تعلق رکھنے والے ین می کا ہے، جس نے اپنی گرل فرینڈ کو شادی کا پیغام دینے کے لیے 9 ہزار 9 سو 99 لال گلابوں پر مشتمل ایک جوڑا تیار کروایا۔ ڈریس ڈیزائنر کے مطابق پہلے گاؤن تیار کیا گیا تھا، پھر اس میں اصلی گلابوں کو اس طرح سجایا گیا کہ ایک ایک گلاب نمایاں ہو۔ ین می کی گرل فرینڈ چاؤ فین کو ''ین می'' کا پروپوزل گفٹ اتنا پسند آیا کہ اس نے تحفے کو دیکھتے ہی شادی کے لیے فوراً حامی بھر لی۔ یوں ین می کا انوکھا آئیڈیا، چاؤ فین کا دل چرا گیا اور پھر یوں رشتہ ہو گیا پکا!!

مرسلہ: غزل آفریدی۔ سوات

☆☆......☆☆☆

قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمائیے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ لاہور

شک تو تھا محبت کے خسارے ہوں گے
یقیں نہ تھا کہ سب ہمارے ہوں گے

عظمیٰ شکور۔ اسلام آباد

سبق ناکامیوں سے سیکھ کر وہ
محبت میں بھی ماہر ہو گیا ہے

مسز نکہت غفار۔ کراچی

نہ میرے قلم سے لکھی گئی نہ میری زباں سے ادا ہوئی
جو نظر سے کہنے کی بات ہے کسی حرف میں نہ سمائے گی
کوئی پھول چنتا ہے کس طرح کوئی ڈھول ہوتا ہے کس طرح
یہ وقت وقت کی بات ہے تجھے زندگی بتائے گی

منشی محمد عزیز مئے۔ لڈن

نے تسلی نے غم گساری فقط نا صحی ہے
کون کہتا ہے اسی کا نام دوستی ہے
تیری نصیحتیں، تیری چارہ سازی مجھے عزیز ہیں لیکن
اس کو یاد رکھنا بھی میری بے بسی ہے

حنیفہ بیگم۔ کراچی

عذابِ ظلمتِ شب ہے کہ اب دل کے لبوں پر
کوئی حرفِ دعا ہونا ضروری ہو گیا ہے

شازیہ رضوی۔ کراچی

گنتی کے چند دن ہی گزرے تھے ساتھ ساتھ
اور آج حسرتوں کے سوا کچھ نہیں رہا

تیرا مزاج، تیرا رویہ بدل گیا
اے دوست رنجشوں کے سوا کچھ نہیں رہا

غضنفر شاہ۔ کراچی

ہم نہیں جانتے محبت ہے
یا ہماری تمہیں ضرورت ہے

اشعر عتیق۔ کراچی

چڑھ گئی اُس پہ بیل نفرت کی
وہ جو اِک تھا شجر محبت کا

زبیر جیلانی۔ کراچی

نظر کے سامنے رہ کر نظر انداز کرتے ہو
جدا ہونے کی اس انداز نے ہمت بڑھائی ہے

سدرہ انور علی۔ جھنگ

اِن ستاروں کی چال ہے کوئی
جو انہی کے اثر میں رہتی ہوں
بات بھی مختصر سی کرتی ہوں
پھر بھی ہر اِک خبر میں رہتی ہوں

تنویر فاطمہ۔ کراچی

سارے انساں محبت کی پہچان ہیں
ایک دوجے سے پھر نفرتیں کس لیے؟

کاشف نبی خان۔ کراچی

ہم بے گناہ تھے پھر بھی سزا وار ہو گئے
دنیا میں پارسا ہے کوئی، یہ بتائیے

عارش۔ لاہور

کیا بتائیں کہ پوچھتے کیا ہیں
یہ سوال و جواب آنکھوں میں

نسیم سکینہ صدف۔ ڈسکہ

میں تیرا نام لکھوں خوشبوئیں سی جل اٹھیں
یہ معجزہ بھی مرے خوش جمال ہونا تھا

نادیہ طارق۔ کراچی

مری گڑیا، ترے جگنو، ہماری ماؤں کے غم
ہم اک دوجے سے بچپن کی کہانی سُن رہے تھے

شاہانہ احمد خان۔ کراچی

روشنیوں سے حرف کوئی لکھنے بیٹھوں
دیکھتی ہوں تو نام تمہارا ہوتا ہے
درد قبیلے والے اتنا جانتے ہیں
دل دریا کا ایک کنارا ہوتا ہے

حجاب بٹ۔ دادو

تمہارے خیمۂ خوشبو میں رہ کر
میں صبح و شام کرنا چاہتی ہوں
چراغوں سے ہوا کی دشمنی ہے
اسے ناکام کرنا چاہتی ہوں

سبحان کبیر۔ حویلیاں

وفا کا چاند یہیں پانیوں میں اُترا ہے
یہ میرے خواب کا منظر بکھر نہ جائے کہیں

احمد کمال۔ گجرات

تیرے احساس کو زنجیر بھی کر سکتے تھے
سوچ لے ہم تجھے تسخیر بھی کر سکتے تھے

افضال حسین بابر۔ شہداد کوٹ

کہاں گم ہوگیا اسم محبت
یہ دل دیوار و دَر سے پوچھتا ہے

ساجد خان۔ فیوچر کالونی۔ کراچی

زمانے والوں سے چھپ کے رونے کے دن نہیں ہیں
اُسے کہنا اُداس ہونے کے دن نہیں ہیں

زین احمد خان۔ حیدر آباد

ہم سے کی گفتگو ہواؤں نے
ایک تم ہی نہ ہم کلام ہوئے

جواد انور۔ اسلام آباد

تُو ستاروں کی مرے ہاتھ میں تقدیر نہ دے
اتنی توقیر سے ہوسکتا ہوں گم راہ بھی میں

شاعر عتیق۔ کراچی

جگانے خواب میں یہ کون آیا
مری نیند اور گہری ہوگئی ہے

شہنیلا۔ سکھر

تصورات کی دنیا بدل گئی لیکن
ترے خیال کی صورت ابھی نہیں بدلی

☆☆......☆☆

میرا یہ پسندیدہ شعر "سچی کہانیاں" کی نذر ہے

نام:

پتا:

کوپن برائے

ترنم

کش

مئی 2015ء